۳۔ حوالہ سابق
۴۔ الامام عبدالحمید الفراہی، رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن، مکتبہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرای میر، ۱۹۹۱، ص ۱۵۵
۵۔ حوالہ سابق
۶۔ حوالہ سابق
۷۔ حوالہ سابق
۸۔ حوالہ سابق
۹۔ حوالہ سابق، ص ۱۶۷
۱۰۔ محمد بن علی الشوکانی، فتح القدیر، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۳/۱۹۸۳، الجزء الخامس، ص ۹۵
۱۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۸، جلد ۵، ص ۱۶۶
۱۲۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۲۰۰۱، جلد ۸، ص ۲۳
۱۳۔ رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن، ص ۱۶۷
۱۴۔ حوالہ سابق، ص ۱۷۸
۱۵۔ الامام عبدالحمید الفراہی، تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان (سورۃ البقرۃ)، الدائرۃ الحمیدیۃ، ۱۴۲۰/۲۰۰۰، ص ۲۶۰
۱۶۔ حوالہ سابق، ص ۱۷۵
۱۷۔ رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن، ص ۱۷۵

☆

# تفسیر المنار (جلد اول) — تحلیل و تجزیہ

ابوسفیان اصلاحی

بیسویں صدی کی جن تفاسیر نے عرب و عجم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور مفسرین کے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا ان میں تفسیر ''المنار'' کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ نامکمل تفسیر سورہ یوسف کی باون آیت تک کا احاطہ کرتی ہے۔ تفسیر ''المنار'' کو رشید رضا مصری (۱۸۶۵-۱۹۳۵) نے اپنے استاذ شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۸-۱۹۰۵) کے ان دروس قرآن سے متاثر ہو کر ترتیب دیا جو انھوں نے جامعہ ازہر کے اساتذہ و طلبہ کے سامنے چھ سال (محرم ۱۳۱۷ھ تا محرم ۱۳۲۳ھ) کے درمیان دیے۔ تفسیر المنار کے بارہ اجزاء پر بحیثیت مفسر شیخ محمد عبدہٗ اور بحیثیت مؤلف رشید رضا کے نام مندرج ہیں۔ لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان حصوں میں بھی خاصے طویل مباحث کے بعد کہیں کہیں استاذ گرامی کی آراء نقل کی گئی ہیں۔ اس تفسیر پر استاذ گرامی کے افکار و خیالات کی گہری چھاپ تو ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ صرف استاذ کے دروس پر مبنی ہے کسی طرح درست نہیں، اس تفسیر میں استاذ گرامی سے استفادہ تو ہے لیکن اسے رشید رضا کی کاوشوں کا ثمرہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ تفسیر آیات کے باب میں جس طرح مفسرین کی آراء، علماء نحو کے خیالات، صوفیاء کے تفسیری رجحانات، متکلمین کے نظریات، مستشرقین کے اعتراضات اور احادیث کے مقام و مرتبہ سے بحث کی گئی ہے وہ کسی طرح درس قرآن کے دوران ممکن نہیں۔ اسی طرح اپنے استاذ کے بعض خیالات کے ثبوت میں استدلال کرتے ہوئے جس عالمانہ انداز میں انھوں نے علمی اور تحقیقی مباحث کو اٹھایا ہے ان کا بھی درس میں زیر بحث آنا مشکل ہے۔

شیخ محمد عبدہٗ نے اپنے درس قرآن میں اس بنیادی نکتہ پر ہمیشہ زور دیا کہ یہ کتاب کتابِ ہدایت ہے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اس انداز سے کی جائے کہ اس کا یہ پہلو ابھرا ہوا نظر آئے۔اس تفسیر میں استاذ کے اس نقطۂ نظر کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیرِ آیات کے ضمن میں معاشرتی، ملی، عالمی اور بلاد عربیہ کے مخصوص مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ملتِ اسلامیہ اور عربوں کی زبوں حالی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور عربوں کے اندر پیدا ہو جانے والے دینی اور معاشرتی امراض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اسی لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عصری مسائل کو موضوع بحث بنانا اس تفسیر کی ایک امتیازی شان ہے۔ اس تفسیر میں جگہ جگہ قرآن کریم کے ادبی و بلاغی پہلوؤں کو بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔املاء کے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے، صحف سماویہ سے استفادے پر تاکید اور اسرائیلیات سے اجتناب پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف اسلامی فرقوں کا قابل قدر تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ سائنسی مسائل کو بھی گفتگو کا موضوع بنایا گیا ہے۔اس تفسیر کا ایک بنیادی پہلو یہ بھی ہے کہ تفسیر آیات کے لیے ربطِ آیات اور سیاق وسباق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اس نقطہ نظر کی وکالت کی گئی ہے کہ ایک مفسر قرآن کے لیے اسباب نزول سے زیادہ ربطِ آیات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔اس مضمون میں تفسیر المنار کے ابتدائی دو حصوں کو ہی پیش نظر رکھا جائے گا۔

رشید رضا نے مقدمہ تفسیر میں فہم قرآن سے متعلق اپنے استاذ کے بڑے قیمتی افادات پیش کیے ہیں، اس ضمن میں تفسیر کے متداول طریقوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض تفاسیر میں صرف قرآن کریم کے ادبی اعجاز، بعض تفاسیر میں اس کے نحوی مباحث پر پورا زور صرف کردیا جاتا ہے۔اسی طرح بعض تفاسیر میں قصص القرآن کے توسط سے کتب تاریخ اور اسرائیلیات کو حقیقی درجہ دے دیا گیا۔بعض تفاسیر میں سارا زور احکام القرآن پر صرف کیا گیا ہے۔بعض تفاسیر میں مناظرانہ انداز کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔بعض تفاسیر میں اخلاقیات کے تعلق سے صوفیاء کرام اور زہاد کے واردات وواقعات پر زور دیا گیا ہے۔اور بعض تفاسیر میں فرقۂ باطنیہ کو اولیت دی گئی ہے۔ان تفسیری مناہج پر

تنقید کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ چیزیں انسان کو حقیقی مقاصد سے بے گانہ کرتی ہیں۔ چناں چہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تفسیر قرآن اس انداز سے کی جائے کہ اس سے دین اسلام کی سچی تصویر ابھر کر سامنے آئے اور یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ انسانیت کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور کتابِ ہدایت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر میں ایک حد تک قرآن کریم کی ادبی ولسانی خصوصیات اور نحوی خوبیوں کو بھی بیان کرنے کی جدوجہد کی جائے۔[1] عبدہ کا خیال ہے کہ متقدمین مفسرین نے بعض مخصوص مسائل پر اپنی تمام تر توجہ صرف کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جو "ہدایت بالغہ" ہے، اس کا پورا پورا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنی تفسیر کی خصوصیات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اس تفسیر میں وجوہ بلاغت پر اسی حد تک توجہ دی جائے گی جس حد تک زیر بحث معانی کی تشریح وتوضیح کے لیے ان کی ضرورت ہو، اور اعراب کی تحقیق کا انداز ایسا ہوگا جس سے قرآن کریم کی بلاغت وفصاحت کا پہلو متاثر نہ ہو۔ اسی طرح مشکلات القرآن کو بھی بقدر ضرورت موضوع بحث بنایا جائے گا۔ اور نحوی اصطلاحات کی تصریح وتفصیل میں نہ جاتے ہوئے اعراب کی طرف اشارہ کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ بلاغت کے نکات کی تشریح اور بنیادی قوانین کے بیان میں طریقۂ بحث اختیار کیا گیا ہے۔ تفسیر قرآن میں اس پہلو پر شدت اعتناء کی وجہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ مباحث طالب قرآن کو غایت حقیقی سے دور کریں اور وہ اس کتاب الٰہی سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے سے قاصر رہ جائے۔[2] یعنی قاری اس کے کتاب کے اصل پیغام سے محروم رہ جائے۔

عہدِ جدید کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب کسی نئی تفسیر اور تفکر فی القرآن کی ضرورت نہیں، کیوں کہ متقدمین قرآن وحدیث پر ممکن حد تک غور وخوض کے بعد ان سے احکام کا استنباط کر چکے ہیں، اب ہماری ذمہ داری یہ رہ جاتی ہے کہ ہم ان کتابوں سے استفادہ کریں۔ عبدہٗ کا خیال ہے کہ اگر اس منطق کو درست مان لیا جائے تو اب کسی نئی تفسیر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اور یہ خیال اجماع امت کے برخلاف بھی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ایسا خیال کیسے ایک مسلم کے ذہن میں پیدا ہو؟ جہاں تک فقہی احکام کا سوال

ہے تو یہ قرآن کریم کا بہت تھوڑا حصہ ہیں، اصلاً یہ کتاب تزکیۂ و تربیت کی کتاب ہے اور اسی کتاب کے توسط سے بنی نوع انسان کو معرفت خداوندی حاصل ہوسکتی ہے اور اسی کتاب میں ہر عہد اور ہر دور کے جملہ مسائل ومشکلات کا حل موجود ہے اس لیے کہ رشد و ہدایت اور فقہ کا سر چشمہ یہی کتاب ہے۔ یہ کتاب علوم ومعارف اور حکمتوں سے مالا مال ہے اگر چہ بہت سی قرآنی حکمتیں انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ رہتی دنیا تک اللہ کی یہ کتاب ایک طرف اگر صحیفۂ حیات ہے۔[۳] تو دوسری طرف سامان عبرت وبصیرت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "القرآن حجة لک او علیک".[۴] قرآن کریم یا تو تمہارے لیے حجت ہے یا تمہارے خلاف حجت ہے۔

قرآن کریم کے خطابات سے بالکل عیاں ہے کہ یہ کتاب کسی مخصوص شخص کی ذات یا کسی مخصوص عہد سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ہر عہد اور ہر دور کے انسانوں سے تعلق ہے۔ عالم اور عامی دونوں اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے استفادہ کرتے رہیں گے اور اس کی تعلیمات سے اپنی زندگی کی تعمیر و اصلاح کے لیے ہدایت اور روشنی حاصل کرتے رہیں اور اللہ تعالیٰ کا تقوی اپنے دل ودماغ میں جاگزیں کرتے رہیں گے جو قرآن کریم کا بنیادی مقصد ہے۔

مقدمہ تفسیر المنار میں فہم قرآن کی راہ میں پیش آنے والے بعض اہم مسائل کی جانب توجہ دی گئی ہے۔ فہم قرآن کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ مفردات کے صحیح معانی و مفاہیم تک رسائی کی سنجیدہ کوشش کی جائے، کیوں کہ قرآن کریم میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں، جن کے معانی نزول قرآن سے قبل کچھ اور تھے، لیکن قرآن کریم میں وہ مخصوص معانی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر ان الفاظ کے صحیح معانی ومفاہیم پیش نظر نہ رہیں، تو تفسیر قرآن میں مشکلات آئیں گی۔ مثال کے طور پر بعض الفاظ عام طور پر ایک معنی میں استعمال ہوئے لیکن قرآن مجید میں ان کا استعمال دوسرے معانی میں بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ تاویل کو لیجیے جو بالعموم تفسیر کے معنی میں مستعمل ہے لیکن یہ لفظ قرآن مجید میں دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا:

"ھل ینظرون الا تاویله یوم یاتی تاویله یقول الذین نسوه من قبل قدجاء ت رسل ربنا بالحق" .
(الاعراف:۷/۵۳)

اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آجائے، جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے، جس روز وہ انجام سامنے آگیا، تو وہی لوگ جنھوں نے پہلے اسے نظر انداز کر دیا تھا کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔

تاویل کا مفہوم دراصل آیات کریمہ کی حقیقی روح تک رسائی کا نام ہے۔اس لیے مفسر کے لیے ضروری ہے کہ عوام الناس اور قرآن کریم میں مشترکہ مستعمل الفاظ کے مابین واضح فرق کی گرفت کے لیے مختلف آیات کریمہ میں مستعمل لفظ کو پیش نظر رکھ کر معنی و مفہوم کی تعیین کی جائے۔۵ جیسا کہ لفظ "ہدایت" ۶ مختلف مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔اور یہ چیز پورے طور سے اسی وقت سامنے آسکتی جب کہ ربط آیات کے تناظر میں ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔۷

فہم قرآن کے لیے ایک دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسالیب پر گہری نظر ہو، قرآنی اسالیب کی صحیح فہم اسی وقت ممکن ہے جب مفسر کی نظر ادب عالیہ یعنی خطبات عرب اور کلام عرب پر رہی ہو۔ان دونوں کے بغیر قرآن کریم کے ادبی محاسن اور اسلوبیاتی نکات کا فہم ممکن نہیں۔

فہم قرآن کی ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ تہذیب انسانی کے ارتقاء یعنی علم احوال بشر سے پوری پوری واقفیت ہو۔قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر بنی نوع آدم کے احوال واعمال سے بحث کی گئی ہے، اس کا ذکر بار بار آیا ہے کہ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اقوام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔تہذیب انسانی کے متعلق متعدد واقعات اس میں مذکور ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" (البقرة: ۲۱۳)

ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (یہ حالات باقی نہ رہے ، اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے راستے سے ڈرانے والے تھے۔

شیخ محمد عبدہٗ کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر علم احوال البشر سے واقفیت کے بغیر ممکن ہی نہیں، لوگوں کے اتحاد اور ان کے افتراق سے کیا مراد ہے؟ وحدت انسانی بنی نوع آدم کے لیے مفید ہے یا مضر؟ اور انبیاء کرام کی بعثت کے کیا اثرات ان پر مرتب ہوئے؟ ان تمام پہلوؤں سے پوری واقفیت کے بعد ہی اس آیت کی تفسیر ممکن ہے۔

فہم قرآن کی ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ بعثت رسولؐ سے قبل عربوں کے احوال وآثار پر نظر ہو اور ان کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہوں۔ اس کے بغیر دین اسلام کی اصل تصویر سامنے نہیں آسکتی۔ اسلام کی برکات سے کما حقہ واقفیت کے لیے دور جاہلیت کے حالات سے باخبری کی ضرورت واہمیت کا صحیح اندازہ حضرت عمرؓ سے مروی اس قول سے لگایا جاسکتا ہے۔

"انما تنقص عرى الاسلام عروة عروة اذا نشأ في الاسلام من لايعرف الجاهلية"

عہد اسلام میں پیدا ہونے والا اگر دورِ جاہلیت سے عدم واقفیت کا شکار ہو تو وہ دین اسلام کے اثرات، انسانی معاشرہ پر اللہ کی غیر معمولی رحمت اور رحمت عالم محمد ﷺ کا لوگوں کو گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کے اجالے کی طرف رہنمائی کی تاریخ کو صحیح طور سمجھ ہی نہیں سکتا، اس طرح دین اسلام کو دنیا میں رائج مذاہب میں سے ایک مذہب کی حیثیت سے سمجھنے کا رجحان بڑھے گا۔

مذکورہ بالا گفتگو سے دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ کچھ مفسرین نے صرف کتاب عزیز کے الفاظ، ادبی وفنی خصائص، جملوں کی ساخت اور اس کے ایجاز واطناب پر سارا زور صرف کیا ہے، ایسی کوششوں کو تفسیر کے زمرے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ

اسے صرف ونحو اور بلاغت وفصاحت کی ایک کامیاب کوشش قرار دیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ قرآن کی تفسیر اس انداز سے کی جائے کہ گویا امت مسلمہ کے تمام افراد پر قرآن کریم کا سمجھ کر پڑھنا فرض ہے، ایک مفسر اس انداز سے قرآن کو پیش کرے کہ اس کی غرض وغایت اور اس کے مطلوبہ اقدار واحکام کی طرف انسانی ذہن مڑتا چلا جائے اور اس پر ثابت قدم رہنے کا جذبہ پیدا ہو۔ تفسیر اس انداز سے کی جائے کہ اس کا کتاب ہدایت ورحمت ہونے کا مقصد پورا ہو رہا ہو۔[۸]

اسی مقدمہ میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ صرف قرآن ایسی کتاب ہے جو امتِ مسلمہ کے تمام اختلافات کو مٹا کر اسے وحدت کے شیرازے میں پرو سکتی ہے۔ دین اسلام کی بقاء اسی سے عبارت ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کو عربی زبان کے بغیر اچھی طرح سمجھنا دشوار ہے۔ چناں چہ عربوں کے دوش بدوش عجم کے علماء نے بھی عربی زبان کے ارتقاء واستحکام کے باب میں عظیم خدمات انجام دیں ہیں۔ کسی زبان کا زوال دراصل اصحاب زبان کے زوال کے مترادف ہے۔ زبان کی وحدت وحدت ملت کی ضمانت ہے۔ جب تک عربی زبان زندہ تھی اس وقت تک دین اسلام اور علوم دونوں اوج کمال پر فائز تھے۔ تحفظ زبان عربی پر گفتگو کرتے ہوئے قومیت پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اسلام میں داخل ہونے والا ہر شخص امت مسلمہ کا فرد ہے۔ اسلام میں نسلی عصبیت کی کوئی جگہ نہیں۔

عربی زبان کے تحفظ وبقاء پر گفتگو کرتے ہوئے محمد عبدہٗ کہتے ہیں کہ عجمیت کے بعض علم برداروں کا خیال ہے کہ وہ اپنی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر کے عربی زبان سے بے نیاز ہو جائیں گے کیوں کہ دین اسلام کسی زبان کا محتاج نہیں، عربی زبان کی عداوت میں وہ یہاں تک بڑھ گئے کہ اذان، خطبہ اور نماز بھی اپنی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی، جب کہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی تعامل سے مترشح ہے کہ دین اسلام کے تمام شعائر اسی زبان عربی کے توسط سے ہی ادا ہوتے رہے ہیں۔ چناں چہ بہت سے ممالک مثلاً جاوا وغیرہ میں جب علماء اسلام کی کمی ہوئی اور امت مسلمہ کے اندر ایسی شخصیات ناپید ہو گئیں جو

اسلام پر عائد کردہ الزامات کا جواب دے سکتیں تو امت کے اندر ارتداد کی لہر دوڑ گئی۔ اور عیسائیت کے مبلغین نے قرآن کریم کے باب میں طرح طرح کے شبہات پیدا کیے اور اسے ہدف تنقید بنایا، عربی زبان سے لاتعلقی کی وجہ سے فتنۂ ارتداد اور دین اسلام کے خلاف طوفان کا روکنا دشوار ہوگیا ہے۔ عبدہٗ نے بار بار تفکر فی القرآن کی تاکید کی ہے۔ اسی کے ذریعہ ان آیات کے حقایق کی دریافت ممکن ہے جن کا تعلق صلوٰۃ واذکار سے ہے۔ اسی کے ذریعہ اس پر عمل کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ تفکر فی القرآن کے لیے صرف فصیح عربی زبان ہی ممد و معاون بن سکتی ہے۔ اس لیے اس زبان پر قدرت حاصل کرنا دین اسلام کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ فہم قرآن کی شرائط میں سے ایک ضروری شرط عربی زبان پر قدرت حاصل کرنا ہے۔[9]

## نظم قرآن

مقدمہ میں فہم قرآن کی جن شرائط کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان تمام شرائط کو تفسیر المنار میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے بہت سے امتیازات مقدمہ میں نہیں آسکے ہیں۔ بہر کیف ان تمام پہلوؤں کو مثالوں کے ساتھ قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ سب سے پہلے اس تفسیر کی اس خصوصیت سے بحث کی جائے گی کہ سورہ کی تفسیر سے قبل سورتوں کے موضوعات و مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً سورہ فاتحہ کے مضامین کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں پانچ چیزوں کو ایجاز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (۱) توحید (۲) انذار و تبشیر (۳) عبادت خداوندی (۴) دنیا اور آخرت میں حصول سعادت کا طریقہ (۵) اللہ کے نیک اور باغی بندوں کا ذکر،[10] انہی پانچ مضامین پر یہ سورہ مشتمل ہے۔ سورہ اخلاص کے متعلق بتایا گیا کہ یہ تین مضامین کا احاطہ کرتی ہے۔ اور انہی تینوں چیزوں پر رسالت کی بنیاد ہے۔ ایک توحید، دوسرے شریعت اور تیسرے بعث بعد الموت کے احوال و کوائف۔[11]

تفسیر المنار میں سورتوں کی ترتیب کے متعلق بتایا گیا کہ یہ ترتیب سورتوں کے حجم کے پیش نظر نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب سورتوں کے درمیان تناسب ہے۔ اسی طرح

مکی و مدنی سورتوں کا بھی ترتیب سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ سورہ فاتحہ کی سورہ بقرہ اور پورے قرآن کریم سے کیا مناسبت ہے اس پر بڑی مدلل بحث کی گئی ہے۔[۱۲] اسی طرح سورہ اعراف اور سورہ انعام کی ترتیب پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کی باہمی مناسبت کو واضح کیا گیا ہے۔ سورہ اعراف میں اصول وعقائد اور کلیات دین کو اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی چیز کو سورہ انعام میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں تدریج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔[۱۳]

سورتوں کی ترتیب کے ساتھ اس تفسیر کا ایک بنیادی وصف یہ بھی ہے کہ ربطِ آیات پر کافی زور دیا گیا ہے۔ تفسیر آیات کے باب میں اصل اہمیت ربطِ آیات اور نظم قرآن کی ہے نہ کہ اسبابِ نزول کی، شیخ محمد عبدہ کا خیال ہے کہ سیاق وسباق کے بغیر مفاہیم آیات تک رسائی ممکن نہیں، شان نزول پر حد درجہ توجہ کی وجہ سے کلام الٰہی کا نظم باہمی اور ترابط کا فہم مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر آیت کا اپنا ایک شان نزول ہے، شان نزول کا لحاظ کیا جاتا تو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کچھ اور ہوتی، لیکن در حقیقت قرآن کریم کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے، اس لیے کسی آیت کو بھی اس کی مناسب جگہ سے ہٹا کر یا مقدم ومؤخر کر کے نہیں رکھا جا سکتا، قرآن کریم شاعری کا مجموعہ نہیں ہے کہ ضرورت شعری کی بنیاد پر تقدیم وتاخیر کو روا رکھا جائے۔ بلکہ یہ کلام الٰہی ہے اور سراسر توقیفی ہے۔[۱۴] کسی ایک آیت کے اپنی جگہ سے ہٹانے سے پورا قرآن نظام درہم برہم ہو جائے گا۔[۱۵] آیت "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" کی تفسیر بیان کرنے سے قبل فرماتے ہیں۔

"ذهب الذين ينظرون من القرآن في جمله و آياته مفككة منفصلا بعضها عن بعض، التماساً لسبب النزول في كل آية او جملة او كلمة ولا ينظرون اليه في سياق جمله و كمال نظمه".[۱۶]

جن لوگوں نے ہر آیت، ہر جملہ اور ہر کلمہ کا شان نزول تلاش کرنے میں خود کو کھپایا، انہی لوگوں نے قرآنی جملوں اور آیات کو الگ الگ یعنی ایک آیت کو دوسری آیت سے جدا کر کے اس پر غور کیا، انھوں نے آیات کریمہ کے سیاق وسباق اور نظم قرآن کی روشنی میں قرآن کریم پر غور وخوض نہیں کیا۔

## تفسیر آیات بالآیات

تفسیر المنار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ تفسیر آیات بالآیات کا اس میں پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اور اولین اہمیت اسی نقطۂ نظر کو دی گئی ہے۔ تصریف آیات اور "القرآن یفسر بعضہ بعضا" کا مفہوم بھی یہی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت (۲۱) "یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم" کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جن چیزوں کی ہدایت کی ہے ان پر غور کرنا دراصل قرآن کریم پر غور کرنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کے اسرار و رموز پر تفکر کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم أفلا تبصرون" (الذاریات: ۲۰-۲۱)

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم کو سوجھتا نہیں۔

اسی پہلو کی طرف ایک دوسرے انداز میں یوں ارشاد الٰہی ہے:

"قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبل". (الروم: ۴۲)

ان سے کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو پچھلے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔

کائنات پر غور و خوض سے متعلق بے شمار آیات ہیں۔ اسی طرح جن آیات کریمہ میں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ ان آیات کریمہ کی دوسری آیات کریمہ سے بڑے دل نشین انداز میں تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ مثلاً "الاستعانۃ بالصلوٰۃ" پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں نماز حصول مراد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے انسانی نفس میں قربِ الٰہی کا جذبہ فروغ پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نماز نفس امارہ کے لیے دشوار ترین ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین" (البقرۃ: ۴۵)

اور بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں۔

چناں چہ اللہ کے باغی بندوں کے لیے یہ گراں باری کا سبب بن جاتی ہے، جیسا

کہ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| "کبر علی المشرکین ماتدعوھم الیہ" (الشوریٰ:۱۳) | یہی بات مشرکین پر سخت ناگوار ہوتی ہے جس کی طرف (اے نبی) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ |

لیکن اللہ کا ذکر خفی کرنے والوں، خشوع خضوع اختیار کرنے والوں اور اللہ کے حضور راتوں کو قیام کرنے والوں کے لیے یہی فرحت قلب اور طمانیت نفس کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| "ان الانسان خلق ھلوعا اذامسہ الشر جزوعا واذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین" (المعارج: ۱۹-۲۲) | انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر (وہ لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھتے ہیں۔ |

نماز کی بے شمار خصوصیات ہیں، نماز بندے کو صابر و ثابت قدم اور فیاض و سخی بناتی ہے، نماز برائیوں سے روکتی اور بھلائیوں کی طرف راغب کرتی ہے، نمازی بندہ ہی خدا کا حقیقی فرماں بردار ہے، وہ خواہشات کی پیروی کر کے حق سے منحرف نہیں ہوتا، عوارض و موانع کے وقت اس پر خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا۔ اللہ کے نیک بندوں کی نمازیں ایسی ہی ہوتی ہیں اور اسی لیے اللہ نے ان کے لیے اعلان کر دیا ہے۔[۱۸]

| | |
|---|---|
| "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ". (المومنون: ۱) | یقیناً ایمان لانے والوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ |

## حدیث سے استفادہ

تفسیر المنار میں حدیث سے بھی کافی استفادہ کیا گیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تفسیری روایات کا ایک معتد بہ حصہ غیر معتبر ہے، چناں چہ اصحاب کہف، ارم ذات العماد، سحر بابل، عوج ابن عنق، امور غیب مثلاً وقوع

قیامت اور قیامت کے وقت اور اس کے بعد کیا مسائل ہوں گے۔ ان تمام مسئلوں سے متعلق بے شمار ایسی روایات تفسیری ذخیرے میں راہ پا گئی ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی لیے شیخ محمد عبدہٗ کا کہنا کہ تفسیر، غزوات اور سرایا سے متعلقہ روایات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ان کی اسناد کی قدر و قیمت پر جس طرح کتابیں ترتیب دی گئی ہیں اسی طرح روایات مفیدہ کو ایک مستقل کتاب میں قلم بند کرنے کی ضرورت ہے تا کہ صحیح روایات کو تفسیر آیات کے لیے اسی طرح استعمال کیا جا سکے، جس طرح کہ کتب فقہ میں حدیث سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ [۱۹]

عبدہٗ نے حدیث کے مقام و مرتبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً "الاهلة" کے متعلق دو روایتوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ ابن عباس کی روایت ضعیف ہے اور اسی طرح ابو صالح سے کلبی کی روایت بھی حد درجہ کمزور ہے۔ [۲۰]

مختصر یہ ہے کہ اس تفسیر میں احادیث سے استفادہ ان پر غور و خوض کے بعد کیا گیا ہے، لیکن احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ اس تفسیر میں موجود ہے مثلاً آغاز تفسیر ہی میں بسملہ کی بحث میں کئی روایات کا ذکر موجود ہے۔ [۲۱] لیکن ان کے خیال میں روایات کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں فہم قرآن کے باب میں یہی حجاب ثابت ہوتی ہیں۔ [۲۲]

## اسرائیلیات

تفسیر المنار میں بار بار اسرائیلیات پر تنقید کی گئی ہے، اسرائیلی روایات اور کتب تاریخ سے مفسرین نے بغیر کسی تنقیح و تحقیق کے استفادہ کیا ہے، مختلف زبانوں کی تفاسیر میں اسرائیلیات کے تعلق سے لایعنی مباحث کثرت سے موجود ہیں، سر سید احمد خاں [۲۳] اور مولانا حمید الدین فراہی [۲۴] نے اس کے غلط نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ [۲۵] شیخ محمد عبدہ کا خیال ہے کہ قصص القرآن کے باب میں ان چیزوں پر زیادہ اعتماد کیا گیا ہے حالاں کہ ان موضوعات کے بارے میں تورات، انجیل اور اہل کتاب وغیرہ کی دیگر معتبر کتابوں کو مرجع کی حیثیت دی جانی چاہیے۔ [۲۶]

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی بزدلی اور شکست خوردہ ذہنیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ (البقرۃ: ۲۴۳)

اسرائیلی روایات میں اس آیت سے متعلق خرافات کا ایک انبار موجود ہے مثلاً وہ کون لوگ تھے؟ ان کا کس شہر سے تعلق تھا؟ اور ان کی کیا تعداد تھی؟ ان تمام سوالات کے جوابات اسرائیلی روایات میں موجود ہیں۔ان چیزوں کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہمیں تو صرف اسی چیز سے مطلب ہے جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔۲۷ اسی طرح آدم وحوا سے متعلقہ بہت سے مباحث کا تعلق اسرائیلیات باطلہ سے ہے۔قصص القرآن کے حوالے سے اسرائیلی روایات پر تفسیر المنار میں نہایت قیمتی بحث کی گئی اور یہ بات صاف صاف انداز میں واضح کردی گئی ہے کہ تفسیر قرآن اور تاریخ اسلام کے باب میں ان روایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے عبدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

"فعلینا ان نجزم بان ما اوحاہ اللہ الی نبیہ ونقل الینا بالتواتر الصحیح وھو الحق وخبرہ الصادق وما خالفہ ھو الباطل، وناقلہ مخطی وکاذب فلا نعدہ شبھۃ علی القرآن ولاتکلف انفسنا الجواب عنہ فان حال التاریخ قبل الاسلام کانت مشتبھۃ الاعلام حالکۃ الظلام ، فلا روایۃ یوثق بھا للمعرفۃ التامۃ بسیرۃ رجال سندھا ولا تواتر یعتد بہ بالاولی". ۲۸

اللہ نے جن چیزوں کو اپنے نبی پر بذریعہ وحی اتارا اور تواتر صحیح کے توسط سے ہم تک پہنچایا وہ قطعی طور سے ہمارے نزدیک سچ ہیں اور جو چیز اس کے برعکس ہے وہ باطل ہے اور اس کا راوی غلط اور جھوٹا ہے، اسے ہم قرآن پر کسی شبہ کے ضمن میں درخور اعتنا نہیں سمجھیں گے اور نہ اس کا جواب دینا ضروری خیال کریں گے، قبل اسلام کی تاریخ تاریکی میں ڈوبی ہوئی اور غیر یقینی ہے۔ان روایات کے راویوں کے توسط سے کوئی حتمی فیصلہ ممکن نہیں۔اور نہ ہی اس میں ایسا تواتر ہے جو اپنی پہلی کڑی سے ملتا ہو۔

## مفردات

اس تفسیر میں مفردات پر خاصی توجہ مرکوز کی گئی ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر مفرد الفاظ کے معانی ومفاہیم واضح نہ ہوں تو قرآنی آیات کی صحیح تفسیر ممکن نہیں ہے، مفردات کے معانی کا تفسیر قرآن میں غیر معمولی کردار ہے، یہی وجہ ہے کہ مفردات پر بے شمار تصانیف منظر عام پر آئیں۔ مثال کے طور پر تفسیر المنار سے چند مفردات کے مباحث سے یہاں تعرض کیا جائے گا۔ اس ضمن میں لفظ ''الـلـہ'' پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ اس لفظ کو واجب الوجود کا علم قرار دیا گیا ہے، اس کی اصل ''الـہ'' ہے، اس کی ہمزہ کو حذف کر کے لام داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف ''الـلـہ'' کے لیے مخصوص ہے، یہ صرف آسمانوں، زمین اور ہر شی کے خالق کے لیے مخصوص ہے۔ اس پر الف لام داخل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ لفظ صرف بلند ترین ذات واحد کے لیے مختص ہے۔ جس طرح ''الـنـجـم'' کوئی اور ستارہ نہیں صرف ''ثریا'' مراد ہے، چناں چہ دورِ جاہلیت میں جب بھی یہ سوال اٹھایا گیا کہ خالق السموت والارض کون ہے تو بغیر کسی تردد کے جواب یہی ملا کہ ''الـلـہ'' اور جب ان کے معبودان باطل میں سے کسی کے متعلق مثلاً لات وعزیٰ کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا انھوں نے اشیاء کائنات میں سے کسی شی کو پیدا کیا ہے تو انھوں نے صریحاً نفی میں جواب دیا۔ قرآن کریم نے ان کے اسی اعتقاد کو ان کے خلاف بطور حجت پیش کیا، کفار و مشرکین اپنے معبودان باطل کو اللہ تک رسائی کا ذریعہ تصور کرتے تھے اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ اللہ کے یہاں ان کی شفاعت کریں گے۔ ارشاد باری ہے:

| | |
|---|---|
| "وما ظلمنا هم ولكن ظلموا انفسهم فما اغنت عنهم آلهتهم التي يدعون من دون الله من شيئ لما جاء أمر ربك وما زادو هم غير تتبيب" (ھود: ۱۱/۱۰۱) | اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا، اور جب اللہ کا حکم آگیا، تو ان کے وہ معبود جنھیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے، اور انھوں نے ہلاکت وبربادی کے سوا، انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ |

لفظ ''اللہ'' چوں کہ موصوف ہے، اس لیے قرآن کریم نے اس کے متعدد اسماء حسنیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| ''ولله الاسماء الحسنى فادعوه بها وذروا الذين يلحدون فى أسمائه''. (الاعراف:۷/ ۱۸۰) | اور اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ |

انہی صفات سے اللہ کے مقام ومرتبہ کا تعین ہوتا ہے اور اسی کو تمام کارسازیوں کا مصدر ومنبع قرار دیا گیا ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے:

| | |
|---|---|
| ''ان رحمة الله قريب من المحسنين'' (الاعراف:۷ /۵٦) | یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔ |

اللہ کے اسماء حسنیٰ خالق کائنات کی ذات اور صفات دونوں پر دال ہیں اور یہ صفتیں خداوند قدوس کے ساتھ جزء لاینفک کے مانند ہیں اور اس میں التزام ومداومت ہے، مثلاً صفت رحمٰن اس کے انعامات واکرامات، صفت حکیم اس کے مکمل علم اور کارسازیوں اور صفت رب سے روز حشر اور یوم جزاء کی طرف اشارہ ہے۔( کیوں کہ اس کی ربوبیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ بندوں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے) مختصر یہ ہے کہ اسماء حسنی اور اس کی اعلیٰ صفات کی معرفت سے اللہ کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے اور ان صفات کے برعکس چیزوں سے اس کی ذاتِ گرامی منزہ ہے۔[۲۹]

لفظ ''قرية'' کے متعلق کہتے ہیں کہ سورہ بقرہ کی آیت ۵۸ میں اس سے شہر مراد ہے۔ یہ دراصل لوگوں کے مجتمع ہونے کی جگہ کا نام ہے اور اس سے چیونٹیوں کا وہ مسکن بھی مراد ہے جو اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرتی ہیں۔لفظ قریہ کا مادہ اجتماع اور ٹھہراؤ پر دلالت کرتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

''قريت الماء فى الحوض اذا جمعته''

یہ لفظ اصلاً اس قوم کے لیے مستعمل ہے جو کسی مقام پر اکٹھا ہو۔آگے چل کر اس

کا استعمال بکثرت قصبات کے لیے ہونے لگا۔ لیکن یہاں آیت میں کوئی چھوٹا قصبہ مراد نہیں ہے، کیوں کہ انسانی زندگی کی تمام سہولیات صرف کسی بڑے اور ترقی یافتہ شہر ہی میں مل سکتی ہیں۔[۳۰]

لفظ ''الصابئون'' کے متعلق تفسیر المنار میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ نصاریٰ کی ایک جماعت تھی، کیوں کہ ان کے بہت سے عقائد و اعمال سے ہم آہنگ ہیں مثلاً اعتراف اور یوم السبت کی تعظیم وغیرہ۔ مختلف شواہد سے متبادر ہے کہ احکام صابئین احکام نصاریٰ سے متشابہ ہیں۔ لیکن ان کے احکام میں حد درجہ آمیزش ہو چکی ہے اور اصل دین سے کافی ہٹ چکے ہیں، ستاروں کے اثرات کا یقین رکھتے تھے اور بدعات وخرافات کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، نصاریٰ کی مسیحیت کی روح ان کے اندر کارفرما تھی۔

''صابئة'' کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ ایک علاحدہ قوم تھی اور متعدد مشہور انبیاء کرام پر ایمان رکھتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ توحید پرست عربوں کے مانند وہ بھی بہت سے غلط عقائد کا شکار ہو گئے تھے، لیکن ان کا دین و مذہب عربوں سے مختلف تھا، البتہ اگر وہ عربوں سے قریب تھے اس لیے لازماً ان سے اخذ و تاثر کا سلسلہ قائم رہا ہوگا۔[۳۱]

## کلام عرب

مفردات کی تہہ تک پہنچنے کا ایک بنیادی ذریعہ کلام عرب ہے۔ تفسیر المنار میں کلام عرب کا استعمال دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو صرف تائید کے طور پر اور دوسرے مفردات کی کنہ تک رسائی کے لیے بطورِ استشہاد کلام عرب کا استعمال ہوا ہے۔ یہاں پر صرف بطورِ استشہاد و استدلال ہونے والے اشعار سے بحث کی جائے گی۔ لفظ آیت کے اشتقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''دراصل یہ مشتق ہے 'تأیّ' سے، جس کا مفہوم کسی خاص چیز پر قیام اور ٹھہراؤ ہے، بلکہ اس کا حقیقی مفہوم کسی چیز کی ذات کا قصد کرنا ہے۔[۳۲] جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تتایا الطیر غدوتہ      ثقة بالشبع من جزره[۳۳]

قرآنی صبر کے مفہوم ومعنی پر روشنی ڈالتے ہوئے استاذ امام شیخ محمد عبدہٗ کہتے ہیں کہ ناپسندیدہ اور غیر مرغوب راستوں پر نفس کو ڈالنے کا نام صبر ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ناخوش گوار افعال واعمال کے لیے بخوشی خود کو آمادہ کرنے کا نام ہے صبر، اسی مفہوم کو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔ ۳۴

صبـرت لاوالـلـه مـالـی طـاقة علی الصبر لکی صبرت علی الرغم

سورہ بقرہ کی آیت ''وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَايَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ'' (۷۸) میں آئے ہوئے لفظ ''امانی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''تمنی'' پڑھنے کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ ۳۵ بقول شاعر:

تـمـنـی کـتـاب الـلـه أول لیلة تـمـنـی داؤد الـزبور علی رسل

سورہ بقرہ کی آیت ''اُوْلٰئِكَ مَايَاكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارُ'' (البقرة:۱۷۴)

یہاں پر اللہ کے باغیوں کا پیٹ میں آگ بھرنے سے مراد ان کے وہ اعمال اور ان کی وہ سیئات ہیں جو ان کے جہنم میں جانے کا سبب بنتی ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے کہ یہ لوگ جہنم میں آگ کھائیں گے یا ضریع (سوکھی گھاس) اور زقوم (تھوہر) سے اپنا پیٹ بھریں گے، کھانے سے لطف اندوز ہونے کی تعبیر عام ہے، آیت میں پیٹ کے ذکر سے ایک خاص نکتہ مقصود ہے، پیٹ میں کھانے کا مطلب پیٹ بھرنا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس نے پیٹ بھرے بغیر کھانا کھایا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی اشتہا پوری نہ ہوئی اور آگ سے پیٹ بھرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جس کی تصویر حدیث میں یوں ہے۔

ولا یـمـلأ جـوف ابـن آدم الا التراب''.۳٦ اور بنی نوع انسان کے پیٹ کو صرف مٹی بھر سکتی ہے۔

اسی مفہوم کو عذاب کی بنا پر آگ کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ۳۷ جیسا کہ ایک شاعر اپنی بیوی کے متعلق کہتا ہے:

دمشق خـذیهـا لا تفتک فلیلة تـمـر یـعودی نعشها لیلة القدر

اکلت دما ان لم ارعک بضرۃ بعیدۃ مھوی القرط طیبۃ النشر

حجر اسود کے تعلق سے حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ پتھر دیگر پتھروں کی طرح ہے۔ خانہ کعبہ کے استقبال کے وقت اس کو چھونا یا بوسہ دینا محض امر تعبدی ہے۔ خانہ کعبہ کی جانب متوجہ ہونے کا مفہوم اس ذات الٰہی کی طرف توجہ دینا ہے جسے کسی مقام یا گوشے میں قید نہیں کیا جاسکتا، یہ بات عام ہے کہ بہت سے گھروں، مراکز، یادگار چیزوں اور مناظر سے لوگوں کا قلبی تعلق رہا ہے، اس کے پیچھے احباب کی محبتیں یا عظیم شخصیات کی قدر و منزلت کارفرما ہوتی ہے۔۳۸؎ شاعر کا قول ہے:

أمر علی الدیار ، دیار لیلی أقبل ذالجدار وذالجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیار

## ادبی مباحث

تفسیر المنار کی ایک بنیادی شناخت یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کریم کے ادبی اور بلاغی پہلوؤں کی نشاندہی جابجا کی گئی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن کریم ادب کا ایک عظیم شاہ کار ہے، عرب کے بڑے بڑے شعراء، بلغاء وفصحاء اس کے سامنے گونگے بن گئے اور اس کلام کی عظمت کے قائل ہوگئے۔ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت میں ادبی محاسن نمایاں ہیں۔ دشمنان اسلام قرآن کریم کی ادبیت کے منکر ہیں۔ ایک مستشرق کا خیال ہے کہ سورہ فاتحہ ادبی وبلاغی محاسن سے عاری ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ”یوم الدین“ کی جگہ ”الدیان“ مناسب ہے، عبدہٗ کا خیال ہے کہ یہ لفظ کبھی وہ مفہوم ادا نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔ چناں چہ اس لفظ کے مطلوبہ تقاضے ”الدیان“ سے پورے نہیں ہوسکتے۔ الدیان دراصل قاضی، حساب کرنے والے، محاسب اور ظالم کو کہا جاتا ہے، اس کا جو نتیجہ منظر عام پر آتا ہے وہ یہ ہے کہ رب ایک حاکم ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کے مطابق جزاء اور سزا دے گا۔ جب کہ ”یوم الدین“ سے ایک خاص دن مراد ہے جس کی ہولناکی قرآن کریم میں

مذکور ہے۔ اللہ اس دن تمام مخلوقات کا محاسبہ کرنے کے بعد ان کے مابین فیصلہ کر کے انھیں جزا و سزا سے نوازے گا۔ اور اس دن پر ایمان لانا ارکان اسلام میں داخل ہے۔ اس دن تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے اور کوئی کسی کو ذرہ برابر نقصان اور فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس عقیدے سے نفس انسانی پر زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں، توحید کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، نیک عمل کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اسی دن کے سبب برائیوں سے اجتناب کا جذبہ قوی تر ہوتا ہے۔ لیکن ''الدیان'' کا کلمہ ان تمام خوبیوں سے عاری ہے۔ کاش کہ مستشرقین اور عیسائی مبلغین "الدین" کی بلاغی خوبیوں سے واقف ہوتے۔[۳۹]

اسی طرح بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ "الصراط المستقیم" کی جگہ ''صراط الایمان'' کہا جانا چاہیے۔ صراط مستقیم کی جامعیت اور وسعت پر گفتگو کرتے ہوئے صراحت کرتے ہیں کہ یہ خوبیاں اور بلاغت کی گہرائیاں صراط الایمان میں موجود نہیں ہیں۔ صراط مستقیم میں ایمان، اسلام، احسان، عقائد، عبادات اور آداب وغیرہ شامل ہیں۔ یہ راہ تمام گمراہیوں سے پاک ہے۔ اور اس پر چل کر منزل مقصود تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔[۴۰]

قرآن کریم کی بلاغت پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدہٗ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کریم ہی کی بلاغت ہے کہ بیک وقت مختلف مسائل اور متعدد چیزوں کو ایک ہی موضوع کے تحت نہایت سلیقے سے ایک ہی دھاگے میں پرو دیا جاتا ہے۔ کلام الٰہی کے امتیازات اور خصوصیات اتنے اور ایسے ہیں جن کا صدور کسی انسان سے ممکن نہیں[۴۱]

تفسیر المنار میں اسالیب کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق یہ بات عام ہے کہ ان میں تاریخی تسلسل نہیں پایا جاتا ہے، اور نہ ہی واقعات کی کڑیاں کتابوں کے طرز پر قلم بند کی گئی ہیں، قرآنی قصوں کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ دلوں پر اس کا اثر ہو۔ اندر سے تدبر کا داعیہ پیدا ہو اور عبرت و نصیحت کے لیے اندر سے تحریک ہو۔[۴۲]

سورہ بقرہ کی آیت " ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فھی کالحجارۃ

او اشد قسوة وان من الحجارة لما يتفجر منه الانهار وان منها لما يشقق فيخرج منه الماء وان منها لما يهبط من خشية الله وما الله بغافل عما تعملون" (بقرة:۷۴) کو ادب کی ایک غیر معمولی تصویر قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی معنوی اور ادبی خوبیوں پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

"ان هذه الحجارة على صلابتها وقسوتها تتأثر بالماء الرقيق اللطيف فيشقها وينفذ منها بقلة أو كثرة، فيحی الأرض وينفع النبات والحيوان وأما هذه القلوب فلم تعد تتأثر بالحكم والنذر ولا بالعظات والعبر، فالحكم لاتقوى على شقها والنفوذ منها الى اعماق الوجدان وانوار الفطرة قد انطفأت فيها فلا يظهر شعاعها على انسان ومن الحجارة مايشقه الماء القليل كماء العيون الينا بيع الحجرية ومنها مالا يفجره الاالماء القوی الغمر الذی يسمى نهرا". ۴۳

پتھر اپنی شدت وصلابت کے باوجود ماء رقیق سے متأثر ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پھاڑ ڈالتا ہے۔ اور کم اور زیادہ مقدار میں باہر نکل آتا ہے چناں چہ پانی زمین کو زندگی بخشتا اور نباتات وحیوانات کے لیے نفع بخش ہوتا ہے۔ لیکن یہ دل حکمتوں، ڈراؤں اور نصیحتوں وعبرتوں سے نہیں پگھلتا ہے، چناں چہ حکمتیں اور اس سے گزر کر وجدان کی گہرائیوں اور فطرت کے انوار تک پہنچنے سے قاصر ہیں، ان کے اندر یہ روشنی دراصل بجھ چکی ہے جس کی وجہ سے انسان پر اس کا پرتو نہیں پڑتا۔ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جنھیں تھوڑا پانی بھی پھاڑ دیتا ہے جیسے عام چشموں اور پہاڑی چشموں کا پانی البتہ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو زیادہ پانی کی طاقتور لہر ہی پھاڑ سکتی جسے ندی کہا جاتا ہے۔

## دعوتی انداز

تفسیر المنار میں دعوتی پہلو بہت ابھرا ہوا ہے عبدہٗ کا خیال ہے کہ قرآن کریم در

اصل ہدایت کی کتاب ہے، اس لیے قرآن کی تفسیر اس نہج پر کی جانی چاہیے کہ اس کے اس خصوصی پہلو کا حق پورا پورا ادا ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم کو ایک فلسفہ کی کتاب بنا کر پیش کیا جائے۔ اس تفسیر کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں ملت اسلامیہ کو تمسک بالکتاب کے لیے ہر ممکن طور پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور انھیں اسلام کے رنگ میں رنگنے اور اس کے مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ عبدہٗ چوں کہ ایک مصلح تھے اس لیے ان کے اصلاحی کوششوں کی جھلک اس تفسیر میں صاف طور سے نظر آتی ہے۔ تفسیر قرآن کے مقصد عظیم کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

"والتفسير الذى نطلبه هو فهم الكتاب من حيث هو دين يرشد الناس الى ما فيه سعادتهم فى حياتهم الدينا وحياتهم الآخرة فان هذا هو المقصد الاعلىٰ منه وما وراء هذا من المباحث تابع له واداه وسيلة لتحصيله". ۴۴

اور تفسیر قرآن سے ہمارا مقصد فہم قرآن ہے۔ تفسیر جس سے یہ بات ابھر کر سامنے آئے کہ وہ ایک ایسا دین ہے جو بنی نوع انسان کی دنیاوی اور دینی سعادت کا ضامن ہے۔ اور تفسیر قرآن سے ہمیں یہی مقصد اعلیٰ مطلوب ہے۔ اور باقی تمام مباحث اسی کے تابع ہیں اور اسی مقصد حقیقی کے حصول کے ذرائع ہیں۔

رشید رضا اپنے استاذ گرامی کے متعلق رقم طراز ہیں کہ وہ اپنے درس میں انذار و تبشیر اور ہدایت واصلاح سے متعلقہ آیات کریمہ پر غیر معمولی توجہ فرماتے، دیگر مسائل ان کے درس میں اس کے بعد شامل ہوتے۔ ۴۵ اپنی اسی تحریک اصلاح کے پیش نظر وہ جامعہٗ ازہر کے طلبہ کو ابھارتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو فہم قرآن کے لیے وقف کر دیں اور خود کو ہدایت قرآنی کی راہ پر گامزن کر دیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو قرآن کریم کی پوری تصویر اور تعلیم نظروں کے سامنے ہوگی۔ جس کی طرف محسن انسانیت نے یوں اشارہ کیا۔

"ادبنى ربى فاحسن تاديبى".

میرے پروردگار نے میری بہترین تربیت فرمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم سے صحیح وابستگی کے بعد عصر حاضر میں امت

اسلامیہ کے تمام امراض، ان کے درمیان رائج بدعات وخرافات اور ان کے اندر درآنے والی عصبیتوں کا مکمل سد باب اور اصلاح ہو جائے گی۔ قرآن کریم کی لذت سے آشنائی کے بعد انسانی نظر میں تمام کتابیں اور علوم بے حیثیت نظر آنے لگتے ہیں اور فہم قرآن سے حاصل ہونے والی ہدایات اس کی زندگی کے لیے صیقل کا کام کرتی ہیں اور مکروہات دنیا سے اس کے دل میں ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم سے دوری دراصل اللہ سے دوری کا نام ہے۔[۴۶] "**وذلک ھو الضلال البعید**".

شیخ نے کفر کی اقسام پر بڑی مدلل گفتگو کی ہے اور اس میں دعوتی پہلو غالب ہے۔ کفر کی ایک قسم حق سے چشم پوشی ہے۔ یہ مرض بہت عام ہے اور بہت سے صاحب ایمان لوگوں کے دلوں میں بھی یہ اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ کفر کے مرض کی ایک تاثیر یہ ہے کہ اس سے دل مردہ اور وجدان زنگ آلود ہو جاتا ہے، اسے لذت حق کا ادراک نہیں ہوسکتا اور وہ حق سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس مریض کا دل اس قید سے رہائی نہیں پاسکتا۔ اس کی وجہ سے اس کی قوت فہم کو گھن لگ جاتا ہے۔ اسے ہلاکت وتباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اسے حق پرست اور داعی کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی، حق کا مذاق اڑانا اس کا شیوہ بن چکا ہوتا ہے۔ عبدہ نے ایسے انسانوں کو جانوروں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔[۴۷]

تفسیر المنار کے صفحات اس طرح کے مباحث سے بھرے ہوئے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ تذکیر وتعلیم اس تفسیر کا بنیادی موضوع ہے تو شاید نامناسب نہ ہوگا "**ادخلو فی السلم کافة**" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے عبدہٗ کا دعوتی اور اصلاحی انداز پورے شباب پر ہے۔ عبدہٗ کا خیال ہے کہ ایسے علماء کرام بے شمار ہیں جنھوں نے عبرت آمیز آیات کریمہ کی تفسیر کو رشد وہدایت کا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر امت مسلمہ ان کے خیالات ونظریات کی اتباع کرتی تو اسے صراط مستقیم پر استقامت کی دولت نصیب ہوتی اور وہ اختلافات کے اندھیروں سے نکل کر وحدت ویگانگت کی منزل پر چل پڑتی۔[۴۷ الف]

امت نے قرآن کریم کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اس پر شیخ عبدہٗ نے بڑی دل سوزی سے تبصرہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امت نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال کر

صرف ان چند سورتوں تک خود کو محصور کرلیا ہے، جو محفلوں میں ترنم سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو دین اسلام کی روح ختم کردی گئی اور اس کی ظاہری صورت سے خود کو وابستہ کرلیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند رسوم وروایات کا نام دین پڑ گیا اور عوام نے انہی رسومات کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ جہاں تک امراء اور سلاطین کا تعلق ہے تو ان کو تو بس ایک ہی فکر رہتی ہے کہ کس طرح عوام کو اپنا فرماں بردار بنایا جائے۔ انھوں نے دین کو ایک سیاسی حربہ اور عوام کو غلام بنانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب عزیز کی طرف بلانے والوں سے وہ برسر پیکار ہیں اور رسومات کے حامل علماء کی مدد سے اپنی جاہ و مرتبت کی حفاظت اور معیشت کے استحکام میں سرگرم رہتے ہیں اور ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ عوام کی توجہ کتاب الٰہی پر مرتکز نہ ہوسکے ایسا ہوا تو ان کی ریاست ومملکت کی بنیادیں ڈھ جائیں گی۔ ۴۸

عبدہٗ کی دعوت اصلاح کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی رہا کہ بدعات وخرافات پر سخت تنقید کی گئی۔ اس سلسلے کی طویل بحثیں المنار میں موجود ہیں۔ اللہ کی ربوبیت پر المنار میں بڑی قابل قدر بحث کی گئی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ مخلوقات کا خالق ہے۔ وہی اس کا رب اور تمام امور کا کارساز ہے۔ چناں چہ سب سے بڑی ناشکری اور کفران نعمت یہ ہے اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کی جائے۔ جب کہ انسان کے تحت الشعور میں ایک اللہ کا تصور جاگزیں ہے۔ اب ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر نذرانوں کے تعلق سے معبودان باطل کی قربت حاصل کرنا، ان کے لیے چڑھاوے چڑھانا یا انسان وحیوان کے مجسمے یا کسی شخص کی قبر کو بوسہ دینا یا اسکا طواف کرنا حق ربوبیت کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ۴۹

بدعات ہی کے حوالے سے مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث سے ہٹ کر کسی حکم اور عقیدے کو دینی رنگ دینا اللہ پر بہتان تراشی کے مترادف ہے۔ چناں چہ قبروں کی زیارت اور وہاں پر دین کے نام پر بدعات ومنکرات کا انجام دینا یا جنازہ کے پیچھے قصیدۂ بردہ یا اور کچھ ترنم سے پڑھنا بدعات میں شامل ہے۔ اسی طرح میت کے ساتھ بخوردان اور جھنڈا لے کر چلنا بھی بدعت ہے۔ ۵۰

## معاشرتی مسئلہ

بیسوی صدی کی تفاسیر میں المناراس حیثیت سے انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں بے شمار معاصر مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ملت کی زبوں حالی، عرب کے انتشار وافتراق اور بے شمار معاشرتی خرابیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ عبدہٗ کا احساس تھا کہ صرف قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں ایک باشعور اور صحت مند سوسائٹی قائم کی جاسکتی ہے اور یہی کتاب ملت اسلامیہ کے تمام اختلافات کو دور کر کے اسے ایک شیرازے میں پروسکتی ہے۔ اس تفسیر میں ازدواجی، تعلیمی، سیاسی، اور عائلی امور سے متعلق پر حکمت گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح مصری جن مختلف دینی ومعاشرتی برائیوں میں ملوث تھے ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً شراب کے کیا کیا نقصانات ہیں؟ عصر حاضر میں جدید طب نے اس کے کن مضر اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چالیس سالہ شراب پینے والا نوجوان جسمانی اور عقلی اعتبار سے ساٹھ سالہ بڈھا نظر آنے لگتا ہے۔ اور جگر وگردے بھی شراب نوشی سے متاثر ہوتے ہیں۔ مزید براں دیگر غذاؤں کی طرح شراب خون میں تبدیل نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے اور اعضاء جسمانی ضعف وتعطل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے اثرات آنے والی نسل پر بھی پڑتے ہیں اور شرابی کی اولاد میں نجابت مفقود ہوتی ہے، جسمانی اور عقلی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے۔ یہی چیز آگے چل کر انقطاع نسل کا سبب ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرتی معاملات میں طرح طرح کی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ باہمی رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ۱۵

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| "انما یرید الشیطان أن یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر". (المائدۃ: ۹۱) | شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے۔ |

شراب نوشی کی وبا نے کس طرح مصر کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اس کی

تصویر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"فان انواع الخمر كثرت فيها ومنها ما هو غالي الثمن جدا ثم ان المتجرين بها كثيرا ما يقرنون بينها وبين القيادة الى الزنا، وفي مصر القاهرة بيوت للفسق تجمع بين الخمر والنساء والراقصات والمغنيات و يدخلها الرجال زرافات وافذاذا ويتبادون ثم في النفقة حتى ليخسر الرجل في ليلته المئين والالوف". ۵۲ؔ

شراب کی مختلف اقسام ہیں۔ان میں سے بعض بہت مہنگی ہیں،شراب کے بیشتر تاجر شراب کے ساتھ زنا کو جوڑ دیتے ہیں،مصر قاہرہ میں جوفسق وفجور کے اڈے ہیں۔ ان گھروں میں شراب،عورتوں،رقاصاؤں، گانے والیوں کا اجتماع ہوتا ہے،عوام ان میں ٹولیوں میں یا تنہا جاتے ہیں اور روپے لٹاتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی ایک رات میں ہزاروں بلکہ لاکھوں خسارے سے دوچار ہوتا ہے۔

اسی طرح قمار بازی کے نقصانات پر اس تفسیر میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے مصر اس مرض میں کس حد تک مبتلا ہے، اس کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے محمد عبدہٗ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے تربیت نفس متاثر ہوتی ہے۔ قمار باز سہل انگاری اور کاہلی میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور غلط طریقوں سے رزق کے حصول کا منتظر رہتا ہے۔ حصول رزق کے فطری طریقوں کو ترک کرنے کی وجہ سے اس کی قوت فہم وتمیز مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ زراعت وتجارت اور صنعت وحرفت کے پیشوں سے چشم پوشی کرتا ہے، اس کے نقصانات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دفعۃً ثروت مندی افلاس میں تبدیل ہو جاتی ہے، بے شمار ایسے خاندان ہیں کہ جنھوں نے آنکھیں نہایت خوش گور اور خوش حال ماحول میں کھولیں، لیکن اس خاندان کی ثروت اگر ایک ایسے شخص پر منحصر ہے جو ایک رات میں کبھی اسے فقیر اور کبھی اسے امیر دونوں بنا سکتا ہے۔ تو اس خاندان کے اختیار میں یہ ہرگز نہیں کہ اپنی سابقہ صورتحال پر قائم رہے۔ ۵۳ؔ

شیخ محمد عبدہٗ نے امت مسلمہ کے ثروت مند حضرات پر زور دیا ہے کہ وہ امت کی

ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سخاوت اور فیاضی سے کام لیں، آیت "**ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو**" (البقرۃ:۲۱۹) پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقات وخیرات کا اطلاق "عفو" پر ہوگا۔ زکوٰۃ کے علاوہ کسی شخص یا عام معاشرتی ضروریات پر جو کچھ صرف کیا جائے اسے عفو قرار دیں گے۔ ایک مالدار شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت مسلمہ کے مفادات اور اس کے ذریعہ برپا کی جانے والی تحریکوں میں پورا حصہ لے۔ اگر کوئی قوم اپنے مفادات اور اپنی ضروریات سے غفلت برتتی ہے تو وہ کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ پہلی قسم کی امت اپنے ہر فرد کا خیال رکھتی ہے اور فرد اپنی قوم کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار رہتا ہے جب کہ دوسری قسم سے تعلق رکھنے والا اپنی قوم سے اور فرد سے غافل رہتا ہے۔ عفو کے حوالے سے عبدہٗ کا خیال ہے کہ قومی مسائل مثلاً مساکین، غرباء اور حاجت مند لوگوں کی ضروریات سے لاتعلقی کا ثبوت نہ دیا جائے، اور اس کے ذریعہ امت کے سب سے اہم مسائل تعلیم و تربیت ہیں، اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔[۵۴]

عبدہٗ "**ویسئلونک عن الیتامی**" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یتیموں کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا نظم و نسق ہو۔ ان کی جائداد کی ترقی کا خیال رکھا جائے۔ اور غفلت ولاپرواہی کے سبب ایسا نہ ہو کہ وہ اخلاقی دیوالیہ پن کے شکار ہو جائیں، بلکہ ان پر اس قدر توجہ ہو کہ وہ دنیا میں ایک ماڈل کی شکل اختیار کر جائیں اور آخرت میں بہترین کامیابی کے سزاوار بن سکیں۔[۵۵]

## فقہی مسائل

استاذ اور شاگرد دونوں کو خداوند قدوس نے غیر معمولی اجتہادی صلاحیت سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر میں احکام قرآنی پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ فقہی مسائل میں مسلکی جانب داری کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، تمام تر ترجیحات قرآن کریم اور احادیث کی حاصل ہیں۔

حرم کے علاقے میں جنگ کی کیا نوعیت ہے؟ سورہ بقرہ کی آیت ''الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل مااعتدی علیکم''۔ (بقرہ:۱۹۴) پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مشرکین حرم کے علاقے اور حرم کے مہینے میں برسر پیکار ہوں تو ان سے قرآن کریم نے جنگ کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ آیت نہ تو منسوخ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ناسخ ہے، یہ حکم تاابد باقی رہے گا۔ آیت برأت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ بذات خود یہ ایک مستقل حکم ہے اس لیے اسے الگ کرکے دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، اس میں عمومی طور سے جنگ کا حکم موجود ہے۔ ۵۶

موسم حج میں حجاج کا کسب رزق کے لیے تگ ودو کرنا فقہاء کرام کے نزدیک مختلف فیہ رہا ہے۔ صدر اسلام میں بہت سے مشرکین اور مسلمین تجارتی سرگرمیوں کو گناہ سے تعبیر کرتے تھے اور اپنی دکانوں کو بند کردیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے صراحت کی کہ خلوص کے ساتھ حصول رزق میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کیوں کہ آیت کریمہ ''لیس علیکم جناح أن تبتغوا فضلا من ربکم'' (البقرۃ:۱۹۸) میں ''من ربکم'' سے یہ پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے کہ فضل خداوندی کا حصول عبادت میں شامل ہے۔ اسی تناظر میں ایک سائل کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

''ھل کنا نعیش الا بالتجارۃ''۔ ۵۷ کیا ہماری زندگی کا مدار تجارت کے علاوہ کسی اور چیز پر تھا

سورہ بقرہ کی آیت ''الطلاق مرتان فامساک بمعروف أو تسریح باحسان'' (البقرۃ:۲۲۹) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طلاق رجعی ہی قرآن کریم کی رو سے طلاق کا اسلامی طریقہ ہے اور ''مرتان'' ہی دراصل اسلامی عدد ہے۔ طلاق بائن کا کتاب اللہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ فقہا اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ تین یا تین

سے زائد بار طلاق کی تکرار کا ثبوت نہ تو مذکورہ آیت سے ہے اور نہ ہی قرآن کریم کی کسی اور آیت سے۔ ۵۸

حلالہ کے مسئلہ پر تفسیر میں بحث کی گئی ہے، مفسرین اور فقہا کی آراء نقل کی گئی ہیں، رشید رضا نے اس پر تنقید کرتے ہوئے حلالہ کے بارے میں محمد عبدہٗ کے خیالات کو اس طرح بیان کیا ہے:

| | |
|---|---|
| "ان نكاح التحليل شر من نكاح المتعة اشد فسادا وعاراً" .۵۹ | بے شک حلالہ نکاح متعہ سے بڑا شر ہے اور اس کی وجہ سے غیر معمولی بگاڑ و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ |

مذکورہ چند فقہی آراء تفسیر المنار سے پیش کی گئی ہیں۔ جب کہ بے شمار مسائل میں عبدہٗ نے اپنے خیالات بیان کیے ہیں۔ ان خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو عبدہٗ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلکی تشدد سے دور اور اسلامی فقہ کے قائل تھے اور اجتہاد کو اساسی اہمیت دینے کے حامی تھے۔

## جدید علوم

تفسیر المنار کو دیگر تفاسیر میں امتیازی حیثیت حاصل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آیات کریمہ کی تفسیر و توضیح میں جدید علوم اور سائنس سے استفادہ کیا گیا ہے، عبدہٗ کا احساس تھا کہ عصر حاضر کی علمی ترقیات کا تقاضا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اس انداز سے کی جائے کہ نئی نسل اس سے ذہنی تسکین حاصل کر سکے، عبدہٗ جدید اور نئی نسل کے احساسات سے بخوبی واقف تھے۔ اعجاز القرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کریم کے علمی، سائنسی اور تاریخی پہلوؤں پر عبدہٗ نے عالمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہ وہ نکات ہیں جو نزول قرآن کے وقت مستور تھے، لیکن زمانے کی رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے محققین، سائنس داں، تاریخ بنی نوع انسان اور کائنات کے مختلف مراحل کے ماہرین قرآن کریم کے اس اعجاز سے کسی قدر واقفیت فراہم کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ اس میں کلام

نہیں کہ سائنس کائنات کے جن بے شمار مخفی گوشوں کا پتہ آج تک لگا سکی ہے قرآن کریم نے اس کی طرف بہت پہلے اشارہ کردیا تھا۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے۔" وارسلنا الریاح لواقح" (الحجر:۲۲)(اور ہم ہواؤں کو بارآور ہو کر چلاتے ہیں) یہاں ان ٹھنڈی ہواؤں کی تاثیر کا ذکر کیا جارہا ہے جو بادلوں میں جاکر باران رحمت کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک استاذ کا خیال ہے کہ تیرہ سو سال قبل کے عرب درختوں کی پیوند کاری اور قلم کاری سے واقف تھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نر کھجور کا مادہ کھجور کے شگوفہ میں ڈالنے سے پیداوار بڑھ جاتی ہے اور یہ عمل ہواؤں کے ذریعہ بھی انجام پاتا تھا، لیکن عرب میں اس سے ناواقف تھے۔ مفسرین نے اس آیت کا مفہوم سمجھنے کی وجہ سے اسے اعجاز پر محمول کیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک آیت "اولم یر الذین کفروا ان السمٰوات والارض کانتا رتقاً ففتقناھما وجعلنامن الماء کل شئ حی افلا یومنون" (الانبیاء:۳۰) (کیا کفار اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کردیا اور تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا؟ تو کیا (پھر بھی) وہ ایمان نہیں لائیں گے) کیا اللہ کی نشانیوں کے منکرین کو یہ پتہ نہیں کہ آسمانوں اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے اور پھر انھیں اللہ نے جدا کرکے اسی مادے سے ان اجرام سماویہ کو پیدا کیا جو لوگوں پر سایہ فگن ہیں اور یہ زمین انھیں اٹھائے ہوئے ہے اور اسی مادہ کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"ثم استوی إلیٰ السماء وھی دخان فقال لھا وللارض إئتیا طوعا أو کرھا قالتا أتینا طائعین" (حم السجدہ:۱۱/۴۱)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا تم ہمارے احکام کی تعمیل کرو، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح۔

اعجاز قرآن کریم کے اس پہلو سے نہ تو عرب اور نہ ہی کوئی اور قوم واقف تھی اسی طرح قرآن کریم نے یہ انکشاف کیا کہ "ومن کل شیئی خلقنا زوجین"۔ (الذاریات:۴۹) (اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں) دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے "ومن كل الثمرات جعل فيها زوجين اثنين" (الرعد:۳)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام نباتات میں اللہ کی یہ سنت کارفرما ہے۔۶۰ اللہ کی یہ سنت ہوا کے ذریعہ انجام پاتی ہے جو ذکور سے مادے کو اناث تک پہنچاتی ہے۔ اس طرح کی متعدد محیر العقول آیات کریمہ قرآن کریم میں موجود ہیں۔۶۱

اس موضوع سے متعلق آیات نقل کرتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ بے شمار آیات کریمہ میں ایسے موضوعات زیر بحث آئے جن کا علم اس سے پہلے نہیں تھا اور اب سائنسی اکتشافات سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس تفسیر میں عصری صورت حال کی قابل قدر نمائندگی کی گئی ہے۔ مثلاً آیت کریمہ "یکور اللیل علی النھار ویکو ر النھار علی اللیل" (الزمر:۳۹) میں لفظ تکویر آیا ہے۔ تکویر کا مفہوم عربوں کے نزدیک سر پر عمامہ گھمانے اور لپیٹنے کا ہے۔ تکویر میں مبالغہ کا مفہوم شامل ہے۔ اس کا لغوی مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو جسم متدیر کے آس پاس گھمایا جائے۔ اس طرح "تكوير الليل على النهار" کا مفہوم ہے کہ کرۂ ارض کی حرکت کی وجہ سے اختلاف لیل و نہار کا سلسلہ جاری ہے۔ جس کی حقیقت سے جغرافیہ کے ماہرین بخوبی واقف ہیں۔ اسی مفہوم کو ایک جگہ قرآن میں یوں ادا کیا گیا ہے:

| | |
|---|---|
| "ویغشی اللیل النھار یطلبه حثیثا" (الاعراف:۵۴) | جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے، اور پھر دن رات کا سرگرمی سے پیچھا کرتا ہے۔ |

شیخ محمد عبدہٗ نے تفسیر المنار میں اس پہلو پر بار بار زور دیا ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ کائنات کے ان اسرار و رموز تک رسائی کے لیے عقل و شعور کا استعمال کریں۔ قرآن کریم میں ذہن انسانی کو اس طرف توجہ دلانے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے، تخلیق کائنات کا یہ ایک نمایاں پہلو ہے کہ تمام اشیاء بنی نوع انسان کی

خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو دین اسلام کو بنی نوع انسان کی تعمیر و ترقی میں خصوصی دل چسپی ہے۔ اہل کتاب کی رسومات اور نظریۂ کائنات کا جائزہ لینے سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک عقل اور دین کے مابین گہری خلیج حائل ہے، اور ان کا یہ بھی نقطۂ نظر ہے کہ علم اور دین دونوں دو چیزیں ہیں، دونوں میں کوئی تطابق نہیں ہے۔ مذکورہ تمام خیالات کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ نقطۂ نظر یکسر نا قابل قبول ہے۔[۶۲]

## ملت اسلامیہ

اس تفسیر کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی ہے کہ عربوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کے مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور ملت اسلامیہ کی باہمی نا چاقی، منافرت اور انتشار پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ انھیں اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کی طرف پلٹنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس ضمن میں شیخ محمد عبدہٗ کا کہنا ہے:

"ومن اشتغل بهذا حق الاشتغال وصل الى معرفة أمراض المسلمين الحاضرة ومنابع البدع التى فشت فيهم ومثارات الفتن التى فرقتهم". [۶۳]

جوئی بھی قرآن کریم سے اس طرح دلچسپی لے گا جو اس کا حق ہے۔ وہ موجودہ ملت اسلامیہ کے امراض، ان کے اندر پھیلی ہوئی بدعات کے سوتوں، اور ان فتنوں کی وجوہات سے پوری طرح آگاہ ہوجائے گا جس نے ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کردیا۔

اسی پہلو کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے پاس دین اسلام کی وہ دولت ہے کہ جس کی پاسداری کے سبب مسلمان تمام دنیا کے فاتح بن گئے، دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں انھیں شمار کیا گیا، جب کہ کل تک یہی قوم حقیر نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اہلِ عجم اسلامی فتوحات میں عدل وانصاف کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسلام

کی برکات اور اس کی امتیازی خصوصیات سے روشناس ہوئے اسی بنیاد پر دولت اسلام سے فیض یاب ہوئے اور عربی زبان سے واقفیت کے بعد قرآن کریم کی رفعتوں سے روشناس ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قوم کو دنیا کی بہترین قوم بنا کر پیش کیا۔۶۴ لیکن ادھر کچھ ایسے دشمنان ملت ہیں جو اس کے باہمی معاملات، اجتماعی مفادات اور آپسی اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر دینا چاہتے ہیں، انہی دشمنوں نے ان کے باہمی روابط کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں، ان کی ہر ممکن کوشش ہے کہ اس قوم کی عالمی اجتماعی حیثیت کو پاش پاش کر دیں۔ اور بلادِ اسلامیہ کے شہریوں کے دل میں وطنیت کا بیج بو دیں، اپنے اس مقصد میں انھیں خاطر خواہ کامیابی تو نہ ملی، لیکن مصر پر اس کے حد درجہ غلط اثرات ضرور مرتب ہوئے۔۶۵

ملت اسلامیہ کا شیرازہ اس لیے منتشر ہے کہ امت مسلمہ اور قرآن کریم کے درمیان دوری پیدا ہوگئی ہے۔ اسی رکاوٹ نے انھیں "حبل من اللہ" سے محروم کر دیا ہے، قرآن کریم کی تعلیمات اور تقاضوں سے باخبر مومن دین اسلام کی تاریخ اور اصحاب رسول ﷺ کی عظمتوں سے واقف ہوتا ہے۔ لیکن ایک عامی اور تقلید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے مومن کے لیے ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا نہایت دشوار ہے۔۶۶ عبدہٗ کے خیال میں امت مسلمہ کے درمیان ان تمام خرابیوں اور بدعات و رسومات کے پھیلنے کا اصل سبب وہ حجاب ہے جو امت اور قرآن کریم کے درمیان حائل ہے، اسی کی وجہ سے غلط عقائد عام ہوئے اور قوم ایک بہت بڑے مرض وطنیت و قومیت کا شکار ہوگئی اور اس کا دینی شعور حد درجہ کمزور ہو گیا۔۶۷ عبدہٗ نے اپنی تفسیر میں ایک طرف شدت کے ساتھ اگر قرآن کریم کی طرف دعوت دی ہے تو وہیں سختی کے ساتھ وطنیت اور قومیت کو ہدف تنقید بنایا، انگریزوں کے خلاف تند لب و لہجہ اختیار کیا، جس نے ملت اسلامیہ اور عربوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ نے امت مسلمہ کی وحدت کو کس قدر خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔

"ان ھذہ الامة واحدة واختلف دیارھا وتعددت اجناسھا ولا یمکن ان تعرف حقیقتھا الا بعد معرفة تاریخھا الماضی فلا بد من تتبع السواقی والجداول الی الینبوع الاول الذی ھو الاصل". ٦٨ؔ

امت مسلمہ اپنے تمام تر علاقائی اور نسلی اختلافات کے باوجود ایک اکائی ہے، اس کے امتیاز و تشخص کی معرفت اس کی ماضی کی تاریخ کے بغیر ممکن نہیں، یہ معاملہ بالکلیہ ویسا ہی ہے کہ دریاؤں اور سمندروں کے حقایق کی تلاش وتتبع کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ چشمہ اولی کا پتہ لگائیں کیوں کہ یہی اصل ہے۔

اس تفسیر میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ رجوع الی القرآن سے ملت اسلامیہ کے اختلافات دور ہوں گے، بدعات اور اوہام وخرافات سے نجات ملے گی۔ اور قومیت و وطنیت کے شرور وفتن سے اہلِ ایمان محفوظ رہیں گے، لیکن افسوس کہ امت مسلمہ آج جہالت کے بدترین دور سے گزر رہی ہے، وہ اللہ کی قدرتِ کاملہ سے غافل ہے، قوم کا ہر فرد صبح وشام تلاوتِ قرآن میں مصروف ہے لیکن ان کے دلوں میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، نہ ہی انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، جب کہ قرآن کریم کے اثرات کے متعلق کہا گیا ہے:

"لوانزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعامن خشیة اللہ" (الحشر:۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

اس تفسیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور مختلف انداز میں قرآنی تعلیمات کو اپنانے کی تاکید کی گئی ہے۔

## جن اور ملائکہ

تفسیر المنار میں جن ٦٩ؔ اور ملائکہ ٧٠ؔ پر بھی اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا

گیا کہ دونوں میں ایسی کوئی بنیادی چیز نہیں پائی جاتی جس کی بنیاد پر دونوں کے مابین حد فاصل قائم کی جاسکے، صرف دونوں کی کارکردگی کی بناء پر دونوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ آیات کریمہ میں یہ صراحت موجود ہے، اس لیے جن کو ملائکہ ہی کی ایک صنف قرار دیا جائے گا، قرآن کریم میں ''الجنۃ'' کا اطلاق ملائکہ پر ہوا ہے۔

''وجعلو بینہ وبین الجنۃ نسبا'' اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ ۷۰ الف (الصافات:۱۵۸)

اور اسی لفظ کا اطلاق سورہ الناس میں شیاطین پر بھی ہوا ہے۔ جن کے متعلق عبدہٗ کا خیال ہے کہ جن ہماری نظروں سے مستور ہیں، لیکن انسانی اذہان وقلوب ان کے اثرات محسوس کرتے ہیں۔ ہر فرد کے پیچھے ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔ جو اسے مستقل شر و فساد پر اکساتا رہتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے گندے خیالات اور وسوسے انسان کے اندر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

ملائکہ کی ایک خاص تعریف جو جمہور مفسرین اور عام مسلم محققین کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ ملائکہ دراصل ایک خاص روح کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر شی کے اندر ڈال رکھا ہے، اسی روح کے توسط سے یہ نظام کائنات جاری وساری ہے، اشیاء کائنات میں اسی القاء روح کو شریعت کی زبان میں ملائکہ کہا گیا ہے۔ اہل ایمان کے نزدیک ارواح کا وجود ممکن ہے لیکن اس کی حقیقت سے وہ واقف نہیں۔ اور غیر اہلِ ایمان نے اسی چیز کو ایک طاقت سے تعبیر کیا ہے، لیکن اس کی حقیقت سے وہ بھی ناآشنا ہیں۔ لیکن اس کا اعتراف سبھی کرتے ہیں کہ نظام کائنات کے ماوراء ضرور ایسے عوامل ومحرکات ہیں جو انسانی قوت مشاہدہ اور قوت ادراک سے بالاتر ہیں۔ ملائکہ کی اسی تعریف کی تائید وتوثیق میں شیخ محمد عبدہٗ نے تفصیلی بحث کی ہے۔ اور ان لوگوں پر اظہار افسوس کیا ہے جنھوں نے مفہوم حیات کو صرف اپنی ذات یا حیوانات تک محدود کرکے رکھ دیا ہے۔ بلکہ غور کیا جائے تو دنیا میں اور بھی بہت سے ایسے سلسلے ہیں جن کا

ڈانڈا حیات ہی سے استوار ہے، لیکن اسے کسی مخصوص تعریف میں مقید کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی کارفرمائی سے انکار ممکن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"تسبح لـه السموت السبع والارض ومن فيهن وان من شئ الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم". (الاسراء:۴۴)

ساتوں آسمان اور ان میں جو موجودات ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثناء میں تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

یہ بات مخفی نہیں کہ یہ اللہ کے فرشتے زمین و آسمان میں موجود ہیں لیکن یہ چیز پردہ خفا میں ہے کہ وہ زمین میں کہاں سکونت پذیر ہیں؟ کیا ان کی رہائش گاہوں کی حدبندی یا نشاندہی کی جاسکتی ہے؟ کیا اس کا علم ہمیں ہے کہ ہمارے دائیں اور بائیں کاندھوں پر فرشتے کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ کیا اس کا مشاہدہ کیا گیا کہ ان کے نورانی اجسام نے تمہاری ظلمتوں کو منکشف کردیا؟ یا تمہارے ذہنی اضطرابات کو کافور کردیا ہو یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات ممکن نہیں۔

رشید رضا کے خیال میں ان کے استاد نے ملائکہ کے سلسلہ میں ان خیالات کے اظہار کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ تخلیق کائنات کے ماہرین کے اس خیال کی توضیح وتشریح کرسکیں جسے انھوں نے اپنی زبان میں ''قوی'' سے تعبیر کیا ہے، اور اسی شئ کو علماء اسلام ملائکہ کا نام دیتے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کی نظر میں دنیا کے تمام تغیرات وتطورات مادی اجزاء کی دین نہیں بلکہ اس کے ماوراء کچھ مخفی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ تمام حوادث روزگار رونما ہوتے ہیں۔ جب کہ علماء اسلام کا خیال ہے کہ دنیا کے تمام امور من جانب اللہ فرشتوں کے ذریعہ انجام دیے جاتے ہیں۔ اے

مختصر یہ ہے کہ یہ تفسیر اس لیے تحریر نہیں کی گئی تھی کہ اسی طرز پر چلتے ہوئے ایک اور تفسیر کا اضافہ کردیا جائے۔ اس کا بنیادی مقصد صرف رجوع الی القرآن ہے۔ اپنے اس

احساس کی ترجمانی عبدہٗ نے اس طرح کی ہے:

"ان اللہ تعالیٰ لایسئلنا یوم القیامة عن اقوال الناس وما فهموه وانما يسئلنا عن كتابه الذى انزله لارشادنا وهدايتنا وعن سنة نبينا الذى بين ما نزل الينا يسألنا هل بلغتم الرسالة؟ هل تدبرتم ما بلغتم هل عقلتم ما عنه نهيتم وما به أمرتم". ۲۷ے

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہم سے لوگوں کے اقوال وخیالات کے متعلق کوئی باز پرس نہیں کرے گا، ہم لوگوں سے صرف اللہ کی اس کتاب کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی جو ہماری رشد وہدایت کے لیے اتاری گئی ہے۔ اور ہمارے نبی کی ان سنتوں کے باب میں سوالات ہوں گے جس میں ہماری طرف نازل ہونے والی کتاب کی تشریح ہے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم لوگوں نے پیغام رسالت کو پہنچایا؟ تمہارے پاس جو کچھ آیا تھا کیا تم نے اس پر تدبر وتفکر کیا؟ اور کیا تم لوگوں نے وہ باتیں سمجھ لیں جن سے تم کو روکا گیا اور جن کا تم کو حکم دیا گیا۔

## تفردات

اس تفسیر میں بہت سے ایسے خیالات ہیں جو قابل اعتراض اور چونکا دینے والے ہیں، مثلاً اس میں تعدد ازواج کا شدت سے انکار کیا گیا ہے۔ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۲۹ "ولن تستطيعوا ان تعدلوا بين النساء ولو حرصتم" سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صدر اسلام میں اس کا جواز صرف اشاعت اسلام کی غرض سے تھا۔ جس کی آج ضرورت نہیں۔ تعدد ازواج کی صورت میں عدل کا امکان نہیں، اس لیے اس کے جواز کا کوئی معنی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے بے شمار موروثی مشکلات پیدا ہوں گی اور بہت سے خانگی دشواریوں سے گزرنا پڑے گا۔ ۳۷ے اسی طرح تفسیر سورہ فلق میں آں حضور ﷺ پر سحر کے اثرات سے یکسر انکار کیا گیا ہے اور اس سلسلے کی تمام روایات کو یکسر مسترد کر دیا گیا

ہے۔ ان کی رائے میں اس نقطۂ نظر کی تائید صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مقام نبوت سے بے خبر ہیں، اگر اسے تسلیم کرلیا گیا تو اس کی وجہ سے دین اسلام کی حقانیت، قرآن کریم کی محفوظیت اور آپ ﷺ کی معصومیت پر حرف آئے گا۔۷۴ اور اس کی وجہ سے دشمنان اسلام کو دین میں نقص نکالنے کے مواقع ملیں گے۔

اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت "أو کصیب من السماء فیه ظلمات ورعد وبرق" (البقرہ:۱۹) پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر سائنس کو سامنے رکھتے ہوئے برق، رعد، صاعقہ اور ان کے اسباب وقوع پر غور کیا جائے تو بہت سے نئے پہلو سامنے آئیں گے، یعنی فضاء میں الیکٹرانک قوت موجود ہے، اسے انسانی ذہن نے ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور ٹرانزسٹر کی صورت میں استعمال کیا ہے۔ عبدہٗ کا یہ بھی خیال ہے کہ اس آیت میں مثبت اور منفی الیکٹران کا تصور بھی موجود ہے۔۷۵ اسی طرح سورہ فیل کی تفسیر میں پرندوں نے جو پتھر اصحاب فیل پر برسائے تھے ان میں ایسے جراثیم موجود تھے کہ اس کے لگتے ہی حملہ آور چیچک اور دیگر وبائی امراض کے شکار ہوگئے،۷۷ اسی طرح آیت "واذا فرقنا بکم البحر واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون". (البقرۃ:۵۰) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دریائے نیل کے پھٹ کر راستہ بن جانے کے پیچھے عصائے موسیٰ کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ معجزاتی عمل دراصل مدوجزر کی اپنی ایک شکل تھی۔ بحر احمر میں جزر کی صورتحال اتنی شدید تھی کہ پانی اس قدر کم ہوگیا کہ ہر شخص کے لیے اس سے نکلنا آسان تھا۔ چناں چہ انہی لمحات میں موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ دریا عبور کر گئے اور اسکے بعد مد اتنا زور آور تھا کہ اس نے مصر کے باشندوں کو غرق کر دیا۔۷۸ اسی طرح سورہ "الکوثر" سے بالعموم حوض کوثر مراد لیا جاتا ہے، استاذ امام عبدہٗ کے نزدیک اس سے مراد تمام دنیاوی اور دینی خیر وانعامات ہیں جن سے اللہ کے نیک بندوں کو نوازا جائے گا۔ اللہ کی ان نعمتوں کی کثرت کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۷۹ اور اسی کوثر میں "رسالت" بھی شامل ہے جو انسانیت کے لیے سب سے بڑا انعام ہے۔۸۰ مولانا فراہی کے نزدیک "کوثر" سے مراد خانہ کعبہ ہے، کیوں کہ خانہ کعبہ کا مسلمانوں کی تحویل میں آنے کا مطلب دنیا کی سب

سے عظیم دولت ان کے حصہ میں آ گئی۔اور اس عظیم نعمت کا تقاضا تھا کہ اس رب ذوالجلال کے حضور سر بسجود ہوا جائے اور اس کے لیے قربانی دی جائے۔۸۱؎

اس تفسیر کے اور بھی کئی تفردات ہیں۔اس کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں اسباب نزول کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے کیوں کہ اسباب نزول پر غیر معمولی اعتنا سے تفسیر قرآن کا حق ادا نہیں ہوتا۔اگر اسباب نزول کی اتنی ہی اہمیت ہوتی تو نزولی ترتیب ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہوتا، اسباب نزول کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کی تفسیر کی جائے تو اس کی معنوی وحدت متاثر ہوتی ہے اور ایک منظم و مربوط کتاب ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جاتی ہے۔اسی نکتہ کے پیش نظر بار بار قرآن کی مجموعی حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے تفکر و تدبر پر زور دیا گیا ہے۔۸۲؎

اپنے اسی خیال کی مزید وضاحت عبدہٗ نے اس طرح کی ہے:

"کل کلمة فی القرآن موضوعة فی موضعها اللائق بها فلیس فیه کلمة تقدمت و لا کلمة تأخرت لاجل الفاصلة". ۸۳؎

''قرآن کریم کا ہر لفظ اپنی مناسب جگہ پر فٹ ہے اور فواصل کی بنیاد پر کسی لفظ کو مقدم اور مؤخر نہیں کیا گیا ہے۔۸۴؎

مختصر یہ کہ اسبابِ نزول کو بنیاد بناتے ہوئے تفسیر قرآن کی گئی تو یہ تفسیری معنوی خلل کا شکار ہو جائے گی۔

اس تفسیر میں مختلف جگہوں پر صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے مختلف خیالات و کرامات پر تنقید کی گئی ہے۔ان کے متعلق عوام الناس کی آراء کو بھی نا قابل اعتنا قرار دیا گیا ہے۔ان کے متعلق شفاعت کا تصور غیر اسلامی ہے اور ان کی قبور کی زیارت کرنا غیر اسلامی عمل ہے۔۸۵؎ عبدہٗ کا خیال ہے عصر حاضر کے صوفیاء کی وجہ سے تصوف کی اصل تصویر بگڑ گئی۔۸۶؎ گویا تصوف کا ایک خاص تصور عبدہٗ کے ذہن میں بھی ہے۔جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں جب کہ تصوف کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔صوفیاء کرام نے جس انداز سے قرآن کی تفسیر کی ہے اس پر بھی عبدہٗ نے انگشت نمائی کی ہے، فلسفہ وجودیت کو عبدہٗ نے غیر اسلامی

نظریہ بتلاتے ہوئے اسے ہندو برہمنیت کا شاخسانہ بتایا ہے۔۸۷

اس تفسیر کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں نماز کی اہمیت وافادیت پر جگہ جگہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ نماز تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کی شاہ کلید ہے، نماز کی پابندی سے انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں منظر عام پر آجاتی ہیں۔ یہ وہ ہتھیار ہے جس سے دنیا کی تمام طاقتوں کو زیر کیا جاسکتا ہے۔

"وهي الصلوٰة التي توثق عروة الايمان وتعلي الهمة وترفع النفس بمناجاة الله العلي الكبير وتؤلف بين القلوب بالاجتماع لها والتعارف في مساجدها". ۸۸

اور نماز ہی ایمان کی رسی کو مضبوط بناتی ہے۔ بلند ہمت بناتی ہے اور اللہ سے مناجات کے ذریعہ نفس انسانی کو عظمت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اور نماز باجماعت کے توسط سے دلوں کے جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ اور مساجد میں باہمی تعارف کو فروغ دیتی ہے۔

مذکورہ خصوصیات کے علاوہ یہ ذکر آچکا ہے کہ اس تفسیر میں ملی، معاشرتی، سیاسی عرب دنیا اور بین الاقوامی مسائل پر بھرپور انداز میں توجہ مبذول کی گئی ہے، مستشرقین کی جعل سازیوں اور عیاریوں کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار اوصاف سے یہ تفسیر متصف ہے، یہ تمام چیزیں قرآن کریم کے دعوتی اسلوب کو ابھارتی ہیں اور اسے رشد و ہدایت کی عظیم کتاب کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ عبدہٗ نے مفسرین کے روایتی انداز سے آگے بڑھ کر فہم قرآن کی راہیں باز کیں اور دنیائے تفسیر میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور ان کا پختہ یقین تھا کہ:

"انه على طريقة روحانية عمرانية يستدل بها على ان القرآن في كل عصر منبع السعادات الدينية والدنيوية".

# حواشی ومراجع


۱۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، تفسیر المنار، الہیئۃ المصریۃ العامۃ، ۱۹۷۲ء، ۱/۱۷-۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۸

۳۔ تفسیر المنار، ۱/۱۸-۱۹

۴۔ ایضاً، ۱/۱۹

۵۔ تفسیر المنار، ۱/۱۸-۱۹

۶۔ لفظ "ہدایت" پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: الامام عبدالحمید الفراہی، مفردات القرآن، (تحقیق وشرح: الدکتور محمد اجمل الاصلاحی) دار الغرب الاسلامی، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۸-۳۳۰، نیز ملاحظہ کریں: مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، باراول، دارالاشاعت الاسلامیہ، ۱۹۶۷ء، ۱/۴۳-۴۴

۷۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، ۱/۵۲-۵۴

۸۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، ص ۱۹-۲۲

۹۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، ص ۲۴-۲۶

۱۰۔ ایضاً، ۱/۳۰

۱۱۔ تفسیر جزء عم، الاستاذ الامام محمد عبدہ، الطبعۃ الخامسۃ، مطابع الشعب، (بدون تاریخ)، ص ۱۳۴

۱۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے، تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، ۲۴-۳۲

۱۳۔ تفسیر المنار، جلد چہارم، جزء ۸، ۲۶۰

۱۴۔ نظم قرآن پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، جلد اول، جزء ۲، ۱۰-۱۱

۱۵۔ المعلم عبدالحمید الفراہی، دلائل النظام، الطبعۃ الاولی، الدائرۃ الحمیدیۃ،

۱۳۸۸ھ،ص۲

۱۶۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء۲، ۲۷

۱۷۔ تفسیر المنار، جزء اول، ۱۵۱-۱۵۲

۱۸۔ ایضاً، جزء اول، ۲۵۰

۱۹۔ تفسیر المنار، جزء اول، ۸-۹

۲۰۔ ایضاً، جزء۲، ۱۶۳

۲۱۔ ایضاً، جزء اول، ۲۳

۲۲۔ ایضاً، جزء اول، ۱۰

۲۳۔ سر سید احمد خاں، تفسیر القرآن (مقدمہ)

۲۴۔ علامہ حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرآن (مقدمہ) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۰ء، ص ۵۴

۲۵۔ دیکھیے، ابوسفیان اصلاحی، سرسید اور فراہی کے تفسیری خیالات، مشمولہ (Contribution of Sir Syed Ahmad Khan to Islamic studies, (edited by Abdul Ali and Sayyid A Ahsan) ادارہ علوم اسلامیہ، (بدون تاریخ) ص ۳۱۲-۳۱۴

۲۶۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء۲، ۱۷

۲۷۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء۲، ۳۶۲

۲۸۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء۲، ۲۷۴

۲۹۔ لفظ "اللہ" پر مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، جلد اول، ۱/ ۳۷-۳۸

۳۰۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۶۸

۳۱۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۸۰

۳۲۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۳۸

۳۳۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۳۸

۳۴۔ ایضاً، جلد اول، ص ۲۴۸
۳۵۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۳۹۸
۳۶۔ صحیح مسلم، باب الزکوۃ
۳۷۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء ۲، ۸۴-۸۵
۳۸۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۳۸۴-۳۸۵
۳۹۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۶۷
۴۰۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۶۸
۴۱۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۴۰
۴۲۔ ایضاً، جلد اول، اجزء اول، ۲۸
۴۳۔ ایضاً، جلد اول، اجزء اول، ۲۹۲
۴۴۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۱۷
۴۵۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۱۰
۴۶۔ ایضاً، جلد اول، اجزء اول، ۱۵۲
۴۷۔ ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۲۰۵
۴۷۔الف۔ حوالہ سابق
۴۹۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۲۱۵
۵۰۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۷۳
۵۱۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: جلد اول، جزء ۲، ۲۵۹-۲۶۱
۵۲۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۲۶۱
۵۳۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۲۶۳
۵۴۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۲۶۹
۵۵۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۲۷۳
۵۶۔ ایضاً، جلد اول، جزء ۲، ۱۷۳

۵۷۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۲۸۵

۵۸۔ وضاحت کے لیے دیکھیے :تفسیر المنار، جلد اول، جزء۲، ۳۰۵-۳۰۶

۵۹۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۳۱۲

۶۰۔ وضاحت کے لیے دیکھیے :ایضاً، جلد اول، جزء اول، ۱۷۵-۱۷۶

۶۱۔ اس موضوع سے متعلق متعدد آیات نقل کی گئی ہیں، دیکھیے :تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، جزء ا، ۱۷۵-۱۷۷

۶۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے :تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، ۱۷۵-۱۷۷

۶۳۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۱۵۲

۶۴۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۲۴

۶۵۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۳۴۹-۳۵۰

۶۶۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۲۴۱

۶۷۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۲۴۲

۶۸۔ ایضاً، جلد اول، جزء۲، ۲۵۸

۶۹۔ سرسید جنوں کو انسانوں سے علاحدہ مخلوق تسلیم نہیں کرتے (وضاحت کے لیے دیکھیے: سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، نول کشور پرنٹنگ ورکس، لاہور (بدون تاریخ)، ۳/۵۷-۶۹

۷۰۔ سرسید کا خیال ہے ''غرض کہ تمام قویٰ جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں، اور جو مخلوقات میں ہیں وہی ملائک وملائکہ ہیں'' (سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور (بدون تاریخ) ۱/۴۲

۷۰۔الف۔ محمد لقمان سلفی ''الجنۃ'' کے بارے میں لکھتے ہیں ''بہت سے مفسرین نے یہاں ''الجنۃ'' سے مراد فرشتے لیے ہیں اور آیت کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ کفار عرب اللہ اور فرشتوں کے درمیان رشتہ بتاتے ہیں۔ یہ بات اللہ کے خلاف افترا پردازی ہے۔ فرشتے بھی جانتے ہیں کہ جو کفار ایسی بات کہتے ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ دیکھئے محمد لقمان السلفی،

تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن، امام ابن تیمیہ پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۴۲۲ھ، ۲۰۰۱ء، جزء۲، ۱۲٦٨

۷۱۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، جزء اول، ۲۲۱-۲۲۷، لفظ ''جنۃ'' کے لیے ملاحظہ ہو: الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، الطبعۃ الخامسۃ، مطابع الشعب، (بدون تاریخ) ص۱۴۲

۷۲۔ تفسیر المنار، جزء اول، ۲۲-۲۳

۷۳۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: محمد عبدہ، تفسیر القرآن، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۳٦۷ھ، ۴/۳٦۴-۳۷۰، نیز دیکھیے: الدکتور عثمان امین، رائد الفکر المصری: الامام محمد عبدہ، دار الثقافۃ العربیۃ، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹٦۵ء، ص۲۲۸-۲۳۳

۷۴۔ الاستاذ الامام محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص۱۳۸-۱۴۰

۷۵۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، ۱۴۷-۱۴۹

۷٦۔ عبدہ پتھر برسانے والے پرندوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مکھی اور مچھر کی طرح تھے، ان پرندوں کے چونچ اور پنجوں میں پتھر یا کنکریوں کا سمانا ممکن نہیں، مولانا فراہی ان پرندوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ کافی بڑی اور شکاری چڑیا تھیں۔ اور یہ پرندے پتھر برسانے کے لیے نہیں بلکہ مرداروں کا گوشت کھانے کے لیے بھیجے گئے تھے، دیکھیے: عبد الحمید فراہی تفسیر نظام القرآن، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص۳۹۲-۳۹٦۔

۷۷۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر جزء عم، ص۱۲۰

۷۸۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، ۲٦۱-۲٦۳، سر سید کا بھی یہی خیال ہے کہ بحر احمر میں جوار بھاٹے کے سبب موسی علیہ السلام کے متبعین بچ گئے اور لشکر فرعون غرق ہو کر تباہ ہو گیا۔ (سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، (بدون تاریخ) ۸۲/۱)

۷۹۔ تفسیر جزء عم، ص۱۸۰، نیز مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر المنار،

جلد اول، جزء اول، ۱۸۸-۱۸۹

۸۰۔ محمد عبدہ، رسالۃ التوحید، الطبعۃ الاولی، دار المعارف القاہرۃ، ۱۳۱۵، ص ۱۲۳-۱۳۴

۸۱۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر نظام القرآن، ص ۴۱۸-۴۲۳

۸۲۔ محمد رشید رضا، تاریخ الاستاذ، الطبعۃ الثانیۃ، مطبعۃ المنار، مصر، ۱۳۴۴ھ، ۲/۶۴۳

۸۳۔ تفسیر المنار، جزء ۲، ۱۱-۱۲

۸۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: الدکتور تشار ہز امن، الاسلام و التجدید فی مصر، لجنۃ ترجمۃ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۵ء، ص ۱۵۳-۱۵۶

۸۵۔ تاریخ الاستاذ: جزء ۲، ۳۷-۴۵

۸۶۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء ۲، ۱۹۲

۸۷۔ تفسیر المنار، جلد اول، جزء اول، ۳۴۸

۸۸۔ تفسیر المنار، ۶/۱۹۸

☆

# ڈاکٹر عُضَیمہ کی کتاب ''دراسات لأسلوب القرآن الکریم''
# ایک تعارف

محمد اجمل اصلاحی

گزشتہ صدی میں قرآنیات پر عالمِ اسلام میں جو چند عظیم الشان کارنامے منظر عام پر آئے ان میں مصر کے ڈاکٹر محمد عبدالخالق عُضَیمہ کی کتاب ''دراسات لأسلوب القرآن الکریم'' کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر عُضَیمہ مصر کے شہر طنطا میں ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم طنطا ہی کے المعھد الازھری میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جامع ازہر، قاہرہ میں داخلہ لیا اور کلیة اللغة العربیة سے فراغت کے بعد اسی میں بحیثیتِ استاد کے تقرر ہوگیا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کو جامع ازہر کی جانب سے تدریس کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا گیا۔ پھر ایک عرصہ تک لیبیا میں شیخ سنوسی کے قائم کردہ مرکز الدراسات العلیا میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ کرنل قذافی نے انقلاب کے بعد جب یہ مرکز ختم کیا تو یہ دوبارہ ازہر واپس آگئے۔ اس کے بعد جامعة الامام محمد بن سعود الاسلامیه، ریاض میں نحو و صرف کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) میں وطن واپس جاتے ہوئے قاہرہ کے ہوائی اڈہ سے نکلے تھے کہ ایک ٹریفک حادثہ میں وفات پائی۔[1]

ڈاکٹر عضیمہ کا شمار عصر حاضر کے ممتاز اور جلیل القدر علماء نحو میں ہوتا ہے۔ کتاب سیبویہ کا مطالعہ اتنی بار کیا تھا کہ اس کے مباحث اور حوالے نوک زبان تھے۔ اس عظیم اور مشکل کتاب کا ایک مفصل عالمانہ اشاریہ بھی مرتب کیا تھا جو ''فھارس کتاب سیبویه ودراسة له'' کے نام سے ۹۱۱ صفحات میں چھپا ہوا ہے۔[2] اس کے علاوہ نحو پر ان کا ایک

اہم کام ابو العباس المبرد (۲۸۵ھ) کی کتاب المقتضب کی تحقیق ہے جو ۴ جلدوں میں شائع ہوئی اور آخر میں اس کا اشاریہ ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔[۳] اسی اشاریہ کو دیکھ کر اہلِ علم نے اشتیاق ظاہر کیا کہ موصوف اسی نہج پر کتاب سیبویہ کا اشاریہ بھی مرتب کر دیتے تو اس سے استفادہ آسان ہو جاتا۔ چنانچہ مذکورہ بالا اشاریہ کی صورت میں ڈاکٹر عضیمہ نے فن نحو کے طلبہ اور اساتذہ کے ہاتھوں میں کتاب سیبویہ کے گنج مخفی کی کلید رکھ دی۔

ان کاموں کے علاوہ بھی ڈاکٹر عضیمہ نے بعض کتابیں اور مقالات لکھے۔[۴] لیکن جس کتاب نے انھیں علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت بخشی اور بالآخر اس پر انھیں ۱۴۰۳ھ (۱۹۸۳ء) میں فیصل ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا وہ ''دراسات لأسلوب القرآن الکریم'' کے نام سے قرآن مجید کے نحوی وصرفی مطالعہ پر ان کا وہ عظیم کام ہے جس کا ایک سرسری تعارف اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے۔[۵]

یہ کتاب گیارہ جلدوں میں تقریباً ۸ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور مصنف کی تقریباً ۳۵ سالہ خاموش اور مسلسل جانفشانی اور عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ استاذ محمود شاکر نے اپنے مختصر پیش لفظ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ عظیم الشان اور صبر آزما علمی منصوبہ ایک پوری جماعت کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچتا تو اس کا قابل فخر کارنامہ شمار ہوتا چہ جائے کہ اسے ایک فرد نے تن تنہا انجام دیا۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ حروف وادوات پر ہے جو تین جلدوں میں ۱۹۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصہ میں صرف کے مسائل مثلاً اوزان (ابنیۃ) مقصور وممدود، تصغیر، نسبت اور اعلال وابدال وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ چار جلدوں میں ۲۹۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ نحو کے باقی ابواب مثلاً ضمائر، اسمائے اشارہ، اسمائے موصولہ، جملہ اسمیہ وفعلیہ، منصوبات ومجرورات، اشتغال اور تنازع وغیرہ پر ہے۔ یہ بھی چار جلدوں میں ہے اور ۲۹۷۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

یہ کتاب قرآن مجید کی نحو پر کوئی مجتہدانہ تصنیف نہیں ہے۔ اس کی تیاری کا مقصد یہ تھا کہ نحو وصرف، تفسیر، اعراب القرآن اور توجیہ قراءات کی کتابوں میں جو اصول وقواعد

بیان کیے گئے ہیں انھیں قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ معلوم کیا جائے کہ یہ اصول کس حد تک قرآنی اسلوب سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے مصنف نے ایک نہایت منظم منصوبہ تیار کیا اور اصل کتاب کے آغاز سے پہلے مزید آٹھ ہزار صفحات سیاہ کیے اور چار ایسے بنیادی کام کیے جن کے بغیر اصل کام کو اس نہج پر انجام دینا ممکن نہ تھا جو مصنف کے پیش نظر تھا۔ اول یہ کہ ایک ضخیم جلد میں قرآن مجید میں وارد حروف المعانی، ضمائر اور اسمائے اشارہ وغیرہ کا اشاریہ تیار کیا۔ جیسا کہ معلوم ہے محمد فؤاد عبدالباقی کے مرتب کردہ **المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم** میں ان الفاظ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ گویا ڈاکٹر عضیمہ کا یہ کام **المعجم المفهرس** کا تکملہ تھا۔

دوسرا کام انھوں نے یہ کیا کہ ابوحیان اندلسی (۷۵۴ھ) کی **البحر المحيط**، جاراللہ زمخشری (۵۳۸ھ) کی **کشاف**، ابوالبقاء عکبری (۶۱۶ھ) کی **التبيان في اعراب القرآن**، ابوالبرکات ابن الانباری (۵۷۷ھ) کی **البيان في غريب اعراب القرآن**، اور **حاشية الجمل** وغیرہ سے نحوی وصرفی مباحث کی تلخیص کی اور اسے دو جلدوں میں کتب نحو وصرف کے معروف ابواب پر مرتب کیا۔ اسی طرح قراءات کی کتابوں سے متواتر اور شاذ قراءتوں کو علیحدہ کر کے انھیں بھی مذکورہ ترتیب کے مطابق تین جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کے بعد دو جلدوں میں قرآن مجید کے تمام الفاظ کو نحو وصرف کے ابواب پر مرتب کیا۔ اس طرح اصل کتاب کی تالیف سے قبل مواد کی جمع وترتیب کا یہ جانگسل مرحلہ آٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا۔

اس کے بعد ہر مسئلہ پر سیبویہ (۱۸۰ھ) سے لے کر ابن ہشام (۷۶۱ھ) تک علمائے نحو نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کیا، ان کے اقوال جمع کیے، پھر تفسیر اور اعراب القرآن کی کتابوں میں ان ساری آیات پر نظر ڈالی جن کے ذیل میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان آیات میں اگر قراءتوں کا کوئی اختلاف ہے تو اسے بھی ملحوظ رکھا گیا، اوران سب کے تقابلی مطالعہ کے بعد آخر میں نتیجہ بحث مکمل اعداد وشمار کے ساتھ پیش کیا۔

کتاب کی ضخامت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس میں مفسرین اور علمائے نحو و قراءات کے اقوال کو بجنسہ نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح عام طور پر آیات بھی نقل کی گئی ہیں۔ مصنف کے پیش نظر جیسا کہ انھوں نے مقدمہ میں صراحت کی ہے یہ تھا کہ کتاب خود کفیل ہو اور ناظرین کو ان مباحث پر اصل مآخذ کی جانب رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس طرح اس کتاب کو قرآن مجید کا نحوی وصرفی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کتاب کی حقیقی اہمیت اس کے انسائیکلوپیڈیا ہونے میں نہیں بلکہ ان قیمتی نتائج میں پوشیدہ ہے جو ہر بحث کے شروع میں ''لمحات'' (جھلکیاں) کے عنوان سے مختصراً پھر پوری تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔

یہاں نمونہ کے طور پر چند مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے اس کام کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ بعض قواعد میں علمائے نحو نے قرآن مجید کے اسلوب کو مدنظر نہیں رکھا اور ایسی ترکیبوں کو ممنوع قرار دیا جن کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر زمخشری کے نزدیک (أنّ) اگر (لو) کے بعد آئے تو اس کی خبر لازماً جملہ فعلیہ ہوگی جیسا کہ آیت ذیل میں ہے۔

ولو أنهم فعلوا ما يوعظون به لكان خيراً لهم (سورہ نساء:٦٦)

چناں چہ وہ ''لو أن زيداً حاضري......'' کو درست قرار نہیں دیتے۔[٦] شارح مفصل ابن یعیش (٦۴٣ھ) نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔[٧] جب کہ قرآن مجید میں اس صورت میں (أنّ) کی خبر اسم جامد اور اسم مشتق دونوں طرح آئی ہے۔ اسم جامد کی مثال سورہ لقمان میں ہے: ''ولو أنّ مافي الأرض من شجرة أقلام ......'' (آیت:٢٧) اسم مشتق کی مثال سورہ احزاب میں ہے: ''وإن يأت الأحزاب يودّوا لو أنّهم بادون في الأعراب'' (آیت:٢٠)[٨]

اسی طرح ابن مالک (٦٧٢ھ) کے نزدیک اگر (الاّ) کے بعد فعل ماضی آئے تو دو شرطوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ یا تو (الاّ) سے پہلے کوئی فعل ہو جیسے

ماانعمت علیه إلاّ شکر ،یا ماضی پر (قد) داخل ہو جیسے ماأحد إلاّ قد قام۔۹ قرآن مجید کا استقرا اس قاعدے کی تردید کرتا ہے۔سورہ فاطر میں ہے:وان من أمة إلاّ خلا فیها نذیر . (آیت:۲۴)

سورہ ص میں ارشاد ہے: ان کل إلاّ کذب الرسل (آیت:۱۴)۱۰

ابن الطراوہ (۵۲۸ھ) ایک اندلسی ادیب اور نحوی ہیں۔نحو میں ان کے بہت سے تفردات ہیں۔ ان کے نزدیک (أن) اور فعل سے مرکب مصدر مؤوّل کی جانب اضافت درست نہیں۔۱۱ ڈاکٹر عضیمہ کے استقرا کے مطابق قرآن مجید میں ۳۳ مقامات پر یہ مصدر مؤول مضاف الیہ آیا ہوا ہے۔ ۲۹ آیتوں میں مضاف لفظ ''قبل'' ہے اور ۴ آیتوں میں لفظ ''بعد''۔۱۲ تعجب یہ ہے کہ حافظ سیوطی نے همع الهوامع میں ابن الطراوہ کی رائے اور ان کا استدلال نقل کیا مگر خود اس کی تائید یا تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

بعض ترکیبوں کے بارے میں بعض علمائے نحو نے قطعیت کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید اس سے خالی ہے جب کہ ایک سے زیادہ مقامات پر یہ ترکیب استعمال ہوئی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید کا خاص اس ترکیب کے تعلق سے بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا گیا۔ چناں چہ ابوالقاسم سہیلی (۵۸۱ھ) صاحب الروض الانف نے مبتدا کی خبر پر حرف استقبال سین کے دخول کو قبیح قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک سین کا داخل کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب مبتدا سے پہلے (انّ) آیا ہو۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ ان کے شیخ ابن الطراوہ کا یہی مسلک ہے، سہیلی نے اس سلسلہ میں یہ دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب انھوں نے شیخ کے جواب میں سورہ نساء کی یہ آیت پڑھی:والذین آمنوا وعملوا الصالحات سندخلهم جنات تجری من تحتها الأنهار خالدین فیها أبدا (آیت:۵۷) تو انھوں نے کہا: اس آیت سے پہلے والی آیت پڑھو۔ سہیلی کا بیان ہے کہ جب میں نے مطلوبہ آیت (إنّ الذین کفروا بآیاتنا سوف نصلیهم ناراً) کی تلاوت کی تو وہ مسکرائے اور فرمایا: تمہارے معارضے سے تو میں گھبرا گیا تھا۔ دیکھتے نہیں سابق جملہ میں (انّ) آیا ہوا ہے۔ سہیلی کہتے ہیں کہ میں اس پر خاموش ہو گیا اور سر تسلیم خم کر

دیا۔۱۳؎ حافظ ابن القیم (۷۵۱ھ) نے بدائع الفوائد میں یہ واقعہ نقل کیا اور آگے بڑھ گئے حالاں کہ دوسرے مقامات پر انھوں نے سہیلی کی رایوں پر گرفت کی ہے مگر اس اصول کے بارے میں شاید انھیں گمان نہ ہوا کہ قرآن مجید کے اسلوب کے تتبع سے اس کی نفی ہوتی ہے۔۱۴؎ سہیلی نے اپنے شیخ کے سامنے سورہ نساء کی آیت پیش کی تھی اگر انھوں نے یا ابن قیم نے اسی سورہ پر اس پہلو سے ایک نظر دوبارہ ڈالی ہوتی تو معلوم ہوتا کہ تین آیتوں میں مبتدا کی خبر پر سین یا سوف داخل ہوا ہے جب کہ اس سے پہلے (انّ) ہرگز موجود نہیں۔ ملاحظہ ہو:

والذین آمنوا وعملوا الصالحات سندخلهم جنّت تجری من تحتها الأنهار خالدین فیها أبداً وعد الله حق ومن أصدق من الله قیلا (۱۲۲)

أولئک سنؤتیهم أجراً عظیما (۱۶۲)

فأما الذین آمنوا بالله واعتصموا به فسیدخلهم فی رحمة منه وفضل (۱۷۵)

اس کے علاوہ سورہ روم میں ہے: وهم من بعد غلبهم سیغلبون (۳)

سورہ ہود میں ارشاد ہے: وأمم سنمتّعهم (۴۸)۱۵؎

اسی طرح حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں کم استفہامیہ کے بارے میں جزم کے ساتھ یہ لکھ دیا کہ قرآن مجید میں اس کا وجود نہیں (لم تقع فی القرآن)۱۶؎ حالاں کہ کم از کم تین آیات میں استفہامیہ ہونا قطعی ہے اور باقی پانچ آیات میں استفہامیہ بھی ہوسکتا ہے اور خبریہ بھی۔ استفہامیہ والی آیات ملاحظہ ہوں:

قال کم لبثت قال لبثت یوماً أو بعض یوم (بقرہ:۲۵۹)

قال قائل منهم کم لبثتم قالوا لبثنا یوماً أو بعض یوم (کہف:۱۹)

قال کم لبثتم فی الأرض عدد سنین قالوا لبثنا یوما أو بعض یوم (مؤمنون:۱۱۲-۱۱۳)۱۷؎

بعض دفعہ ناقص استقراء کی بنا پر کسی ترکیب کے بارے میں یہ دعویٰ کر دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں وہ صرف دو یا تین بار آئی ہے حالاں کہ تحقیق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعیین درست نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سہیلی نے جن کا ذکر ابھی گزرا نتائج الفکر میں لکھا ہے کہ لفظ ''کل'' اگر مضاف نہ ہو تو اس کی خبر کو جمع ہونا چاہیے، البتہ قرآن مجید میں دو مقامات پر خبر مفرد آئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۴ قل کل یعمل علی شاکلته اور سورہ ق کی آیت نمبر ۱۴ کل کذب الرسل نقل کی ہے۔ اور اس کی توجیہ کی ہے ۱۸۔ حافظ ابن القیم نے یہاں بھی بدائع الفوائد میں سہیلی کا یہ قول بغیر کسی نقد و استدراک کے نقل کیا ہے۔ ۱۹ جب کہ ڈاکٹر عضیمہ کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کے علاوہ ۹ آیات میں ''کل'' کی خبر مذکورہ صورت میں مفرد آئی ہے۔ ۲۰

چار آیات یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

قل کل متربص فتربصوا (طہ:۱۳۵)

إن کل إلا کذّب الرسل (ص:۱۴)

کل له أواب (ص:۱۹)

کل قد علم صلاته وتسبیحه (نور:۴۱)

ناقص استقراء کی ایک اور مثال: حافظ سیوطی نے ھمع الھوامع میں صفار (بعد ۶۳۰ھ) کی رائے نقل کی ہے کہ (ام منقطعہ) قرآن مجید میں ادوات استفہام پر صرف دو مقامات پر داخل ہوا ہے اس کے بعد سورہ ملک کی آیت نمبر ۲۰ أمّن ھذا الذی ھو جند لکم اور آیت نمبر ۲۱ أمّن ھذا الذی یرزقکم کو غلطی سے ''أمّن یرزقکم'' کی صورت میں نقل کیا ہے چناں چہ ابو حیان اندلسی (۷۵۴ھ) نے اسے بیجا جسارت اور قرآن مجید یاد نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ ۲۱ قرآن مجید میں اس کے سوا کئی مقامات پر ام منقطعہ ادوات استفہام پر داخل ہوا ہے۔ ۴ مثالیں تو صرف ایک جگہ سورہ نمل آیات ۶۰-۶۴ میں موجود ہیں۔ سورہ نمل ہی میں ایک اور آیت ہے: أم ماذا کنتم تعملون (۸۴)۔ سورہ رعد میں ہے: أم ھل تستوی الظلمات والنور (۱۶) سورہ نساء میں

ہے: أم من یکون علیھم وکیلاً (۴)۔۲۲

لطف کی بات یہ ہے کہ یہی ابوحیان جنھوں نے صفار پر یہاں سخت نکتہ چینی کی، اپنی تفسیر البحر المحیط میں (مَن) کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاں تک ہمیں علم ہے قرآن مجید میں صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں پہلے (من) کے لفظ کی رعایت کی گئی ہو پھر معنی کی رعایت اور اس کے بعد دوبارہ لفظ کی رعایت کی گئی ہو۔

یہ بات انھوں نے سورہ لقمان کی آیات ۶-۷ کی تفسیر میں لکھی ہے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ان سے قبل علمائے نحو اس اسلوب کی مثال میں صرف سورہ طلاق کی آیت نمبر ۱۱ کا ذکر کرتے رہے ہیں۔۲۳ لیکن جب سورہ زخرف کی آیات نمبر ۳۶-۳۸ پر پہنچے تو انھیں بھی اس اسلوب کی مثال قرار دیا۔۲۴ اس طرح النھر الماد (۳:۵۱۷) میں سورہ مائدہ کی آیات نمبر ۶۰-۶۱ میں بھی یہ اسلوب نظر آیا۔ گویا خود ابوحیان کی تشریح کے مطابق قرآن مجید میں یہ اسلوب چار جگہوں پر موجود ہے۔۲۵

مذکورہ بالا مثالوں سے ڈاکٹر عضیمہ کے کارنامے کی قدر وقیمت کا اندازہ ایک حد تک کیا جاسکتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ گیارہ جلدوں پر مشتمل کتاب کے مباحث اور نتائج کا مفصل تعارف اور جائزہ چند صفحات میں ممکن نہیں۔

آخر میں ایک اہم نکتہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عضیمہ کا خیال ہے کہ شعری شواہد کے ساتھ متقدمین کے اعتناء اور انہماک نے انھیں قرآنی شواہد پر کما حقہ توجہ دینے کا موقع نہیں دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کلام عرب پر مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ محمود شاکر نے کتاب کے پیش لفظ میں اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلام عرب پر قدماء کا جو کام ہے وہ بھی محتاج تکمیل ہے، اور ڈاکٹر عضیمہ نے قرآن مجید پر کامل استقصاء اور اعداد و شمار کے ساتھ جو کارنامہ انجام دیا ہے، ضرورت ہے کہ ایک منظم جماعت اسی طرز پر جاہلی اور اسلامی شاعری پر بھی کام کا بیڑا اٹھائے۔ استاذ محمود شاکر کے نزدیک یہ دوسری مہم بھی سر ہو جائے تو امید ہے کہ اعجاز القرآن کے موضوع پر از سر نو غور وفکر کی راہ ہموار ہوگی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ

کلام عرب پر اس نہج سے کام کرنے کے بعد قرآن مجید کے اسلوب پر ہمارے مفسرین، علمائے نحو اور علمائے بلاغت نے جو کچھ لکھا ہے خود اس پر بھی کہیں کہیں نظر ثانی کی ضرورت پیش آئے گی جیسا کہ مولانا فراہی کی تحقیقات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔[۲۶]

## حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر عضیمہ کے مختصر حالات کے لیے دیکھیے احمد العلاونۃ، ذیل الاعلام، دار المنارۃ، جدہ، ۱۴۱۸ھ، جلد اول ص ۱۸۴؛ نزار اباظہ و محمد ریاض المالح، اتمام الاعلام، دار صادر، بیروت، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴۹۔

۲۔ اس اشاریہ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں مطبعۃ السعادۃ قاہرہ سے شائع ہوا۔

۳۔ کتاب المقتضب، دار التحریر قاہرہ سے ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئی۔

۴۔ مثلاً المذکر و المؤنث لابن الانباری کی جلد اول کی تحقیق، ابو العباس المبرد واثرہ فی علوم العربیۃ، المغنی فی تصریف الافعال، ھادی الطریق الی ذخائر التطبیق، فھارس مسائل النحو والصرف فی معانی القرآن للفراء۔ دیکھیے ذیل الاعلام: ۱۸۴۔

۵۔ اس تعارف کی تیاری میں مصنف کے مقدمہ سے مدد لی گئی ہے۔

۶۔ المفصل، دار الجیل، بیروت، ص ۳۱۳۔

۷۔ شرح المفصل، بیروت ۹: ۱۱۔

۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دراسات لاسلوب القرآن الکریم، قسم الاول، جزء اول ص ۴۵۸۔

۹۔ جلال الدین سیوطی، ھمع الھوامع، تحقیق عبد العال سالم مکرم، عالم الکتب، قاہرہ، ۱۴۲۱ھ، ۳: ۲۷۵۔

۱۰۔ دراسات لاسلوب القرآن الکریم، قسم اول، جزء اول ص ۱۹۰۔

۱۱۔ همع الهوامع ۴:۹۳۔
۱۲۔ دراسات، قسم اول، جزء اول، ص ۳۵۷۔
۱۳۔ سہیلی، نتائج الفکر فی النحو، تحقیق محمد ابراہیم البنا، دار الریاض، ص ۱۲۲۔
۱۴۔ ابن القیم، بدائع الفوائد، تحقیق علی بن محمد العمران، دار عالم الفوائد، مکۃ المکرمۃ، ۱۴۲۵ھ، ۱:۱۵۷۔
۱۵۔ دراسات، قسم اول، جزء ثانی، ص ۱۹۰۔
۱۶۔ الاتقان فی علوم القرآن، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، ۱۴۰۸ھ، ۲:۲۲۲۔
۱۷۔ دراسات، قسم اول، جزء ثانی، ص ۴۰۲۔
۱۸۔ نتائج الفکر: ۲۸۰
۱۹۔ بدائع الفوائد ۱:۳۶۹
۲۰۔ دراسات، قسم اول، جزء ثانی، ص ۳۵۹
۲۱۔ همع الهوامع ۵:۲۴۵
۲۲۔ دراسات، قسم اول، جزء اول، ص ۳۰۹
۲۳۔ البحر المحیط، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ، ۸:۴۱۰
۲۴۔ ماخذ سابق ۹:۳۷۴
۲۵۔ دراسات، قسم اول، جزء ثالث، ص ۳۱۱-۳۱۳۔
۲۶۔ مثال کے طور پر دیکھیے مفردات القرآن، تحقیق محمد اجمل ایوب اصلاحی، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۲۲ھ، ص ۱۴۰، ۲۶۰۔

☆

# تفسیر التحریر والتنویر

## قرآنی بلاغت پر بیسویں صدی کا عظیم ترین کارنامہ

محی الدین غازی سبحانی

بیسویں صدی کے آغاز میں امام حمید الدین فراہیؒ نے اپنا یہ احساس قلم بند کیا کہ عبدالقاہر جرجانی نے مشہور زمانہ تصنیف 'دلائل الاعجاز' کے ذریعہ قرآنی اعجاز و بلاغت کی سمت جو پیش قدمی کی تھی وہ نا تمام رہ گئی تھی اگر بعد والوں نے یہ کام مکمل کرلیا ہوتا تو عربی زبان کے علاوہ قرآن فہمی اور قرآنی بلاغت واعجاز سے آگاہی کے لیے بھی یہ مفید تر ذریعہ ہوتا۔[1] امام فراہیؒ نے اس کارِ ناتمام کی تکمیل کے لیے اسالیب القرآن کی تصنیف کا خاکہ بنایا مگر وہ خاکہ بھی ناتمام رہ گیا۔

دوسری جانب اسی صدی کے ربع اول میں اقصائے مغرب میں واقع ملک تونس میں علامہ محمد طاہر بن عاشور[2] بھی اسی رخ پر سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ''قرآن مجید سے متعلق ہر فن کو مستقل موضوع بنا کر تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ مگر وہ فن جس کے لطیف نکتوں سے قرآن مجید کی ہر آیت مالا مال ہے یعنی قرآنی بلاغت پر کسی مفسر نے خصوصیت کے ساتھ مستقل کتاب نہیں لکھی''۔[3]

ابن عاشور نے اسی نہج پر تفسیر لکھنے کا آغاز ۱۹۲۰ء میں کیا اور ۱۹۶۰ء میں چالیس سال کی محنت اور جان فشانی کے بعد اسے مکمل کیا۔ اجزائے قرآنی کی تقسیم کے مطابق تیس اجزاء پر مشتمل یہ ایک ضخیم تفسیر ہے۔ یہ ضخامت قابل ذکر اس لیے بھی ہے کیوں کہ وہ طوالت کلام سے پاک ہے۔ پہلی بار دارتونسیہ سے اس کا ایڈیشن شائع ہوا۔[4] اور بہت

گراں ہونے کے باوجود طلبہ اور اساتذہ تفسیر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

دور حاضر میں تفاسیر، تفسیری مناہج اور قرآنی علوم کے موضوع پر متعدد تحقیقی کام ہوئے ہیں مگر اس تفسیر کے تذکرے سے وہ خالی ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ تفسیر ایک دور دراز ملک میں لکھی گئی اور بہت تاخیر سے منظر عام پر آئی۔ اسماعیل حسنی کی کتاب **نظریة المقاصد عند الامام محمد طاهر بن عاشور** ۵ کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ العتیق الصحی نے **التفسیر والمقاصد عند الشیخ محمد الطاهر بن عاشور** اور ابراہیم الوافی نے **محمد الطاهر بن عاشور ومنهجه فی التفسیر** کے نام سے تحقیقی مقالے لکھ کر اس تفسیر پر کام کیا ہے۔ ۶

تفسیر مذکور کا پورا نام **تحریر المعنی السدید وتنویر العقل الجدید** ہے لیکن وہ اپنے مختصر نام **التحریر والتنویر** سے مشہور ہے۔

**التحریر والتنویر** کے اہم مآخذ جیسا کہ خود ابن عاشور نے ذکر کیا ہے درج ذیل تفاسیر ہیں۔ ۷ کشاف، المحرر الوجیز، مفاتیح الغیب، تفسیر بیضاوی، تفسیر محمد بن عرفہ، تفسیر ابی السعود، تفسیر قرطبی اور تفسیر طبری۔ علاوہ ازیں جن کتابوں سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ہے ان میں کشاف پر طیبی، قزوینی، قطب اور تفتازانی کے حواشی، بیضاوی پر شہاب کا حاشیہ اور درۃ التنزیل شامل ہیں۔ تفسیر کا آغاز ایک طویل مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت ابن عاشور نے اپنے تفسیری منہج کو بیان کیا ہے۔

تفسیر ابن عاشور کی سب سے نمایاں خصوصیت قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اس کی ترکیز (focus) ہے۔ قرآن مجید کی بلاغت کے جن پہلوؤں کی تادم تحریر نشاندہی کی جا چکی تھی اور مفسرین نے مختلف آیتوں کے تحت جن نکات کو بیان کیا ہے ابن عاشور ان کے انتخاب کے علاوہ ان پر غیر معمولی اضافہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| "**فانی بذلت الجهد فی الکشف** | میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ قرآن |
| **عن نکت من معانی القرآن** | کے معانی اور اعجاز کے وہ نکات سامنے |
| **واعجازه خلت عنها التفاسیر** | لاؤں جن سے تفسیریں خالی ہیں اور فصیح |

ومن أساليب استعمال الفصيح ما تصبوا إليه همم النحارير بحيث ساوى هذا التفسير على اختصاره مطولات القماطير ففيه أحسن ما في التفاسير وفيه أحسن مما في التفاسير"۔۸

کلام کے ان اسالیب سے پردہ کشائی کروں جہاں تک پہنچنے سے بڑے بڑوں کے حوصلے کوتاہ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہ تفسیر باوجود اختصار کے ضخیم کتابوں کے برابر ہوگئی۔ جو کچھ تفسیروں میں ہے اس کا بہترین انتخاب اس میں ہے اور جو کچھ تفسیروں میں ہے اس سے بہتر بھی بہت کچھ اس میں ہے۔

ابن عاشور کے تصور بلاغت میں بڑی وسعت ہے بلاغت پر ان کی گفتگو محض تشبیہ واستعارہ اور جناس وطباق تک محدود نہیں ہے گوکہ وہ ان کا بیان بھی بہت اہتمام سے کرتے ہیں مگر اس سے آگے بڑھ کر الفاظ کا انتخاب، اسالیب کا انتخاب، الفاظ واسالیب کا اختلاف وتنوع، تکرار، ترتیب، تقدیم وتاخیر اور دقیق تر اسالیب جیسے احتراس، ادماج، احتباک اعتراض، التفات، استہلال، تخلص، حذف اور اس کے علاوہ بہت کچھ جس پر وہ آیت بہ آیت گفتگو کرتے ہیں۔

ثم ارجع البصر كرّتين ينقلب إليك البصر خاسئا (الملک:۴) میں مرتین کے بجائے کرتین کیوں انسب ہے جب کہ الطلاق مرتان میں کرتین کیوں مناسب نہیں تھا۔ یرجع کے بجائے ینقلب کے انتخاب میں کیا نکتہ ہے۔۹ ماأدراک اور ما یدریک میں کیا فرق ہے۔۱۰ فلا تعجل عليهم اور فلا تستعجل لهم میں کیا فرق ہے۔۱۱ اور اس فرق کی قرآن مجید میں کس طرح رعایت کی گئی۔ ألا تجوع فيها و لا تعرى (طہٰ:۱۱۸) اور لا تظمأ فيها و لا تضحى (طہٰ:۱۱۹) میں جوع اور ظمأ کی بظاہر تقسیم کے بجائے یہ تقسیم کیوں اختیار کی گئی۔۱۲ سورہ اسراء کی وصیتوں (۲۲-۳۹) اور سورہ انعام کی وصیتوں میں (۱۵۱-۱۵۳) مخاطب کے بدل جانے سے اسلوب میں کن دقیق نکات کا وجود ہوا۔۱۳ من املاق اور خشية املاق میں کیا فرق ہے اور اول

الذکر کے ساتھ نحن نرزقکم وایاھم اور ثانی الذکر کے ساتھ نحن نرزقھم وایاکم کے فرق میں کون سی معنویت پوشیدہ اور ملحوظ ہے۔[۱۴] فلما أضاء لهم مشوا فيه واذا أظلم عليهم قاموا (البقرۃ:۲۰) میں فلما اور إذا کا فرق کس نفسیاتی کیفیت کا غماز ہے۔[۱۵] غرض یہ وہ مقامات ہیں جہاں ابن عاشور کا قرآنی ذوق بلاغت میں نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے اور اس میدان میں ان کے تفوق کو ظاہر کرتا ہے۔

لا اقسم بيوم القيامة (القیامۃ:۱) کے تحت ابن عاشور لکھتے ہیں۔ وفيه محسن بديعي فى قبيل تاكيد المدح بما يشبه الذم وهذا لم نذكره فيما مضى ولم يذكره أحد۔[۱۶]

(اس اسلوب میں ایک محسن بدیعی ہے اور وہ اس قبیل سے ہے کہ مدح میں اس طرح زور دیا جائے کہ وہ ذم لگنے لگے۔ یہ ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر نہیں کیا اور کسی اور نے بھی اسے ذکر نہیں کیا ہے۔)

واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں تفسیر بیانی اور اعجاز فنی کے عنوان سے قرآنی بلاغت پر جو کام ہوئے ہیں، بشمول بنت الشاطیؒ اور سید قطب، ابن عاشور کی کوشش ان سب سے اس طور سے ممتاز ہے کہ وہ اعجاز وبلاغت کے علمی اصولوں اور مسلمہ بنیادوں پر قائم ہے جب کہ اول الذکر کاموں کا بڑا حصہ ذوقیات پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود وہ بھی قرآنی اعجاز کے میدان میں غیر معمولی کارناموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں ان کی قدر ناشناسی قطعاً پیش نظر نہیں ہے۔

ابن عاشور کی ایک خاص دل چسپی ان اسالیب کی دریافت ہے جو ان کے مطابق قرآن مجید نے پہلی مرتبہ استعمال کیے یا یہ کہ قرآن مجید ان کے استعمال کے سلسلے میں منفرد ہے۔

يوم يجعل الولدان شيبا (مزمل:۱۷) کے سلسلہ میں پہلے وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں مبالغہ، دو مجاز عقلی اور ایک کنایہ کا یکجا استعمال کیا گیا ہے پھر وہ لکھتے ہیں: وهى مبالغة عجيبة وهى من مبتكرات القرآن فيما أحسب لأنى لم أر هذا المعنى

فی کلام العرب۔ ۱۷

یہ ایک عجیب نوعیت کا مبالغہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ قرآنی ایجادات میں سے ہے۔ کیوں کہ یہ معنی مجھے کلام عرب میں نظر نہیں آیا۔

ہلاک کردینے کے لیے قطع الوتین (الحاقۃ:۴۶) کی تعبیر بھی ان کے نزدیک نئی ہے۔ ۱۸ سورہ بقرہ کی آیت مثلھم کمثل الذی استوقدنارا (البقرۃ:۱۷) کی بلاغت پر بھر پور گفتگو اور اعجاز کے گوناگوں پہلوؤں کو آشکارا کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| فھذا ایجاز بدیع کأنہ قیل: فلما أضاء ت ذھب اللہ بنارہ فکذلک ذھب اللہ بنورھم وھو اسلوب لا عھد للعرب بمثلہ فھو من أسالیب الاعجاز۔ ۱۹ | یہ انوکھا ایجاز ہے۔ گویا یہ کہا گیا کہ جب وہ روشن ہوگئی تو اللہ نے اس کی آگ کو ختم کردیا اسی طرح اللہ نے ان کی روشنی بھی چھین لی۔ اس اسلوب کا عربوں کو کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ یہ اعجاز کے اسالیب میں سے ہے۔ |

ان کا یہ دعویٰ بھی تحقیق کا موضوع ہے کہ محسنات بدیعۃ عربی شاعری سے زیادہ قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ۲۰ صنعت مقلوب کو عربی زبان کی حد تک وہ قرآنی ایجاد مانتے ہیں۔ ۲۱ جیسے کل فی فلک (یٰسٓ:۴۰) اور ربک فکبر (مدثر:۳)

البتہ اپنی تفسیر میں انھوں نے اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کی ہے کہ کسی بھی اسلوب کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے جب کہ کلام عرب کے اصل سرمائے کے بالمقابل بہت ہی کم سرمایہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات بجائے خود نہایت اہم ہے کہ ابن عاشور نے کلام عرب کے دستیاب سرمایہ کا بھرپور استقرا کیا ہے اور یہ ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو ہے۔

مبتکرات القرآن کے باب میں ان کا یہ معرکۃ الآراء دعویٰ بھی شامل ہے کہ قرآن مجید میں ایک لفظ مشترک سے بیک وقت اس کے دو یا دو سے زائد معانی مراد ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی بیک استعمال مراد لیے

جا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ومن أساليب القرآن المتفرد بها التى أغفل المفسرون اعتبارها أنه يرد فيه استعمال اللفظ المشترك فى معنيين او معان إذا صلح المقام بحسب اللغة العربية لارادة ما يصلح منها استعمال اللفظ فى المعنى الحقيقى والمجازى إذا صلح المقام لإرادتهما۔[۲۲] | قرآن مجید کا ایک منفرد اسلوب جس کے لحاظ کو مفسرین نے نظر انداز کیا ہے یہ ہے کہ لفظ مشترک دو یا زائد معنوں میں استعمال ہوجاتا ہے جب عربی زبان کی رو سے انھیں مراد لینا درست ہو اور ایک لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوجاتا ہے جب کہ موقع دونوں کو مراد لینے کے لیے مناسب ہو۔ |

اس کی مثال میں وہ یہ آیتیں پیش کرتے ہیں۔ یبسطوا إليكم أيديهم و ألسنتهم بالسوء (ممتحنہ:۲) یہاں بسط بیک استعمال حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے، ہاتھ کے ساتھ حقیقی اور زبان کے ساتھ مجازی۔ اسی طرح ولله يسجد من فى السموت والأرض والشجر والدواب والأنعام وكثير من الناس (الحج:۱۸) میں سجدہ کا استعمال دونوں معنوں میں ہوا ہے۔[۲۳]

ابن عاشور کی جستجو کا ایک خاص نکتہ عادات القرآن بھی ہیں۔ لکھتے ہیں: وقد استقريت بجهدى عادات كثيرة فى اصطلاح القرآن۔[۲۴]

میں نے اپنی محنت سے قرآنی اصطلاح کی بہت سی عادتوں کا استقراء کیا ہے۔ لفظ هؤلاء کے بارے میں ان کا استقراء یہ ہے کہ اگر اس کے بعد مشار الیہ کی تعیین کے لیے عطف بیان نہیں آئے تو مشرکین مکہ مراد ہوتے ہیں۔[۲۵]

قرآنی مکالمات کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ جب تک مکالمہ تبدیل نہ ہوجائے قرآن مجید قال کا استعمال بغیر حرف عطف کے کرتا ہے۔[۲۶]

التحرير والتنوير کی ایک اور خصوصیت الفاظ قرآنی کی تحقیق ہے۔ پوری

تفسیر مفردات القرآن کی تحقیق سے مالا مال ہے۔ اس میدان میں ابن عاشور کا انداز تحقیق اور اجتہادی ہے۔ کلام عرب کے تتبع کو وہ ائمہ لغت کی تقلید پر ترجیح دیتے ہیں۔ **إن الانسان خلق هلوعا** (معارج:۱۹) لفظ **هلع** ۲۷ اور **انک بالواد المقدس طوی** (طٰہٰ:۱۲) میں لفظ **طوی** ۲۸ اور دیگر متعدد قرآنی الفاظ کے سلسلے میں انھوں نے نئی تحقیق پیش کی ہے۔ اس پس منظر میں اساطین لغت پر ان کی تنقید بھی بے لاگ ہوتی ہے۔

آیت کی تاویل کے سلسلے میں اصولی طور پر ابن عاشور کا موقف امام فراہیؒ کے برعکس ہے۔ امام فراہیؒ کے اس دعویٰ کے مقابل کہ قرآن مجید صرف ایک تاویل کا متحمل ہے۔ ۲۹ ابن عاشور کا موقف یہ ہے کہ ہر آیت کی ایک سے زائد تاویلیں ہوسکتی ہیں اور اگر کوئی مانع نہ ہو تو تمام تاویلیں مراد بھی ہوتی ہیں۔ ۳۰ وہ مفسرین کے اس رویہ پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ راجح تاویل اختیار کر کے بقیہ تاویلوں کو ناقابل التفات قرار دیتے ہیں۔ ۳۱

قرآن کی آیتوں کی یہ وسعت کہ تمام احتمالی وجوہ ان میں سما سکتے ہیں ماسوا ان کے جو عربی زبان وقواعد کے خلاف ہوں اور جن کی سیاق کلام میں گنجائش نہ ہو ابن عاشور کے نزدیک قرآنی اعجاز میں شامل ہیں ۳۲

اس نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد جہاں انھوں نے اس کا اہتمام کیا کہ ہر آیت کی بلاغت پر اس کے جملہ محتمل وجوہ کو سامنے رکھ کر گفتگو کریں وہیں انھیں نئے وجوہ کا اضافہ کرنے کی مہمیز بھی ملی۔ چناں چہ ان کی تفسیر میں نئی تاویلوں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے۔ **لم نجعل له من قبل سميا** (مریم:۷) ۳۳ **لولا أن تدارکه نعمة من ربه لنبذ بالعراء وهو مذموم** (القلم:۴۹) ۳۴ **لقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم** (التین:۴) ۳۵ **فقد صغت قلوبکما** (التحریم:۴) ۳۶ **حتی إذا فتحت یاجوج وماجوج** (الانبیاء:۹۶) ۳۷ **ربنا اکشف عنا العذاب إنا مؤمنون** (الدخان:۱۲) ۳۸ **فزادوهم رهقا** (الجن:۶) ۳۹ جیسی بہت ساری آیتوں کی تاویل انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر پیش کی۔

تاہم اس نکتہ نظر کے علی الرغم انھوں نے متعدد مشہور تاویلوں پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ **إلا إذا تمنی القی الشیطان فی أمنیته** (الحج:۵۲) ۴۰ **و إن منکم إلا واردها** (مریم:۷۱) ۴۱ **إذ یقول أمثلهم طریقة إن لبثتم إلا یوما** (طہ:۱۰۴) ۴۲ وغیرہ مقامات پر مشہور روایوں پر ان کی تنقید سخت ہے اور قاری کو غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ابن عاشور تفسیر بالماثور کی قید کے قائل نہیں ہیں۔ تاہم وہ آیتوں کی اپنی تحقیق کے مطابق تاویل کی روشنی میں تفسیری روایات کی توجیہ کا اہتمام کرتے ہیں۔

**تلک الغرانیق العلی** والی روایت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔ ''یہ قصہ حد درجہ ضعیف اسانید سے مروی ہے اس کی کسی بھی سند میں کسی صحابی کا مجلس رسولؐ میں اس کا سننا موجود نہیں ہے۔ ابن عباسؓ تک اس کی سند بھی مطعون ہے۔ علاوہ ازیں جب سورہ نجم نازل ہوئی ابن عباسؓ آپؐ کی مجلس میں شریک بھی نہیں ہوتے تھے۔ پھر یہ خبر واحد ہے جو اصول دین سے متعارض ہے۔ کیوں کہ عصمت رسول ﷺ کے اصول کے خلاف ہے ...... اگر ثقہ بھی اسے روایت کرتے تو اسے رد کرنا اور اس کی تاویل کرنا ضروری تھا پھر یہ تو بالکل ضعیف اور کمزور ہے۔ ۴۳

پھر اس واقعہ کی توجیہ یوں کرتے ہیں: ''یہ بات تو درست ہے کہ سورہ نجم کا آخری حصہ جب نازل ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی سجدہ ریز ہو گئے، یہ ایک خدائی معجزہ تھا۔ پھر ہوا یہ کہ ابن الزبعری جیسے لوگوں نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اپنی طرف سے ایک جملہ گھڑ کر کہنا شروع کیا کہ ہم تو سجدہ ریز اس لیے ہوئے تھے کیوں کہ ہمارے معبودوں کا بھی ذکر خیر اس میں کیا گیا ہے۔ ابن الزبعری نے یہ پروپگنڈہ اس زور وشور سے کیا کہ وہ ہمارے ذخیرہ روایات میں بھی شامل ہو گیا اور سورہ حج کی اس آیت کے ساتھ جوڑ کر اس کا مفہوم بگاڑ دیا گیا، حالانکہ سورہ حج کی اس آیت کی بالکل ہی دوسری تاویل ہے۔ درحقیقت سورہ نجم کے موقعہ پر سجدہ ریز ہونے والا واقعہ بالکل الگ ہے اور صحیح ہے۔ مہاجرین حبشہ کا واپس آنا بالکل ہی الگ واقعہ ہے۔ اور **تلک الغرانیق العلی** والا پروپگنڈہ ان دونوں واقعات سے الگ ایک چیز ہے۔ ۴۴

ابن عاشور کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے دل چسپی کا ایک اہم موضوع مقاصد شریعت کے تعلق سے ان کے نظریات اور تفسیر میں ان کا انطباق ہے۔ **مقاصد الشریعة الاسلامیة** کے عنوان سے ان کی مستقل تصنیف بھی ہے جو اس موضوع پر امام شاطبی کی **الموافقات** کے بعد اہم ترین کتاب مانی گئی ہے۔ ابن عاشور دور حاضر میں فکر مقاصدی کے امام قرار دیے گئے ہیں۔ ان کی تفسیر کے اس پہلو کا مفصل جائزہ اسماعیل حسنی نے اپنی کتاب **نظریة المقاصد عند الامام محمد الطاهر بن عاشور** میں پیش کیا ہے۔

ابن عاشور کا یہ دعویٰ کہ ان کی تفسیر **احسن ما فی التفاسیر** اور **أحسن مما فی التفاسیر** کا مجموعہ ہے بہت تفصیلی مطالعہ چاہتا ہے۔ تاہم یہ بات قرین واقعہ ہوگی کہ قرآنی بلاغت پر گفتگو کے پہلو سے یہ اب تک کی سب سے بھرپور تفسیر ہے۔

بلاغت کے پہلو سے **التحریر والتنویر** کا مطالعہ کرتے ہوئے امام زمخشریؒ کی تفسیر **الکشاف** سے اس کا موازنہ بھی ضروری ہے۔ ابن عاشور نے جہاں کشاف پر قابل لحاظ اضافہ کیا ہے وہیں کشاف کے اشارات کی وضاحت بھی کی ہے۔ زمخشریؒ کی قرآنی بلاغت پر گفتگو کو جو بیشتر اشارات پر مشتمل ہے سمجھنے کے لیے ابن عاشور کی تفسیر سے بہت مدد ملتی ہے۔ قرآنی اسالیب کا مطالعہ کرتے ہوئے ابن عاشور اور فراہیؒ میں موازنہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ امام فراہیؒ نے **اسالیب القرآن** میں جو عنوانات قائم کیے ہیں وہ ابن عاشور کے یہاں بھی اسی اہتمام سے ملتے ہیں۔ بیشتر مثالوں پر دونوں کا اتفاق بھی پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں تاویلات کے باب میں بھی بہت سی معرکۃ الآرا تاویلوں میں دونوں کو یکساں توارد ہوا ہے۔ البتہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابن عاشور سورہ کے داخلی نظم کی اہمیت تسلیم کر لینے کے بعد بھی سورتوں کے باہمی ربط کے بالکل قائل نہیں ہے۔[۴۵]

اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ابن عاشور تک امام فراہیؒ کی تصنیفات نہیں پہنچ سکیں، ورنہ وہ **احسن تقویم** کی تفسیر خیر وشر میں تمیز کرنے والی فطرت سلیمہ سے کرنے کے بعد یہ نہ کہتے کہ قدیم وجدید کوئی مفسر اس مفہوم تک نہیں پہنچ سکا۔[۴۶]

بیسویں صدی میں تفسیر اور قرآنی علوم کے میدان میں بہت سی فتوحات ہیں جو اس صدی کو گزشتہ کئی صدیوں سے ممتاز کرتی ہیں، مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس دوران دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والے عظیم تحقیقی کاموں کا تبادلہ معلومات نہیں ہوسکا۔ فراہیؒ اور ابن عاشورؒ کے درمیان گہرے موازنہ کے بعد پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر امام فراہیؒ کی فتوحات کے احوال علامہ ابن عاشور تک پہنچ گئے ہوتے تو ابن عاشور کی فتوحات کا کچھ اور ہی عالم ہوتا۔ کیا اکیسویں صدی میں اس تبادلہ معلومات کو یقینی بنایا جاسکے گا؟

ابن عاشور نے جرجانی، زمخشری اور سکاکی کے تصور بلاغت کا پوری تفسیر میں انطباق کیا اور خوب کیا ہے۔

کیا اکیسویں صدی میں اس تصور بلاغت کے پورے قرآن مجید پر انطباق کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکے گا جس کی شاہ کلید نظم قرآن ہے اور جس کا کینوس بہت بڑا اور بے حد پرکشش ہے۔[۴۷]

## حواشی ومراجع

۱۔ حمید الدین فراہی، اسالیب القرآن، دائرہ حمیدیہ، سرای میر، ۱۳۸۹ھ، ص ۸

۲۔ محمد الطاہر بن عاشور کا تعلق اندلس کے ایک خاندان سے تھا جو ہجرت کر کے مراکش آیا۔ اس خاندان میں متعدد مشہور زمانہ علماء پیدا ہوئے۔ ابن عاشور کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں تونس کے شمال میں مرسی نامی گاؤں میں ہوئی۔ جامع زیتونہ میں تعلیم کے مواقع ملے۔ افتاء اور قضاء سے متعلق ملک کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ ۱۹۴۰ء میں قاہرہ کے مجمع اللغوی کے ممبر بنائے گئے۔ شیخ الاسلام المالکی اور شیخ الجامع الاعظم کے خطابات سے نوازے گئے۔ تفسیر کے علاوہ ان کی اہم کتابوں میں **مقاصد الشریعة الاسلامیة، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، حاشیة التوضیح**

والتصحیح لمشکلات التنقیح علی شرح تنقیح الفصول فی الاصول، الیس الصبح بقریب، اصول الانشاء والخطابة، موجز البلاغة شامل ہیں۔ ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد تیس سے متجاوز ہے۔ جن میں مختلف کتابوں کی شروح ان کی تحقیق اوران پر تعلیق بھی شامل ہے۔ سن وفات ۱۹۷۳ء ہے۔ علامہ محمد غزالی ان کے بارے میں کہتے تھے: ''رجل القرآن الکریم وامام الثقافة الاسلامیة المعاصرة''۔ محمد عبدہ نے انھیں ''سیقر الدعوة الاصلاحیة فی الجامعة الزیتونة کا خطاب دیا تھا۔ ملاحظہ ہو ''نظریة المقاصد عند الامام محمد الطاهر بن عاشور'' اسماعیل حسنی، ص ۷۵-۹۷۔

۳۔ التحریر والتنویر، الدار التونسیة، ۱۹۸۴، جلد۱، ص۸

۴۔ راقم کی رسائی ۱۹۸۴ کے ایڈیشن تک ہوسکی، غالباً پہلا ایڈیشن یہی ہے۔

۵۔ المعهد العالمی للفکر الاسلامی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ حوالہ سابق جلد۱، ص۷۶-۸۱

۷۔ حوالہ سابق جلد۱، ص۷

۸۔ حوالہ سابق جلد۱، ص۸

۹۔ حوالہ سابق جلد۲۹، ص۱۹-۲۰

۱۰۔ حوالہ سابق جلد۲۹، ص۱۱۴

۱۱۔ حوالہ سابق جلد۱۶، ص۱۶۶

۱۲۔ حوالہ سابق جلد۱۶، ص۳۲۲

۱۳۔ حوالہ سابق جلد۱۵، ص۶۵

۱۴۔ حوالہ سابق جلد۱۵، ص۸۷

۱۵۔ حوالہ سابق جلد۱، ص۳۲۱

۱۶۔ حوالہ سابق جلد۲۹، ص۳۳۸

۱۷۔ حوالہ سابق جلد۲۹، ص۲۷۵

۱۸۔ حوالہ سابق جلد۲۹،ص۱۴۶

۱۹۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۳۰۹

۲۰۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۱۹

۲۱۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۱۹

۲۲۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۲۳

۲۳۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۹۹

۲۴۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۲۵

۲۵۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۲۵

۲۶۔ حوالہ سابق جلد۱،ص۱۲۵

۲۷۔ حوالہ سابق جلد۲۹،ص۱۶۷

۲۸۔ حوالہ سابق جلد۱۶،ص۱۹۸

۲۹۔ القرآن لا یحتمل الا تاویلا واحدا، ملاحظہ کیجیے حمید الدین فراہی، التکمیل فی اصول التاویل، دائرہ حمیدیہ، سرای میر، ۱۳۸۸، ص۲۰

۳۰۔ التحریر والتنویر ج ۱،ص۹۴

۳۱۔ التحریر والتنویر ج ۱،ص۱۰۰

۳۲۔ التحریر والتنویر ج ۱،ص۱۲۱، وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ فبعض تلک الاحتمالات مما یمکن اجتماعه وبعضها وان کان فرض واحد منه یمنع من فرض آخر فتحریک الاذهان الیه وإحظاره بها یکفی فی حصول المقصد من التذکیر به۔

۳۳۔ التحریر والتنویر، ج ۱۶،ص۶۹

۳۴۔ التحریر والتنویر، ج۲۹،ص۱۰۶

۳۵۔ التحریر والتنویر، ج۳۰،ص۳۷۵

۳۶۔ التحریر والتنویر، ج۲۸،ص۳۵۶

۳۷۔ التحریر والتنویر، ج ۱۷، ص۱۴۸

۳۸۔ التحریر والتنویر، ج ۲۵، ص۲۸۹-۲۹۰

۳۹۔ التحریر والتنویر، ج۲۹، ص۲۲۵

۴۰۔ التحریر والتنویر، ج۱۷، ص۳۰۰

۴۱۔ التحریر والتنویر، ج ۱۶، ص۱۴۹

۴۲۔ التحریر والتنویر، ج ۱۶، ص۳۰۵

۴۳۔ التحریر والتنویر، ج ۱۷، ص۳۰۵-۳۰۶ (حاصل کلام)

۴۴۔ حوالہ سابق

۴۵۔ التحریر والتنویر، ج۱، ص۸

۴۶۔ التحریر والتنویر، ج۳۰، ص۳۷۵

۴۷۔ اس انطباق کی ایک اچھی مثال کے لیے ملاحظہ ہو محمد عنایت اللہ سبحانی، امعان النظر فی نظام الآی و السور، موسسة نظام القرآن، بلریا گنج، ۲۰۰۰ء، الفصل السادس، ص۱۷۷۔ مصنف نے سورہ قمر پر اس کا انطباق کیا ہے۔

☆

# چند اردو قرآنی لغات - ایک جائزہ
## (بیسویں صدی کے حوالہ سے)

جمشید احمد ندوی

قرآن مجید کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال سے اس کے متعدد پہلوؤں پر مختلف زبانوں میں مسلسل تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری وساری ہے لیکن قرآن کا چشمۂ علوم ہے کہ ابلتا ہی جارہا ہے اوراس کے نت نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔

اردو زبان کا دامن بھی قرآنیات کے مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتب سے بھرا ہوا ہے بلکہ ایک اندازہ کے مطابق عربی زبان کے بعد قرآنیات پر سب سے زیادہ کام اسی زبان میں ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اس اندازہ میں کسی قدر مبالغہ شامل ہو لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآنیات کے حوالے سے اردو زبان کو چند ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو ضرور رکھا جاسکتا ہے جن میں اس موضوع پر وسیع لٹریچر وجود میں آیا ہے۔

قرآن مجید کتاب رشد وہدایت ہے لہذا اسے سمجھ کر پڑھنے کی بڑی اہمیت ہے تاکہ اس کے موضوعات سے واقف ہو کر دین ودنیا کو سنوارا جاسکے۔ یہی وہ خیال وفکر تھا جس نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو فارسی میں اوران کے صاحب زادوں کو اردو میں ترجمۂ قرآن پر ابھارا تھا۔ یہ خیال وفکر بیسویں صدی میں بہت زیادہ ابھر کر سامنے آیا لہٰذا قرآن فہمی کی راہ ہموار کرنے کے لیے گوناگوں کوششوں کا آغاز ہوا جن میں ایک کوشش یہ بھی تھی کہ قرآنی لغات پر مشتمل کتب تیار کی جائیں تاکہ قرآن کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے میں آسانی ہوسکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے جب متعدد تراجم اردو زبان

میں کیے جاچکے تھے جس سے بڑی حد تک یہ مقصد حاصل بھی ہوجاتا ہے تو ان تراجم کی موجودگی میں قرآنی لغات پر مشتمل مستقل کتب کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی قرآن سے دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس کے ہر پہلو کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں ورنہ قرآنی تراجم کی موجودگی میں قرآنی لغات پر مشتمل کتب کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قرآنی تراجم سے آیت کے معانی و مفاہیم تو سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن کسی مفرد/مرکب لفظ کے معنی و مفہوم کو پوری طرح سمجھنے میں پھر بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ غالباً اسی دشواری کے پیش نظر لغات پر قلم اٹھانے والوں نے اس ضرورت کی تکمیل کی طرف توجہ دی۔

اردو زبان میں قرآنی لغات مرتب کرنے کا سہرہ بھی شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کے وقت لغات القرآن پر ایک مختصر کتاب بھی مرتب کی تھی جس میں الفاظ کے معانی اور مختصر تشریحات درج کی گئی تھیں۔ منشی ممتاز علی میرٹھی نے ۱۲۹۸ھ میں مطبع مجتبائی، دہلی سے شائع ہونے والے ترجمہ کے حاشیہ پر یہ کتاب بھی چھاپ دی تھی[1] یہ نسخہ ہمیں سردست دستیاب نہیں ہوسکا کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکے اور نہ ہی ہمارے مقالہ کے دائرہ میں شامل ہے کہ یہ بیسویں صدی سے قبل کی تصنیف ہے۔

شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے بعد جناب محمد خلیل صاحب نے ۳۱۰ صفحات پر مشتمل ''لغات القرآن'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ کتاب بھی ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے کہ مطبع خادم التعلیم پنجاب، لاہور سے ۱۸۹۸ء/۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی تھی۔ محض تسلسل زمانی کے لیے اس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی وقیع لائبریری میں موجود ہے۔

**عجائب البیان فی لغات القرآن**، حاجی محمد بن عبداللہ، مطبع نامی لکھنؤ، ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، صفحات ۴۰۰۔

ہمیں دستیاب ہونے والی کتب لغات قرآن میں زمانی لحاظ سے فوقیت

ابوالفضل حاجی محمد بن عبداللہ کی ''عجائب البیان فی لغات القرآن مع تفسیر المنان ونجوم الفرقان'' کو حاصل ہے۔ یہ کتاب مطبع نامی، لکھنؤ سے رمضان ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی بنیادی وجہ تالیف اردو زبان میں قرآنی لغت کا موجود نہ ہونا بتایا گیا ہے: ''قرآن مجید کی تفاسیر تو مختلف زبانوں میں بکثرت ہیں لیکن اردو زبان میں کوئی کامل وکافی لغت قرآن نہیں ہے جس کا ہر شخص محتاج ہے''۔۲

کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے: ''......لغات سے مراد لغت قرآن ہے اور تفسیر المنان سے مراد جو شرح وبسط سے تفسیر کی گئی ہے اور نجوم القرآن سے ہندسوں کے ذریعہ معرفت رکوع وپارہ مراد ہے''۔۳

مرتب نے اپنے مقدمہ میں کتاب کے نام کا آخری جزء ''نجوم القرآن'' (دو جگہ) ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے کہ ٹائٹل پر نجوم القرآن کے بجائے ''نجوم الفرقان'' لکھا ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سجع کے اعتبار سے بھی قرآن کا لفظ دو بار استعمال کرنا زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

مصادر اور طریقۂ کار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جہاں کہیں شرعی مسئلہ آیا اس کو کتب تفسیر وحدیث سے اور جہاں کہیں لغت کے متعلق پایا اس کو کتب لغت سے مثل تاج العروس ومفردات راغب اصفہانی ونہایہ ابن کثیر وغیرہ وغیرہ سے لکھا، جہاں کہیں تاریخی واقعہ آیا اس کو کتب تاریخ سے لکھا۔ بہرصورت کوئی لفظ قرآن کریم کا معنیً وتفصیلاً ایسا نہیں چھوڑا کہ آئندہ نسلوں کو طعن وتشنیع کا موقع باقی رہے''۔۴

مرتب نے اس کتاب میں صرف الفاظ قرآنی کے معانی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دیگر متعلقہ امور پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً اسماء حسنی، اسماء انبیاء، تحقیقات جنت و دوزخ وغیرہ کے بارے میں شرح وبسط سے لکھا ہے۔

یہ لغت مادہ کے بجائے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کے بعد یہ بتایا جائے کہ وہ کس پارہ کے کس رکوع یا کن پارہ کے کن کن رکوع میں موجود ہے۔

مرتب نے عام طور سے الفاظ کے معانی مع واحد جمع بیان کیے ہیں، کہیں کہیں کسی قدر تشریح وتوضیح بھی کی گئی ہے مثلاً فصل الالف مع الہمزۃ کے تحت ''ائت بقرآن غیر ھذا '' کے تحت لکھتے ہیں ''صیغہ امر حاضر، خطاب آنحضرت ﷺ کی طرف، بمعنی لا تو ای محمد اس کے سوا دوسرا قرآن، اصل اس کی یوں ہے جب آنحضرت ﷺ کافروں پر قرآن پڑھتے ان کو یہ ثابت ہوتا کہ یہ تو کلامِ الٰہی ہے مگر اس میں بت پرستی کی مذمت ہے اور شرک ومشرکین کی برائیاں ہیں تو حضرت (ﷺ) سے کہتے اس کو بدل دیجیے۔ آپ ﷺ فرماتے مجھ کو بدلنے یا دوسرا لانے کا حق نہیں ہے''۔۵

''ائت ''اصل میں ''فائت بھا.. الخ '' قائل اس کے حضرت ابراہیمؑ ہیں خطاب نمرود یا ضحاک کی طرف ہے، لاتو آفتاب کو مغرب سے۔۶

کتاب کے آخر میں ایک نوٹ لگا ہوا ہے جس میں لفظ ''امّی'' کے باب الالف مع المیم میں چھوٹ جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس کے معانی بیان کیے گئے ہیں۔

## مکمل لغات القرآن، محمد عبد الرشید نعمانی، ندوۃ المصنفین ۱۹۴۴ء ومابعد

زمانی لحاظ سے مولانا محمد عبد الرشید نعمانی کی کتاب ''مکمل لغات القرآن'' کو دوسرا مقام حاصل ہے۔اس کی اولین جلد غالباً ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

ندوۃ المصنفین، دہلی سے شائع ہونے والی چھ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب اردو زبان میں اب تک (ہماری معلومات کی حد تک) اس موضوع پر سب سے طویل کتاب ہے جسے اس کے مرتب نے اردو میں اپنی نوعیت اور اپنے انداز کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔۷

مولانا محمد عبد الرشید نعمانی کا ارادہ اسے صرف چار جلدوں میں شائع کرنے کا تھا۸ لیکن غالباً چار جلدوں میں کام مکمل نہ ہوسکا تھا لہٰذا مولانا سید عبد الدائم جلالی نے مزید دو جلدیں لکھ کر اس کی تکمیل کی۔

کتاب کی ورق گردانی سے یہ مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے کہ آخری دو

جلدیں مولانا عبدالرشید نعمانی نے کیوں نہیں لکھیں، کیا اس دوران ان کا انتقال ہوگیا تھا یا انھوں نے ندوۃ المصنفین کو خیرآباد کہہ دیا تھا لہٰذا ذمہ داران ادارہ نے اس کی تکمیل جلالی صاحب سے کرائی۔ جلالی صاحب نے بھی پانچویں جلد کی ابتداء میں کوئی مقدمہ نہیں لکھا ہے جس سے یہ عقدہ حل ہوسکتا۔

مذکورہ بالا کتاب کی ہر جلد کے سنہ اشاعت واوراق کی تفصیل حسب ذیل ہے:

جلد اول: ۱۹۴۹ء بار دوم صفحات ۳۲۱۔ اس کی اولیں اشاعت کا نسخہ دستیاب نہ ہوسکا جس سے اس کا حتمی سنہ اشاعت بیان کیا جاسکتا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ اشاعت ۱۹۴۴ کے آس پاس ہوئی ہوگی کیوں کہ جلد دوم کے شروع میں لکھا ہے: سلسلۂ مطبوعات ۱۹۴۴ء، طباعت ۱۹۴۵، بار اول، جب کہ جلد اول کے مقدمہ کے آخر میں ۲۲؍شعبان، ۱۳۶۲ھ/ ۲۵؍اگست ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے ڈاکٹر محمد میاں صدیقی نے اس کی اولین جلد کی پہلی اشاعت ۱۹۴۳ میں بتایا ہے۔ ۹

| | |
|---|---|
| جلد دوم: | ستمبر ۱۹۴۵، صفحات ۳۲۹۔ |
| جلد سوم: | اپریل ۱۹۴۸ء، صفحات ۳۲۹۔ |
| جلد چہارم: | ستمبر ۱۹۵۳، صفحات ۳۸۲۔ ۱۰ |
| جلد پنجم: | ۱۹۵۷ء، صفحات ۴۴۹ |
| جلد ششم: | جنوری ۱۹۵۸ء، صفحات ۳۲۳ |

اس طرح اس کتاب کی طباعت کا وقفہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۸ء (سولہ سال) قرار پاتا ہے اور صفحات کی مجموعی تعداد ۲۱۸۴ تک پہنچ جاتی ہے۔

وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالرشید نعمانی لکھتے ہیں: ''ہماری زبان میں بھی لغاتِ قرآن پر متعدد کتابیں موجود ہیں جو عام طور سے دستیاب ہوتی ہیں لیکن ضرورت اس کی تھی کہ اس موضوع پر ایک ایسی جامع مکمل اور مستند کتاب تحقیق کی روشنی میں لکھی جائے جو قرآن مجید کے معانی اور مطالب سمجھنے اور حل کرنے میں ہر حیثیت سے مدد دے سکے۔ معلوم ہے کہ اس قسم کی علمی اور تحقیقی تصنیف سے اس وقت تک اردو زبان کا

دامن یکسر خالی ہے۔ پیش نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے"۔[11]

مرتب نے تفصیل سے اپنے منہج وطریقہ تالیف کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

☆ اتمام فائدہ کے لیے لغات قرآن کے ساتھ ساتھ الفاظ قرآن کی فہرست بھی تیار کی گئی ہے لہٰذا ہر کلمہ اور ہر لفظ کو علیٰحدہ علیٰحدہ لکھا گیا ہے۔ اس فہرست میں مرکب الفاظ بھی شامل ہیں کہ اگر مشتقات ومرکبات کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا تو اس سے صرف عربی جاننے والے ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

☆ حروف معجم کے اعتبار سے کتاب کو مرتب کیا گیا ہے اور ترتیب ظاہر الفاظ کی صورت ہی پر رکھی گئی ہے۔ مأخذ اشتقاق کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اس کا دریافت کرنا عوام کی دسترس سے باہر تھا۔

☆ "اول حرف باب ہے اور ثانی حرف فصل، پہلے لفظ لکھا گیا ہے پھر اس کا سلیس ترجمہ، اب اگر وہ لفظ حرف ہے تو اس کے معانی مع امثلہ بیان کیے گئے ہیں اور اگر فعل ہے تو اس کا باب اور صیغہ، پھر مزید فیہ میں تو باب ہی کو ذکر کیا گیا ہے اور مجرد میں اس کے مادہ واشتقاق کا بھی۔ مزید فائدے کے لیے باب اور مادۂ اشتقاق کا ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اب اگر ایک باب کے چند مشتقات ایک ہی فصل میں مذکور ہیں تو باب اور مادہ اشتقاق کا ترجمہ اختصار کے خیال سے نہیں دہرایا گیا ہے بلکہ پہلے ہی لفظ کے ذیل میں جو ترجمہ لکھا گیا ہے اسی کو کافی سمجھا گیا ہے اور مجرد میں باب کا تعین بھی پہلے ہی لفظ کے ساتھ کر دیا گیا ہے...... اور اگر وہ لفظ اسم ہے تو مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد بھی بتایا گیا ہے لیکن اگر قرآن مجید میں مفرد اور جمع دونوں مذکور ہیں تو پھر ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے موقع پر کیا گیا ہے۔ الفاظ مرکبہ میں ضمائر کا تعین کیا گیا ہے۔ ترکیب اضافی اور ترکیب توصیفی بھی بیان کی گئی ہے۔ جہاں مناسب سمجھا تعلیل صرفی کی بھی تفصیل کر دی گئی ہے"۔

☆ تمام الفاظ کی ضروری تشریح اور تفصیل کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر کسی لفظ کی تشریح یا معنی میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے تو اسے بیان کر کے قول فیصل کا ذکر کیا

گیا ہے۔

☆ فہم قرآن میں سہولت کی خاطر جا بجا مناسب فوائد قلم بند کیے گئے ہیں۔

☆ لفظ کے وہی معنی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس معنی میں قرآن نے اسے استعمال کیا ہے۔

☆ اگر کوئی لفظ قرآن میں متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے تو وہ معانی بالتفصیل لکھے گئے ہیں اور اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ لفظ کہاں کس معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ جس لفظ کی تفسیر میں مرفوع احادیث، اقوال صحابہ وتابعین مل گئے انھیں بھی نقل کردیا گیا ہے۔

☆ قرآن میں مذکور شخصیات کا ذکر صحیح احادیث ومستند روایات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

☆ مختصر طور پر جا بجا تحقیقی انداز میں قصص قرآنی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

☆ اماکن قرآن کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

☆ عام طور سے امام راغب اصفہانی کی کتاب مفردات القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے تاہم اس کے علاوہ تفسیر، حدیث، لغت اور جغرافیہ کی اہم اور مستند کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ لکھا جائے پوری تحقیق سے لکھا جائے۔

☆ الفاظ قرآن کی فہرست اس اعتبار سے مرتب کی گئی ہے کہ علامت پارہ کے لیے (پ) کا نشان لکھا گیا ہے۔ (پ) کے اوپر مذکور نمبر سے پارہ نمبر کی وضاحت کی گئی ہے جب کہ (پ) کے نیچے موجود نمبر سے مراد اس پارہ کا رکوع نمبر ہے۔

اس ضمن میں مرتب نے ایک اختراع کی ہے کہ ''اگر پارہ کے ختم پر رکوع بھی ختم ہوجاتا ہے تو خیر ورنہ جتنی آیتیں اس کے اخیر میں مذکور ہیں ان کو ایک مستقل علیحدہ رکوع قرار دے کر اس کا نمبر شمار لکھ دیا ہے۔ مثلاً پہلے پارہ کے سولہ رکوع ہیں اور سولہویں ہی رکوع پر وہ ختم بھی ہوجاتا ہے۔ دوسرے پارہ کے بھی سولہ ہی رکوع ہیں مگر وہ سولہویں رکوع پر ختم نہیں ہوتا بلکہ چند آیات کے بعد ختم ہوتا ہے تو ہم نے ان آیتوں کو فہرست کی ترتیب

کے لیے ایک جدا رکوع قرار دیا ہے، اس لیے جو لفظ ان آیتوں میں مذکور ہوگا اس کے حوالہ کے لیے درج ہوگا ۲/۱۷ یعنی وہ دوسرے پارہ کے سترہویں رکوع میں ہے''۔[۱۲]

مصنف نے یہ طریقہ کار اگر چہ سہولت کی خاطر اختیار کیا ہے لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ اس سے عام قاری کو پارہ کے رکوع کی تعداد میں التباس وشک پیدا ہوگا چناں چہ وہ جب قرآن پڑھے گا تو کتاب میں مذکور تعداد رکوع اور قرآن مجید میں موجود رکوع کی تعداد میں فرق پائے گا تو وہ خلجان میں مبتلا ہوگا کہ کس کو صحیح مانا جائے۔

لغات قرآنی کے سرمایہ میں یہ کتاب سب سے مفصل اور وقیع ہے۔ اس لیے مرتب کا یہ دعویٰ ''ایک مدرس اس کتاب کو ہاتھ میں لے کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے۔ ایک طالب علم اس کے ذریعہ استاد کے دیے ہوئے قرآنی سبق کو اچھی طرح یاد کر سکتا ہے اور ایک عام آدمی اس کے مطالعہ سے اپنی فہم کے مطابق قرآن کو بخوبی سمجھ سکتا ہے'' کچھ بیجا نہیں ہے۔[۱۳]

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اس کی طوالت کو بین السطور تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بیان کی ہے جس میں اختصار وجامعیت کے ساتھ سادہ وشیریں الفاظ میں ہر ضروری بات بیان کردی جائے۔[۱۴]

اس تنقید کے بالمقابل عزیز زبیدی نے اسے لغات قرآنی پر مشتمل سرمایہ میں سب سے اہم اور بہتر کتاب قرار دیا ہے کہ ''اس میں رجال قرآن، قصص قرآن، اور فن قرآن پر بھی بتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے اور الفاظ بھی حروف تہجی کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح ہر لفظ کے اخیر میں ان مقامات کی ایک فہرست بھی دے دی ہے جہاں جہاں قرآن میں وہ لفظ مستعمل ہوا ہے''۔[۱۵]

**آسان لغات القرآن**، مولانا عبدالکریم پاریکھ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۶ء، صفحات ۲۹۲۔

جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب کی کتاب آسان لغات القرآن کو زمانی لحاظ سے

تیسرا مقام حاصل ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں اسے سب سے زیادہ شہرت اور قبول عام حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں چھپنے والی اس کتاب کا اٹھارواں ایڈیشن ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا اور جدید ترین ایڈیشن ۱۹۹۷ء میں فرید بک ڈپو، دہلی نے چھاپا ہے لیکن اس پر ایڈیشن کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اسی طرح ۱۹۹۶ میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے بھی اس کا ایڈیشن چھاپا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان سے بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اردو کے علاوہ یہ کتاب ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ سر دست ہمارے سامنے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا نسخہ ہے جو غالباً کتاب کے اٹھارہویں ایڈیشن کا عکس ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے اس کتاب پر مختصر سا پیش لفظ لکھا ہے جس میں کتاب کی خوبیوں کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے: ''انھوں نے مستند تراجم کو سامنے رکھ کر ہر پارے کے مشکل الفاظ کا ترجمہ موقع محل کے لحاظ سے کر دیا ہے۔ افعال کے سامنے ان کے حروف اصلی بھی لکھ دیے ہیں اور انگریزی داں طبقہ کی سہولت کے لیے کہیں کہیں الفاظ کے انگریزی معانی بھی دے دیے ہیں اور کتاب کے شروع میں مختصر طور پر نحوی قواعد بقدر ضرورت آ گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب قرآن مجید کی کلید اور ''گائیڈ بک'' بن گئی ہے۔[۱۶]

ناشر نے اسے نظریاتی کتاب کی بجائے عملی کتاب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس کے مطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ ترجمے والا قرآن شریف پڑھتے جایئے انشاء اللہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں آپ خود بخود ترجمہ کرنے لگ جائیں گے اور تو سچ یہ ہے کہ اسی وقت آپ کو اس چھوٹی سی کتاب کی اہمیت واضح ہوگی۔[۱۷]

مرتب نے اس ایڈیشن پر ''نقش اول تا ثانی'' کے عنوان سے مقدمہ لکھا ہے جس میں اس کتاب کی افادیت وضرورت کو واضح کیا ہے اور مختلف ایڈیشن میں ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں معروف ومتداول الفاظ کو شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن دوسرے ایڈیشن میں علماء کے مشورہ سے انھیں بعد میں شامل کر دیا گیا اور تیسرے ایڈیشن (۱۹۶۰ء) کی ابتداء میں ''عربی کے نوسبق'' کے عنوان سے بنیادی عربی گرامر کو

کتاب میں شامل کر دیا گیا تا کہ استفادہ زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

مرتب نے کتاب میں حسب ذیل امور کا خیال رکھا ہے:

☆ بعض الفاظ کے معانی ان کے موقع محل کے اعتبار سے لکھے گئے ہیں لہٰذا اسے ایک الفاظ کی تکرار نہ سمجھا جائے۔ ۱۸

☆ کسی لفظ کا آزاد ترجمہ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ کسی نہ کسی عالم ربانی کے ترجمہ وتفسیر میں سادہ اور قرآن کے مزاج سے قریب، عمدہ، اچھے اور مناسب معنی کا انتخاب کیا گیا ہے بلکہ اس میں قریب قریب ہر معروف لغت کا نچوڑ سامنے رکھتے ہوئے علماء کرام کے تراجم تفاسیر اور لغات میں سے ایک سنگم یا حسین امتزاج کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ۱۹

☆ نئے ایڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے ہر لفظ کا سلسلہ وار نمبر دیا گیا ہے۔ کسی نمبر کا لفظ بار بار آیا ہو تو اس میں دو مقصد سامنے رکھے گئے ہیں ایک تو ذو معنی ہونے پر الگ الگ لکھنا ضروری تھا۔ دوسرے بار بار کی تکرار سے یاد دہانی خوب اچھی طرح ہو گی۔ ۲۰

☆ بیسویں پارے تک ہر رکوع کے خاتمے پر 'ع' کا نشان لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد صرف پاؤ، آدھے اور پون کے نشان لگائے گئے ہیں۔ ۲۱

☆ سورتوں کے نمبر بھی ترتیب وار دیے گئے ہیں۔ ۲۲

☆ اس کتاب کے اردو ایڈیشن میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی تفسیر اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے لفظی ترجمہ کو اور انگریزی ایڈیشن میں پکتھال اور عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ۲۳

مرتب نے مقدمہ میں تفصیل سے مصادر کا ذکر کیا ہے جس میں قرآن مجید کی اہم تفاسیر وتراجم اور صحاح ستہ کے علاوہ لغات کی مختلف کتب بھی شامل ہیں۔ بعد کے ایڈیشن میں (غالباً تیسرے ایڈیشن سے) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی قاموس القرآن سے بھی استفادہ کرنے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۲۴

☆ مصادر کے ضمن میں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ مرتب کے پیش نظر جلالین

اور انگریزی تراجم کو چھوڑ کر صرف ہندوستانی علماء کی تفاسیر و تراجم ہی رہے ہیں۔

یہ کتاب اپنے حسن ترتیب کی وجہ سے کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اس میں کل ۶۶۷۸ الفاظ کے معانی ۲۹۲ صفحات میں نقل کیے گئے ہیں۔ دیگر کتب لغات قرآنی کے مقابلہ میں اس کتاب میں یہ جدت بھی پائی جاتی ہے کہ اسے حروف تہجی یا مادہ کے بجائے قرآنی سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور سورتوں میں جس ترتیب سے الفاظ آئے ہیں اسی ترتیب سے الفاظ کے معانی لکھے گئے ہیں تا کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ ترجمہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

**قاموس القرآن**، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، یونین پریس ، دہلی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء، طبع اول۔ صفحات ۷+ ۹۸۷۔

لغات قرآنی کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں اس کتاب کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں اختصار کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مولانا میرٹھی کی لغات پر گرفت اور پکڑ کا یہ منھ بولتا ثبوت ہے۔ غالبًا مولانا نے اسے عبد الرشید نعمانی صاحب کی کتاب دیکھنے کے بعد مرتب کیا تھا کیوں کہ مقدمۂ کتاب میں انھوں نے وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شاہ صاحب کے اس بنیادی کام پر بعض دوسرے اہل علم نے اضافے کیے اور کئی کتابیں طبع ہو کر بازار میں آئیں مگر الفاظ قرآنی کی صرفی و نحوی تشریح سے ان کا قلم آگے نہ بڑھ سکا اور اردو زبان و ادب میں ہر جہتی ترقی کے باوجود خدمت قرآن کریم کے سلسلہ میں یہ خلا باقی رہا۔

سالہائے گزشتہ میں ہندوستان کے ایک علمی ادارہ نے اپنے وسیع وسائل کے مطابق ایک مکمل لغات القرآن کا کام شروع کیا مگر دس سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی یہ کام نصف منزل کو پہنچا ہے...... اس سلسلہ میں کام کا جو نقشہ میرے صفحۂ دماغ پر ابھرا تھا وہ اس سے اپنے خدو خال میں ممتاز تھا۔ دنیوی مشاغل کی کثرت اور دین سے عام بے پروائی کے اس دور میں ایک ایسی ''لغات القرآن'' کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جس میں مہماتِ قرآن کریم کی تشریحات، تھکا دینے والے طویل اور خشک مضامین کی صورت میں نہ ہوں

بلکہ اختصار وجامعیت کے ساتھ سادہ وشیریں زبان میں ضرورت کی ہر چیز بیان کردی جائے۔ کام کا یہ میدان یکسر خالی تھا مگر اس میدان میں اترنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی......۔

آخر تامل وتفکر کے بعد یہ طے کیا کہ اپنی طرف سے کچھ نہ لکھا جائے جو کچھ لکھا جائے وہی لکھا جائے جو مستند مفسرین کرام نے لکھ دیا ہے اور کتب تفسیر وحدیث اور لغت کے گلشن صد بہار میں سے اپنے ذوق نظر ودماغ کے مطابق گلہائے رنگ کو چن کر حسن ترتیب کے دھاگہ سے ایک گلدستہ کی صورت میں باندھ دیا جائے''۔[۲۵]

ضرورت تالیف کے بعد تفصیل سے طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے:

☆ تمام الفاظ قرآنی کا استیعاب کیا گیا ہے اور انھیں اپنی اصل صورت میں لغت قرار دے کر حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

☆ قرآن میں موجود لفظ کے مرادی معنی کو سادہ وسہل الفاظ میں لکھتے ہوئے الفاظ کی صرفی ونحوی تشریح کی گئی ہے۔

☆ لفظ کے اسم ہونے کی صورت میں اس کی جمع / واحد بھی بیان کی گئی ہے۔

☆ جملہ اہم الفاظ پر سادہ وشیریں زبان میں جامع تشریحی نوٹ لکھے گئے ہیں۔ ان کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم بعض مقامات مثلاً انبیاء کرام کے بیان میں یہ نوٹ کئی صفحات پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی مخصوص اصطلاحات اور دین متین کے اصول و بینات کی تشریح میں بھی مناسب حد تک تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

بعض نوٹ شبیر احمد ازہر (رفیق دائرۃ المصنفین) نے لکھے ہیں جنھیں ''ش'' کے ذریعہ ممتاز کر دیا گیا ہے۔

ابتدائے کتاب میں یہ نوٹ مختصر مختصر سے ہیں کہ ایک زیادہ مختصر ''لغات القرآن'' کی ترتیب پیش نظر تھی۔ لیکن بعد میں ''مباحث ومطالب کے گلہائے رنگارنگ کو سمیٹنے کے لیے دامان طلب کو کسی قدر دراز کر دیا گیا'' لہٰذا بعد کے صفحات میں نظر انداز کیے

گئے مباحث یا نامکمل مباحث کو مکمل کر دیا گیا۔

☆ سلف صالحین کے مسلک کو نظر میں رکھتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مستند مفسرین کے افادات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

☆ مصادر میں اولین مقام امام راغب کی مفردات فی غریب القرآن کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کشاف، تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیضاوی اور اس کا حاشیہ الاکلیل، تفسیر مظہری، تفسیر رازی، تفسیر ابن قیم، شیخ اسماعیل حقی کی روح البیان، علامہ رشید رضا اور محمد عبدہ کی تفسیر المنار سے استفادہ کے ساتھ ساتھ خانوادہ ولی اللہی کی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور شبیر احمد عثمانی کے افادات سے بھی کسب فیض کیا گیا ہے۔ خصوصاً موخر الذکر کی کتاب فوائد القرآن سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔[۲۶]

مولانا میرٹھی کی یہ لغت اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہے کہ متوسط ہونے کے باوجود اس میں تقریباً موضوع کے تمام مباحث سمیٹ لیے گئے ہیں۔ ترتیب میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں پائی جاتی ہے اور آسانی کے ساتھ کسی لفظ کے معنی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

**مرأۃ القرآن فی لغۃ القرآن**، عبدالحیٔ کیلانی، مکتبۂ اسلامیہ، حضرت کیلیانوالہ، گوجرانوالہ، غالباً ۱۳۷۴ھ، صفحات ۴۰+۴۱۵۔

قاموس الفاظ قرآنی کے میدان میں لکھی جانے والی یہ کتاب مادہ کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ وجہ اور طریقۂ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے مرتب نے لکھا ہے کہ "۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے کہ میرے بڑے بھائی جناب مولوی نور الٰہی صاحب مرحوم نے بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ لفظ "اُمۃ" قرآن مجید میں چار معنوں میں مستعمل ہوا ہے چناں چہ آپ نے قرآن مجید کی آیات پڑھ کر ان معانی کی طرف توجہ دلائی۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن مجید کے تمام الفاظ کی یہی کیفیت ہوگی۔ یہ خیال آہستہ آہستہ میرے دماغ پر کچھ اس طرح چھایا کہ قرآن مجید کے الفاظ کا تتبع کرنا شروع کیا...... مفردات امام راغب اور فتح

الرحمٰن کا مطالعہ شروع کیا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ان دونوں کتابوں کے مصنفین باوجود جلالت علمی کے قرآن مجید کے بہت سے الفاظ چھوڑ گئے ہیں۔ دل نے چاہا کہ اگر کوئی ایسی کتاب مل جائے کہ جس میں تمام آیتوں کے حوالہ جات، لغوی معانی، ابواب کے تصرفات یکجا مل جائیں تو اسی کا مطالعہ کروں لیکن افسوس میری آرزو پوری نہ ہوسکی۔ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ایسی کتاب خود تیار کروں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرمائے...... خود قرآن مجید سے بلا واسطہ مادوں کا استخراج کیا، بعد میں مفردات اور فتح الرحمٰن سے مقابلہ کیا تو کئی ایک الفاظ ان میں نہ تھے۔ پھر آیتوں کی جستجو ہوئی، سہولت تفہیم کے لیے ابواب کا بتلانا اور گردانوں کا جتلانا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ لغوی تشریح اور محاورات کا لانا بھی لابدی تھا۔ اس صورت میں کتاب کافی ضخیم ہو جاتی۔ مجبور ہو کر ابواب اور گردانوں کے نمبر دیے اور شروع میں ان کی فہرست دے دی"۔ ۲۷

دیباچۂ مرتب کے آخر میں ان الفاظ کی فہرست درج ہے جو مفردات القرآن اور فتح الرحمٰن از فیض اللہ میں نہیں ہیں۔

مصنف نے حسب ذیل نہج استعمال کیا ہے:

☆ لغوی تشریح میں چند اشارات دیے گئے ہیں مثلاً ج علامت جمع، جج جمع الجمع کی، فا فاعل کی، مفعہ مفعول کی اور مصہ مصدر کی علامت ہے۔ ۲۸

☆ مصادر میں شبیر احمد عثمانی کا اردو ترجمہ، تفسیر جلالین، منجد، صراح، منتہی الارب، قاموس، قصص القرآن از حفظ الرحمٰن سیوہاروی، تفسیر مولانا ابو الکلام آزاد، ارض القرآن مصنفہ علامہ شبلی ۲۹ تفسیر ابن کثیر و سیرت ابن ہشام شامل ہیں۔ ۳۰

☆ مادہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

☆ بسا اوقات بعض الفاظ کے اردو معانی کے ساتھ عربی معانی بھی بین قوسین نقل کیے گئے ہیں۔ ۳۱

☆ بالعموم ہر مادہ کے آخر میں اس کی مختلف مشتقات اور ان کے معانی نقل کیے گئے ہیں۔ ۳۲

☆ عام طور سے مختصر معانی بیان کیے گئے ہیں کہیں کہیں قدرے تفصیل ہے۔

☆ مفرد الفاظ کے علاوہ مرکب الفاظ/ ضمائر والے الفاظ کو بھی مفرد مان کر معانی نقل کیے گئے ہیں مثلاً **سمیع الدعا** (مجیب الدعاء) سننے والا ہے دعا، **انت السمیع العلیم** سننے والا (اس میں انت کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے)، **علی سمعھم** ان کے کانوں پر۔

☆ ہر حرف کے آگے اس کا عددی مقام بھی بیان کیا گیا ہے مثلاً س (۶۰)، غ (۱۰۰۰)

☆ ہر لفظ کے شروع و آخر میں نمبرات دیے گئے ہیں جن کا مقصد میں نہیں سمجھ سکا، غالباً وہ ابواب وگردانوں کے نمبر ہوں گے۔

☆ کتاب کے شروع میں پیش لفظ کے تحت آسمانی کتابوں کے نزول کی حکمت اور تحفظ قرآن مجید کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ پیش لفظ عزیز زبیدی نے لکھا ہے۔ پیش لفظ کے آخر میں مرآۃ القرآن کی خصوصیات اور مرتب کا مختصر تعارف بھی مذکور ہے۔

پیش لفظ کے بعد ''رسل اللہ'' کے عنوان سے انبیاء کرام اور ''اقوام القرآن'' کے عنوان سے قرآن میں مذکور قوموں کے حالات باعتبار حروف تہجی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں مباحث محمد سلیمان کیلانی نے لکھے ہیں۔

ارض القرآن کے عنوان سے قرآن میں مذکور مقامات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد ''بحث حروف عاملہ'' کے عنوان سے حروف عاملہ کی بحث مذکور ہے۔ اس کے بعد ''بحث حروف مقطعات'' ہے۔ اس بحث کی ابتداء میں ۲۹ سورتوں میں مذکور حروف مقطعات کو یک حرفی تا پنج حرفی میں تقسیم کرتے ہوئے ان کی فہرست دی گئی ہے۔ پھر نفس موضوع پر بحث کی گئی۔ یہ تمام مباحث بھی محمد سلیمان کیلانی نے لکھے ہیں جیسا کہ مرتب نے اپنے پیش لفظ میں اس کی وضاحت کی ہے تاہم ان مباحث کے آخر میں کسی کا نام درج نہیں ہے۔

اصل کتاب شروع ہونے سے پہلے سورتوں کو باعتبار حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے اور ان کے آگے ان کا سورہ نمبر بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ جب کہ کتاب کے آخر میں ان الفاظ کی فہرست ہے جو سہواً نقل ہونے سے رہ گئے تھے۔

غالباً اس کتاب کا ٹائٹل پہلے چھپ چکا تھا کہ اس پر سنہ اشاعت ۱۳۷۲ھ اور ناشر کا نام مکتبۂ اسلامیہ درج ہے جب کہ اندر سنہ اشاعت کا ذکر نہیں ہے اور ناشر کا نام مکتبۂ اسلام کشمیری بازار لاہور درج ہے۔ ظن غالب ہے کہ یہ کتاب ۱۳۷۴ھ کے اواخر یا ۱۳۷۵ھ کے اوائل میں چھپی ہوگی کیوں کہ مرتب کے پیش لفظ پر ۶رذی الحجہ ۱۳۷۴ھ کی تاریخ درج ہے۔

**انوار القرآن**، عبدالرحمٰن حنفی نقشبندی مجددی، ادارۂ اشاعت قرآن وحدیث، جامع مسجد کوٹ فتح دین خان قصور، لاہور، ۱۹۵۶ء۔

دو جلدوں پر مشتمل اس کے مجموعی صفحات ۵۹۹ ہیں۔ کسی وجہ سے اس کی دوسری جلد (سورہ کہف تا والناس) ۱۹۵۶ء میں پہلے چھپ گئی تھی، جب کہ پہلی جلد (سورہ فاتحہ تا بنی اسرائیل) اگست ۱۹۵۷ء میں چھپی۔

یہ کتاب مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کی کتاب ''آسان لغات القرآن'' کے طرز پر مرتب کی گئی ہے، بس دونوں میں فرق یہ ہے کہ اولین کتاب اختصار کا نمونہ ہے تو دوسری کتاب قدرے تفصیلی ہے۔

مرتب نے اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس کی خصوصی خوبی یہ ہے کہ قرآن مجید کا جو کلمہ یا جو جملہ لفظی تشریح یا معنوی توضیح کے لیے اس میں نقل کیا گیا ہے وہ جس مقام اور جس محل پر ازل سے نصب ہو چکا ہے وہیں قائم رکھا گیا ہے۔ اپنی جعلی ترکیب کی خاطر اس کو اس کے ماقبل اور مابعد سے جدا نہیں کیا گیا۔ قرآن مجید تلاوت کرنے والا بوقت تلاوت اس کو اپنی ایک جانب رکھ لے، علی الترتیب مشکل کلمات اور مجمل جملات کی تشریح وتوضیح پیش نظر آتی جائے گی۔ یہ بات اردو تراجم یا اردو تفاسیر میں بلکہ اکثر عربی تفاسیر میں بھی نہیں ملے گی''۔[۳۳]

کتاب کے مصادر میں قاموس، مفردات راغب، صراح، المنجد، غیاث اللغات جیسی لغات اور تفاسیر میں سے روح المعانی، بیضاوی، تفسیر کبیر، تفسیر ابن کثیر، جامع البیان، جلالین، خازن، مدارک شامل ہیں۔[۳۴]

مصنف نے اپنے مختصر سے تعارف کتاب میں اپنے طریقۂ کار کی مکمل وضاحت نہیں کی ہے۔تاہم کتاب کی ورق گردانی سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں:

☆ مصنف نے اس کتاب کو بترتیب سور مرتب کیا ہے۔

☆ الفاظ کے معانی بیان کرنے سے قبل سورہ کا نام، اس کے مکی / مدنی ہونے کی وضاحت اور رکوع و آیات کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔

☆ تمام الفاظ قرآنی کے معانی نقل کرنے کے بجائے صرف انہیں الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، جن کی ضرورت سمجھی گئی ہے، خواہ وہ لفظ مفرد ہو یا مرکب جیسے **الدین**، **الصراط**، **المستقیم** (مفرد الفاظ) اور **ایاک نعبد**، **انعمت علیهم**، **للمتقین**، **علّم آدم الاسماء** (مرکب الفاظ)۔

☆ وہ لفظ جو بار بار استعمال ہوئے ہیں انھیں موقع محل کے اعتبار سے مکرر نقل کیا گیا ہے کہ ان کے معانی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جیسے سورہ بقرہ میں لفظ 'شهداء' اور سورہ مائدہ میں مذکور لفظ 'سوءة'۔

☆ ضرورت کے اعتبار سے لفظ کی تشریح و توضیح میں اختصار یا تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

☆ افعال میں ابواب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی، مضارع، امر، نہی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مصدری معنی کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

☆ بعض مقامات پر تعلیل صرفی بھی بیان کی گئی ہے۔

**لغات القرآن**، غلام احمد پرویز، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، اپریل ۱۹۶۰ (بار اول)

چار جلدوں پر مشتمل غلام احمد پرویز کی مذکورہ کتاب ضخامت (تقریباً ۲۰۰۰ صفحات) کے لحاظ سے دوسرا مقام رکھتی ہے۔

اس کی اولین جلد دستیاب نہ ہو سکی اس لیے اس کے طریقۂ تالیف کے متعلق مرتب کے الفاظ کو پیش نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم دیگر جلدوں سے جو نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

☆ اس کتاب کو مادہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ مادہ کے تحت آنے والے الفاظ کے تفصیلی معانی بیان کیے گئے ہیں۔

☆ ہر لفظ کے مادہ کو نقل کرنے کے بعد فعل/مصدر/اسم کی وضاحت کرتے ہیں اور اس کے معانی مستند کتب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

☆ قرآن میں وارد ہونے والے الفاظ کے معانی موقع محل کی مناسبت سے بیان کیے گئے ہیں۔

☆ بسا اوقات لفظ کا واحد یا جمع اور مذکر یا مونث ہونا بھی بیان کرتے ہیں۔

☆ انبیاء علیہم السلام کے نام کو بطور ایک مستقل مادہ قرار دے کر ان کے حالات زندگی بیان کرتے ہیں۔

☆ لفظ کے معنی نقل کرنے کے بعد حوالہ دیتے ہیں کہ یہ معانی کہاں سے نقل کیے گئے ہیں۔

یہ لغت معانی کے اعتبار سے عمدہ قرار دی جا سکتی ہے لیکن اس سے بھرپور استفادہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی زبان کے قواعد سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہوں۔

**المفردات فی غریب القرآن**، امام راغب اصفہانی، ترجمہ میر محمد جی و احمد حسن، پشاور یونیورسٹی، پاکستان، ۱۹۶۴ء، طبع اول، صفحات ۴۷۹

امام راغب کی المفردات اپنے موضوع پر لاثانی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں دو چند ہو جاتی ہے کہ جن علماء متقدمین نے لغات قرآن کے موضوع پر قلم اٹھایا ان میں صرف امام راغب کی مذکورہ کتاب ہی ہم تک پہنچی ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امام بیضاوی جیسے عالم بھی اس سے استفادہ کرتے تھے۔

مترجمین نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''مفردات جیسی کتاب کا اردو میں بہت پہلے ترجمہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ الفاظ قرآنی کے معانی سمجھنے میں اس سے بہتر جامع اور مستند کتاب شاید ہی مل سکے..... ہم نے کوشش کی ہے کہ کلمات اصل کے مطابق

رکھے جائیں البتہ کہیں عموم استفادہ کے لیے ماضی، مضارع اور مصدر کی وضاحت کر دی گئی ہے اور بعض موقعوں پر جہاں آیات کی تکرار تھی کسی کسی آیت کو چھوڑ دیا گیا ہے اور خود فاضل مصنف نے بھی اس کتاب میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

زبان کا بعینہ ترجمہ حقیقتاً ممکن نہیں تاہم کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ مصنف کی تحریر کے مطابق ہو اور ترجمہ کی صحت کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔'' ۳۵

اس کتاب میں الفاظ کو مادہ کے اعتبار سے نقل کر کے ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں۔ موقع و محل کی وضاحت کے لیے آیات قرآنی کے ساتھ ساتھ عربی اشعار سے جا بجا استشہاد کیا گیا ہے۔ مزید برآں مترادف معانی کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

**لغات الفرقان**، قاری احمد، قرآنی محل، کراچی (ب ت)، صفحات ۵۹۱

یہ کتاب قرآن مجید کے آٹھ ہزار سے زائد الفاظ کا جامع و مستند مجموعہ ہے جس میں آیات و پارہ کے حوالہ کے علاوہ تشریحات بھی موجود ہیں۔

غالباً یہ کتاب، ناشر محمد سعید کی خواہش پر مرتب کی گئی تھی۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں اپنی اس دیرینہ تمنا کا اظہار کیا ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایسا لغت ہونا چاہیے جو اپنی صحت، سند، جامعیت اور ضخامت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ قرآن فہمی سے انس رکھنے والے حضرات تمام لغاتوں سے بے نیاز ہو سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی دلی آرزو کی تکمیل اپنی آنکھوں سے آپ کے ہاتھوں دیکھ رہا ہوں۔ ۳۶

مرتب کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: ''...... بلا شبہ وہ میری امیدوں سے کہیں زیادہ جامع، مفصل اور بے انتہا خوبیوں کا حامل ہے...... مجھے امید ہے کہ دور حاضر میں یہ کتاب قرآن کریم کے معانی و مطالب سے واقف ہونے والوں کے لیے بے انتہا مفید ثابت ہوگی''۔ ۳۷

مرتب نے اصل موضوع - لغات قرآنی - سے قبل قرآن کا قدرے تفصیلی تعارف ''تعارف قرآن'' کے نام سے کرایا ہے جس میں قرآن سے متعلق تقریباً تمام اہم

پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ۳۸؎ اسی تعارف کے آخر میں کتاب کے منہج کی وضاحت "چند خصوصیات" کے تحت کی ہے جس میں تقریباً وہی سبھی باتیں درج ہیں جو دیگر کتب لغات قرآنی میں موجود ہیں۔ ۳۹؎

مرتب نے وجہ تالیف یہ بیان کی ہے کہ اس موضوع پر بہت جامع کام نہیں ہوا تھا جس سے طالب علم کی پیاس بجھ سکے لہٰذا ایک جامع کام کی ضرورت کے پیش نظر اسے مرتب کیا گیا ہے۔ ۴۰؎

کتاب کے مصادر میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین، ڈپٹی نذیر احمد، محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، احمد علی لاہوری، فتح محمد جالندھری کے تراجم شامل ہیں۔

ان تراجم کے علاوہ تفاسیر میں تفسیر حقانی، تفسیر مواہب البرہان، تفسیر موضح القرآن، تفسیر ماجدی، تفہیم القرآن، تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیان القرآن، تفسیر اجمال القرآن، تفسیر عزیزی، اور لغات میں مفتاح اللغات، مصباح اللغات، لغات القرآن، مفتاح القرآن اور عربی اردو ڈکشنری وغیرہ شامل ہیں۔

کتاب میں حسب ذیل امور کو سامنے رکھا گیا ہے:

☆ تمام الفاظ میں حروف ہجا کی ترتیب کو قائم رکھا گیا ہے۔

☆ ہر لفظ کے ساتھ پارہ اور رکوع کا حوالہ دیا گیا ہے تا کہ لفظ تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

☆ تقریباً آٹھ ہزار قرآنی الفاظ کی اس لغت میں صدہا آیات قلم بند کی گئی ہیں تا کہ لفظ کا محل استعمال بھی معلوم ہو سکے۔ نیز جس قدر آیات لکھی گئی وہ مختصر اور معانی کے اعتبار سے ہماری روزمرہ کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا لغت کے مطالعہ کے ساتھ پڑھنے والے یہ بھی جان سکیں گے کہ قرآن کریم میں اصول دین و دنیا کو کس طرح واضح کیا گیا ہے۔

بقول مرتب علماء، خطباء، مقررین، واعظین، مصنفین اور عام طور پر مذہبی، اخلاقی اور سیاسی زندگی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ لغت صرف لغت ہی کا کام نہیں دے گا بلکہ قرآن کو سمجھنے اور اس کے علمی کمالات سے واقف ہونے کا بہت بڑا موقع

ہاتھ آسکے گا۔ یہی اس کتاب کی اہمیت وافادیت ہے۔

**لغات القرآن**، شہید الدین، اصح المطابع کراچی۔ب ت، صفحات ۳۷۰

اس کتاب میں تمام لغات قرآن بترتیب حروف تہجی مع معانی اردو جمع کردیے گئے ہیں۔ کتاب براہ راست شروع ہوجاتی ہے چناں چہ اس میں مرتب کا مقدمہ موجود نہیں ہے۔ کتاب کی ورق گردانی سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں:

☆ الفاظ کہاں اور کس پارہ میں ہیں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

☆ الفاظ کے واحد/جمع ذکر کیے گئے ہیں۔

☆ کسی فعل کے وارد ہونے والے تمام صیغوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

☆ مفرد لفظ کے معنی بتانے کے ساتھ اس کی صفت/موصوف کا ذکر کرکے اس کے معنی بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً دافق کے معنی بیان کرنے کے بعد ''ماء دافق'' کے معنی نقل کیے گئے ہیں۔

☆ کبھی کبھی الفاظ کے مذکر ہونے کی صورت میں اس کی مونث ذکر کرتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس۔

☆ بغیر فصل قائم کیے ایک حرف کے تحت آنے والے تمام حروف کو یکجا کردیا ہے۔ مثلاً ''ر'' کے تحت تمام وہ الفاظ جمع کردیے گئے ہیں جو ''ر'' سے شروع ہوتے ہیں۔ انھیں فصلوں یعنی ر-الف، ر-ب وغیرہ میں تقسیم نہیں کیا ہے۔

**قرآن مجید کا عربی اردو لغت**، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مرکزی مکتبۂ اسلامی، دہلی، نومبر ۱۹۹۶ء (طبع اول بھارت میں)، صفحات ٦٦٠

مرتب نے اس کتاب کی وجہ تالیف ان الفاظ میں بیان کی ہے: ''زیرنظر کتاب کی ترتیب وتالیف میں ہمارے پیش نظر بطور خاص کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ اور معلمین ہیں جو عربی زبان کا وسیع مطالعہ نہیں رکھتے۔ نیز وہ مؤلفین و مصنفین جو اسلامی موضوعات پر تصنیف وتالیف میں مشغول ہیں...... حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی

ہے کہ کسی بھی علمی سطح کا آدمی اس سے استفادے میں دشواری محسوس نہ کرے"۔[۱۴۱]

اس کتاب کی ترتیب وتالیف حسب ذیل منہج پر کی گئی ہے:

☆ مادہ کے بجائے الفاظ کو ان کی اپنی ہی صورت میں لغت تصور کر کے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے جیسے اسقیتکم (ہم نے تم کو پلایا) کو ایک لفظ قرار دیتے ہوئے اس لفظ کو الف۔سین میں شمار کیا گیا ہے حالاں کہ اس کا مادہ سقی ہے۔

☆ امکانی حد تک اس بات کی کوشش کی گئی ہے قرآن حکیم میں موجود کوئی لفظ چھوٹنے نہ پائے۔

☆ اس لغت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں رسم قرآن کی پیروی کی گئی ہے مثلاً الف کی جگہ کھڑا زبر استعمال کیا گیا ہے جیسے الکتٰب۔

☆ مستند اور بلند پایہ مفسرین کے حوالہ سے معانی نقل کیے گئے ہیں جو بالعموم متفقہ بھی ہیں۔کسی لفظ کے شاذ اور اختلافی معنی اختیار نہیں کیے گئے ہیں۔

☆ موقع ومحل کے اعتبار سے بعض الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں لہٰذا ان الفاظ کو مکرر لکھا گیا ہے اور موقع کے اعتبار سے ان کے معانی نقل کیے گئے ہیں۔

☆ جو لفظ قرآن حکیم میں جس طرح آیا ہے اسی طرح درج کر کے پہلے اس کے وہ معنی لکھے گئے ہیں جو قرآن حکیم میں مراد ہیں پھر لفظ کی نحوی تشریح کی ہے تاکہ صیغہ معلوم ہوسکے۔ہر مشتق کا مصدر لکھ دیا گیا ہے اس طرح اس لفظ کے مادہ کی بھی نشاندہی ہوگئی ہے کہ کوئی مزید تفصیلات جاننا چاہتا ہے تو آسانی کے ساتھ لغات کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔

☆ لفظ اگر ضمیر کی طرف مضاف ہے تو اس کی بھی نشاندہی کردی گئی ہے مثلاً أیمانکم۔اس میں أیمان، یمین کی جمع ہے بمعنی قسم، کم ضمیر جمع مخاطب ہے یعنی تمہاری قسمیں۔

☆ اسم ہونے کی صورت میں واحد کی جمع اور جمع کا واحد مذکور ہے۔

☆ جو الفاظ قرآن میں ایک سے زائد مقام پر یا کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، ان کا ہر جگہ ذکر کرنے کے بجائے صرف ایک جگہ ذکر کیا گیا اور اس کے دو ابتدائی حوالے درج کیے

گئے ہیں کہ تمام الفاظ کا حوالہ دینا مشکل بھی تھا مزید اس سے صفحات کی تعداد بھی بڑھ جاتی۔

☆ لغات القرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں عام طور سے لفظ کے بعد پارہ اور رکوع کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ ہر لفظ کا حوالہ سورت اور آیت نمبر کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ پہلے سورت نمبر پھر آیت نمبر کو درج کیا گیا ہے۔

☆ ہر لفظ پر مکمل اعراب لگایا گیا ہے کہ زیر و زبر و پیش کے فرق سے معنی یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

یہ کتاب لغات القرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک اہم کتاب ہے جس سے آسانی سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے اور قرآن کے معانی و مطالب کو بسہولت سمجھ سکتا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب بھی عمدہ ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی اہم کتب ان کے پیش نظر تھیں لہٰذا انھوں نے ان کتب کی ترتیب اور خوبیوں و خامیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا نہج و لائحہ عمل تیار کیا تھا۔

اس لغت کے مآخذ میں اقرب الموارد از سعید الخوری، تاج العروس از زبیدی لسان العرب از ابن منظور، قاموس القرآن از قاضی زین العابدین، لسان القرآن از محمد حنیف ندوی، لغات القرآن از عبد الرشید نعمانی، لغات القرآن از عبد الکریم پاریکھ، المرشد الی آیات القرآن از محمد فارس برکات، معجم الفاظ القرآن الکریم، ناشر مجمع اللغۃ العربیۃ، مصر، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم از فواد عبد الباقی، مفردات القرآن از راغب اصفہانی (اردو ترجمہ) اور نجوم الفرقان از فقیر اللہ شامل ہیں۔

لسان القرآن، از محمد حنیف ندوی و اسحاق بھٹی، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

اس لغت کو لغات القرآن کی طویل کتب کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی صرف تین جلدیں ہمارے سامنے ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۱۴۵ ہے جب کہ ان تینوں جلدوں میں صرف حرف ز تک کے الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسری جلد کا آخری اندراج "ز ی ن" ہے جس کے تحت الزینۃ اور اس کے مشتقات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

لسان القرآن کی ابتدائی دو جلدیں مولانا محمد حنیف ندوی کے قلم کی مرہون منت ہیں اور تیسری جلد مولانا محمد اسحاق بھٹی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے مولانا ندوی کی وفات کے بعد تیار کی تھی۔ باقی ماندہ جلدیں غالباً چھپ چکی ہوں گی لیکن اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی حتمی اطلاع نہیں ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی علیہ الرحمہ کے سامنے چوں کہ ''قرآن حکیم کا توضیحی لغت'' تیار کرنے کا منصوبہ تھا لہٰذا انھوں نے ہر لفظ کے معنی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی دونوں جلدوں میں صرف الف تا د سے شروع ہونے والے الفاظ کا احاطہ کیا جاسکا ہے جب کہ دونوں جلدوں کے مجموعی صفحات کی تعداد ۷۹۳ ہے۔ تیسری جلد حرف ذ تا ز پر مشتمل ہے اور صفحات کی تعداد ۳۴۲ ہے۔ مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں قرآن کی اہمیت کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا ہے۔

مرتب نے اس لغت میں حسب ذیل امور کا خیال رکھا ہے:

☆ زیر بحث لفظ کے بارے میں قرآن وسنت کی تصریحات پر نظر ڈالنے کے بعد اقوال صحابہ وتابعین سے اس لفظ کے کیا معنی ومفہوم منقول ہے، اسے درج کیا جائے۔

☆ زیر بحث لفظ کے بارے میں مآخذ سے معلومات دستیاب نہ ہونے کی صورت میں سیاق وسباق سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے اور اسی کے پیش نظر ان کے معانی لکھے گئے ہیں۔

☆ زیر غور تشریح کے ضمن میں مستند تفاسیر، کتب حدیث اور امہات لغت سے خاصی مدد لی گئی ہے جن میں تاج العروس، لسان العرب، مقاییس اللغۃ، اساس البلاغۃ اور مفردات امام راغب سر فہرست ہیں۔

☆ کتب لغت وادب سے استفادے کا طریقہ مصنف نے یہ اختیار کیا ہے کہ پہلے ہر لفظ کے مادے کا ذکر کیا جائے پھر اس کے مشتقات اور طریق استعمالات یا محاورات بیان کیے جائیں اور اس کے بعد متعین اور راجح معنی کی طرف توجہ دلائی جائے۔[۴۲]

☆ اس لغت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ان جدید علمی تصورات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اس دور میں پڑھے لکھے طبقہ میں رائج ومقبول ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس

بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون غلط۔۴۳

کتاب کی اہمیت اور ضرورت کو مرتب نے ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے۔"یہ کتاب بنیادی طور پر فہم قرآن کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، اسے گو ہم نے لغت کے انداز پر ترتیب دیا ہے تاہم یہ صرف لغت یا ڈکشنری نہیں بلکہ بیک وقت یہ لغت، تفسیر، ادب اور قدیم وجدید معلومات کا ایک مستند مجموعہ بھی ہے۔ ہم نے اس کی تدوین میں دو چیزیں خصوصیت سے مدنظر رکھی ہیں، ایک یہ کہ قاری عربی زبان کی وسعتوں اور معجزہ طرازیوں سے بخوبی واقف ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ قاری کے دل پر قرآن حکیم کی عظمت کا نقش اپنی تمام تر دلآویزیوں کے ساتھ اچھی طرح مرتسم ہو سکے"۔۴۴

مولانا محمد اسحاق بھٹی نے تیسری جلد کی ابتداء میں مولانا مرحوم کے کام کی قدر و قیمت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے: "لسان القرآن کے نام سے مولانا نے حروف تہجی کی ترتیب سے قرآن مجید کا توضیحی لغت لکھنا شروع کیا تھا۔"توضیحی" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں قرآن کے وضاحت طلب الفاظ سے متعلق تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو بڑی جاندار اور علمی بحث ہے لیکن افسوس ہے کہ مولانا یہ کتاب مکمل نہ فرما سکے۔ الف سے لے کر دال تک ان کے تحریر فرمودہ صرف آٹھ حروف دو جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں"۔۴۵

یہ لغت زبان وبیان کے اعتبار سے سب سے منفرد نظر آتی ہے کہ اس میں ہر لفظ کی تشریح وتوضیح تفصیل سے اور عمدہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

**قاموس الفاظ واصطلاحاتِ قرآن، افادات مولانا امین احسن اصلاحی،**

ترتیب وتحقیق: اورنگ زیب اعظمی، اسلامک بک سینٹر، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، صفحات ۴۹۹

کتب لغات قرآنی میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے کہ اسے کسی کتابِ تفسیر کے حوالے سے مرتب کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں لکھی جانے والی اہم ترین تفاسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ کی" تدبر قرآن" بھی شامل ہے۔ فاضل مرتب نے اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی اس میں شامل الفاظ واصطلاحاتِ

قرآن کے معانی پر مشتمل یہ گلدستہ مرتب کیا ہے۔

لغات قرآنی کے میدان میں مکتب فراہی کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے مرتب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے: ''قرآن کے الفاظ وکلمات کے تعلق سے بھی اس (مکتب فراہی) نے پوری ایمانداری اور جانکاری کا ثبوت دیا ہے اور کہیں کہیں اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔اس فن کو قرآن فہمی کا اولین زینہ قرار دیا ہے''۔[۴۶]

لغات قرآنی کے ضمن میں لکھی جانے والی کتب کو انتہائی ہلکی اور تجارتی انداز کی قرار دیتے ہوئے[۴۷] اس کتاب کو ترتیب دینے کی وجہ یوں بیان کی ہے: ''تفسیر قرآن کے دوران مولانا اصلاحی نے اپنے استاد کی تشریح سے مدد لے کر قرآن کے مفرد الفاظ اور اہم اصطلاحات کی ایک دلکش اور مختصر تشریح پیش کی ہے جو اس لائق تھی کہ اسے الگ سے جمع کر دیا جائے کہ ہو نہ ہو کوئی اٹھے اور اس پر مستقل کام کرے''۔ [۴۸]

مرتب نے مقدمہ میں مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ کے اصول وضوابط و مآخذ بیان کرنے کے بجائے مولانا فراہی علیہ الرحمہ کے اصول وضوابط اور مصادر و مآخذ کا ذکر کیا ہے کہ ''انھوں نے اردو خواں طبقہ کی رعایت کرتے ہوئے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے''[۴۹]۔لیکن ان مصادر کا مکمل ذکر کرنے کے بجائے صرف عمومی طور پر ان کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً کسی کتابِ لغت کا نام لیے بغیر ''لغات کی کتابیں'' کا ذکر مصادر میں کیا گیا ہے۔کتبِ لغات کے علاوہ مصادر میں قرآن،کلامِ عرب،اثبت الوجوہ لغۃ،عبرانی اور عربی کی دیگر اخوات کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے:

- ☆ مصنف کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔
- ☆ نامکمل حوالہ جات کی تکمیل کرتے ہوئے حسب ضرورت مزید حوالے دیے گئے ہیں۔
- ☆ کتاب کو طلبہ کی سہولت کے لیے باعتبار مادہ مرتب کیا گیا ہے۔
- ☆ مزید اطمینان کے لیے اصل کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔
- ☆ اضافے بین القوسین نقل کیے گئے ہیں۔

☆ بعض ضروری و مفید تشریحات کو باقی رکھتے ہوئے بعض غیر ضروری تشریحات کو حذف کر دیا گیا ہے۔

☆ متعلق تحریروں کو حاشیہ پر جگہ دی گئی ہے۔

مرتب کے بیان کردہ طریقۂ کار کے اعتبار سے جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

☆ مصنف کا تعارف مرتب کے بجائے نازش احتشام اعظمی کا لکھا ہوا ہے۔

☆ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ مذکورہ لفظ کا مادہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کب اور کہاں سے کس مادہ کے کلمات بیان کیے جا رہے ہیں بلکہ بعض مقامات پر کچھ غیر مانوس سا محسوس ہوتا ہے مثلاً 'اکل' کے بعد 'ایلاف' اور 'المؤلفة (قلوبهم)' اور 'رضوان' کے بعد 'مراغم' کے معانی نقل کیے گئے ہیں اور اس سے قبل ان الفاظ کے مادہ 'ا ل ف/ر غ م' کو بیان نہیں کیا گیا ہے لہذا اگر باعتبار مادہ مرتب کرنے کی بات قاری کے ذہن سے نکل جائے تو ان الفاظ کا اندراج بلحاظ ترتیب غلط معلوم ہوتا ہے۔

مادہ کے بجائے اگر اسے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا کہ طلبہ کے ساتھ ساتھ عام قاری کے لیے اس سے فائدہ اٹھا لینا آسان ہو جاتا اور بعض جگہوں پر محسوس ہونے والی غیر مانوسیت کا بھی ازالہ ہو جاتا۔

بعض الفاظ مثلاً 'الیاسین' اور 'مهیمن' کو مادہ الف سے شروع ہونے والے الفاظ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے لیکن وہاں ان کے معانی نقل کرنے کے بجائے لکھا گیا ہے دیکھیں: الیاسین، مهیمن۔

ان جیسے اندراجات کے لیے یہ طریقۂ کار واضح نہیں ہے کہ جس جگہ اس اندراج کو نقل کرنا مقصود ہوتا ہے ترتیب کے لحاظ اس کا ذکر کیا جاتا ہے نہ کہ بعینہٖ اسی کلمہ کا، لہذا 'الیاسین' کے آگے 'ال یاسین' لکھنا زیادہ بہتر ہوتا، جس کے تحت اس کا اندراج کیا گیا ہے۔

مهیمن کو مادہ الف کے بجائے مادہ ہاء میں ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا کہ اس کی

اصل 'ما امن' کے باوجود لغت میں اس کا اندراج مادہ 'ہا' کے تحت ہی ملتا ہے۔ مادہ الف میں اس کا اندراج کسی قدر التباس پیدا کرتا ہے۔

عام طور سے ایک مادہ کے تحت ایک یا دو ہی اندراج ہیں، کہیں کہیں کچھ زیادہ بھی ہیں تاہم ان جیسے بعض مقامات پر ان الفاظ کے مابین ترتیب باقی نہیں رکھی گئی مثلاً 'ام القری' کے بعد 'امت'، 'ام'، 'اُمّی'، 'ام الکتاب' کا بالترتیب ذکر ہے۔ 'طیبات' کے بعد تین دوسرے مادہ کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں اس کے بعد 'طیبۃ' کا اندراج ہے۔ معاً بعد 'طائر' کا اندراج ہے جو اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس کے بعد دوبارہ 'طیب' اور 'طیبۃ' کا اندراج ہے اور لکھا گیا ہے دیکھیں: الکلم الطیب، شجرۃ طیبۃ وکلمۃ طیبۃ اور اُن کے معاً بعد پھر 'تطیر' کا اندراج ہے۔ اسی طرح مھیمن کا اندراج ھیم کے بعد دوبارہ کیا گیا ہے۔

بعض الفاظ مادہ کے بجائے حروف تہجی کے اعتبار سے نقل ہو گئے ہیں مثلاً 'ضاحکۃ' کا اندراج 'ضحک' کے بجائے 'ضامر' کے بعد کیا گیا ہے۔

عام طور سے الفاظ قرآنی کو ہی مادہ قرار دے کر اس کا اندراج کیا گیا ہے تاہم بعض مقامات پر مادہ کا ذکر کر کے اس سے مشتق قرآنی لفظ کے معانی بیان کیے گئے ہیں جیسے 'سبغ' کے تحت 'سٰبغٰت'، 'سبح' کے تحت 'سٰبحٰت' اور 'عمل' کے تحت 'و العاملین علیھا'۔

☆ ہر کلمہ کی تشریح کے بعد تدبر قرآن کی جلد اور صفحہ کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر ساتھ ہی ساتھ سورہ و آیت نمبر کا حوالہ بھی دے دیا جاتا تو زیادہ فائدہ مند اور مناسب ہوتا کہ قاری کے لیے مطلوبہ لفظ کا قرآن میں تلاش کرنا آسان ہوتا۔ مذکورہ صورت میں قاری کو پہلے تدبر قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ الگ الگ ایڈیشن کے صفحات نمبر بھی بدل سکتے ہیں جس کی وجہ سے الفاظ کو تلاش کرنے میں کافی زحمت ہوگی۔

تدبر قرآن کا حوالہ دینے میں بھی بعض مقامات پر چوک ہوگئی ہے، مثلاً 'زید' کی تشریح کے بعد حوالہ ۶ / ۲۷-۲۹ کا دیا گیا ہے جو غلط ہے۔ 'اسباب' کے معنی بیان کرنے کے بعد صرف ۴۰۴ لکھا ہے، جلد نمبر مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح ایک لفظ 'صغو' کی

تشریح کے بعد حوالہ ۸/۲۶۴-۲۶۶ کا دیا گیا ہے جو دراصل ۲۶۴-۲۶۶ ہے۔ بعض الفاظ کے حوالے ہی نہیں دیے گئے ہیں جیسے 'ضاحکۃ' کے بعد حوالہ مذکور نہیں ہے۔

☆ غالباً تمام الفاظ کا استیعاب نہیں کیا گیا ہے مثلاً تدبر قرآن ۹/۱۴۳ پر موجود لفظ 'قصر' کے معنٰی نہیں بیان کیے گئے ہیں۔

☆ مرتب نے بعض جگہ تشریح کو باقی رکھنے اور بعض جگہ انھیں حذف کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالہ سے جب کچھ اندراجات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض جگہ ضروری تشریح کو حذف کردیا ہے مثلاً 'تساء ل' کے معنٰی کتاب میں یوں مذکور ہیں: ''...... اور استہزاء کے لیے بھی''، جب کہ مولانا مرحوم نے تفسیر میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہاں یہ لفظ استہزاء کے مفہوم ہی میں ہے۔

بعض مقامات پر موجود تشریحات غیر ضروری معلوم ہوتی ہے مثلاً 'شراب' کے معنٰی نقل کیے ہیں: ''شراب سے مراد مشروبات ہیں۔ وہ اس میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے...... الخ''۔ اس میں مذکور کیفیت کا بظاہر لفظ شراب سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

☆ مرتب کا یہ کہنا کہ ''اردو میں تحریر کی ہوئی کتابوں کو دیکھتے ہوئے جو انتہائی ہلکی اور تجارتی انداز کی ہیں...... الخ'' زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ظاہر ہے عبد الرشید نعمانی کی مکمل لغات القرآن، قاضی زین العابدین کی قاموس القرآن، غلام احمد پرویز کی لغات القرآن اور حنیف ندوی و اسحاق بھٹی کی لسان القرآن جیسی کتب لغات قرآن کو اس زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

کتاب کی ورق گردانی سے حسب ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

☆ موقع محل کے اعتبار سے الفاظِ قرآنی کے معانی و مفہوم کو اختصار و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لہذا بعض الفاظ کی تشریح ایک جملہ/ ایک سطر، کچھ جملے/ کچھ سطر پر مشتمل ہے تو بعض کلمات کی تشریح صفحہ، دوصفحہ یا صفحات پر مشتمل ہے۔ تفصیلی تشریح والے کلمات میں 'آلم، صغو، کتاب، کوثر، صبر' وغیرہ شامل ہیں۔

☆ چونکہ مولانا اصلاحی کے پیشِ نظر کتاب لغت کی تالیف نہیں تھی لہذا بعض الفاظ کے معانی بعض مقامات پر اختصار یا تفصیل کے ساتھ موقع ومحل کے اقتضاء کے پیشِ نظر بیان کیے گئے ہیں حالانکہ دونوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے جیسے 'آیات بینات' اور 'انعام'۔

☆ مرکب الفاظ کے معانی ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں جیسے 'ایات محکمات، اصحاب الایکۃ، بحر لجّی، تصریف ریاح' وغیرہ۔

☆ کہیں کہیں مفرد اور مرکب لفظ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے جیسے 'بیّـــــنۃ' کا اندراج الگ ہے، اسے 'ایات بینات' کے ساتھ نقل نہیں کیا گیا ہے۔

☆ بسا اوقات تعلیل صرفی کا ذکر کرتے ہیں مثلاً تتری کے ضمن میں لکھتے ہیں: تتری کی اصل 'وتری' ہے۔ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق 'و' 'ت' سے بدل گئی ہے۔ مزمل دراصل متزمل ہے عربیت کے قاعدے کے مطابق ت حرف ز میں مدغم ہوگئی۔ اس طرح کا تصرف لفظ مدثر میں بھی ہوا ہے۔

اسی طرح بعض الفاظ کے متعلق نحوی مباحث کا بھی ذکر کرتے ہیں مثلاً محل کے متعلق لکھتے ہیں: محل جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے کہ حل یحل سے ظرف ہے اور وقت اور جگہ دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔

☆ کبھی کبھی لفظ کا مادہ وباب بھی بیان کرتے ہیں مثلا ایلاء کے تحت لکھتے ہیں: ألا یألو سے باب افعال ہے۔

☆ اردو معانی کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ کی وضاحت عربی میں بھی کرتے ہیں مثلاً ایلاف کے تحت لکھتے ہیں: الف المکـــان والفہ ایلافا کے معنی ہوں گے تعودہ واستانس بہ۔

☆ بسا اوقات اصل معنی بیان نہ کر کے مرادی معنی بیان کرتے ہیں مثلاً مال وبنین (جس کے معنی مال واولاد کے ہیں) کے متعلق لکھتے ہیں: مـــال وبـنین دنیاوی رفاہت کی ایک جامع تعبیر ہے۔

☆ بعض الفاظ کی اصل کا ذکر کرتے ہیں مثلاً سجّیل سے متعلق لکھتے ہیں: کہ یہ دو

فارسی لفظوں سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے معرب ہے۔ رجز اور رجس کے متعلق لکھتے ہیں: دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب وارتعاش ہے۔

☆ متعدد مقامات پر بعض الفاظ کے ترجمہ وتفسیر کے ضمن میں مترجمین/مفسرین پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے نزدیک جو زیادہ صحیح معنی ہوتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں۔

## نتیجۂ بحث

لغات قرآنی پر مذکورہ کتب کی ورق گردانی کے بعد راقم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انھیں کئی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی تقسیم طویل ومختصر ہونے کے اعتبار سے ہوسکتی ہے۔ دوسری تقسیم طریقہ تالیف کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے اس لحاظ سے انھیں حسب ذیل زمروں میں رکھا جاسکتا ہے:

۱۔ بترتیب حروف تہجی ۲۔ بترتیب مادہ ۳۔ بترتیب سور ۴۔ کتب تفسیر سے ماخوذ

عام طور سے لغات قرآنی پر مشتمل کتب کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس ترتیب کو اختیار کرنے والے مرتبین نے دو طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

۱۔ ہر حرف کو باب قرار دیتے ہوئے انھیں مختلف فصول کے تحت جمع کیا گیا ہے مثلاً حرف الف کا عنوان قائم کرنے کے بعد ذیلی عناوین ا-ب، ا-د، ا-س وغیرہ کو بنایا گیا ہے۔ عام طور سے یہی طریقہ اکثر مرتبین نے اختیار کیا ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ باب وفصل کی تقسیم کے بغیر ہر حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کو یکجا کردیا گیا ہے۔ جیسے مولانا شہید الدین کی لغات القرآن میں ایک حرف کے تحت آنے والے تمام الفاظ کو بغیر کسی تقسیم کے جمع کردیا گیا ہے۔

مادہ کے اعتبار سے ترتیب دی جانے والی کتب میں مرآۃ القرآن از حافظ عبدالحئ اور غلام احمد پرویز کی کتاب لغات القرآن اور قاموس الفاظ واصطلاحات قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی، ترتیب: اورنگ زیب اعظمی شامل ہیں۔ اسی زمرہ میں امام راغب کی کتاب کے ترجمہ کو بھی رکھا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ کار عربی زبان کے اعتبار سے

زیادہ مناسب وبہتر ہے کیوں کہ اس طرح ایک مادہ کے تمام مشتقات ایک جگہ اکٹھا ہوجاتے ہیں لیکن اس طریقہ کار سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جو عربی زبان کے قواعد سے واقف ہوں۔

سورتوں کے اعتبار سے لغات قرآنی کو مرتب کرنے کا سہرا جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے مادہ اور حروف تہجی کے درمیان کی راہ نکالی کہ قاری کو الفاظ کے معانی دیکھنے کے لیے بار بار اوراق پلٹنا نہ پڑے۔ شاید اسی ترتیب جدید کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتاب کو لغات قرآنی پر لکھی جانے والی کتب کے سرمایہ میں سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا۔ اسی زمرے میں عبدالرحمٰن حنفی کی کتاب 'انوار القرآن' بھی شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ میرے خیال میں مذکورہ دونوں کتابوں کی ترتیب سب سے زیادہ مناسب اور آسان ہے۔

کتب تفسیر سے ماخوذ کتاب میں مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب کو بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے اور اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیگر کتب تفسیر سے ماخوذ ومستنبط لغات تیار کی جاسکتی ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، قاموس القرآن، یونین پریس، دہلی، ۱۹۵۴، ص ۳

۲۔ حاجی محمد بن عبداللہ: عجائب البیان فی لغات القرآن...... مطبع نامی، لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء، ص ۴۰۰

۳۔ ایضاً، ص ۴۰۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۰۰

۵۔ ایضاً، ص ۲

۶۔ ایضا، ص ۳

۷۔ عبدالرشید نعمانی، مکمل لغات القرآن، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۳، ۶/۱

۸۔ ایضاً، ص ۱۲

۹۔ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۲

۱۰۔ جلد اول کے مقدمہ میں جہاں اسے چار جلدوں میں مکمل کرنے کی وضاحت کی گئی ہے وہیں حاشیہ پر لکھا گیا ہے کہ ''دوسری اور تیسری جلد شائع ہو چکی ہے اور چوتھی زیر ترتیب ہے۔اس بیان اور دوسری و تیسری جلد کے سنہ اشاعت میں فرق کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

۱۱۔ ایضاً،ص۱۱

۱۲۔ ایضاً،تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ مرتب،ص۶-۱۱

۱۳۔ ایضاً،ص۱۱

۱۴۔ قاموس القرآن (میرٹھی)،ص۳-۴

۱۵۔ حافظ عبدالحیٔ کیلانی، مرآۃ القرآن فی لغۃ القرآن، پیش لفظ،ص۱۰

۱۶۔ عبدالکریم پاریکھ،آسان لغات القرآن،ایجوکیشنل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۶ء،ص۶

۱۷۔ ایضاً،ص۱۷

۱۸۔ ایضاً،ص۱۰

۱۹۔ ایضاً،ص۱۱

۲۰۔ ایضاً،ص۱۲

۲۱۔ ایضاً،ص۱۲

۲۲۔ ایضاً،ص۱۲

۲۳۔ ایضاً،ص۱۵

۲۴۔ ایضاً،ص۷-۱۱

۲۵۔ قاموس القرآن (میرٹھی)،ص۳-۵

۲۶۔ ایضاً،ص۷

۲۷۔ مرآۃ القرآن،ص۳

۲۸۔ ایضاً،ص۳

۲۹۔ غالباً غلطی سے علامہ سید سلیمان ندوی کی جگہ علامہ شبلی لکھ دیا گیا ہے۔

۳۰۔ مرآۃ القرآن،ص۳

۳۱۔ ایضاً،ص۱۵اودیگر

۳۲۔ ایضاً،ص۷۳اودیگر

۳۳۔ عبدالرحمٰن حنفی ،انوارالقرآن ،ادارۂ اشاعت قرآن وحدیث ،جامع مسجد کوٹ مسجد فتح دین خان قصور، لاہور، ۱۹۵۶ء، ج ۲،ص ا (تعارف)

۳۴۔ ایضاً، ج ۲،ص ا

۳۵۔ امام راغب اصفہانی ،ترجمہ میر محمد جی واحمد حسن: المفردات فی غریب القرآن، پشاور یونیورسٹی ، پاکستان، ۱۹۶۴،ص ۱-۲ (تمہید)

۳۶۔ قاری احمد، لغات القرآن، قرآن محل، کراچی (ب ت )،ص ۳-۴ (مقدمۂ ناشر)

۳۷۔ ایضاً،ص ۴

۳۸۔ ایضاً، تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۳-۵

۳۹۔ ایضاً، تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۳۰-۳۲

۴۰۔ ایضاً،ص ۳۰

۴۱۔ قرآن مجید کا اردو لغت ،ص ۲-۳ (مقدمۂ مرتب)

۴۲۔ محمد حنیف ندوی، لسان القرآن، علم وعرفان پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۸، ۳۲/۱

۴۳۔ ایضاً، ۳۱/۱

۴۴۔ ایضاً، ۲۹/۱-۳۰

۴۵۔ ایضاً، ۳/۳ (حرفے چند)

۴۶۔ امین احسن اصلاحی، ترتیب اورنگ زیب اعظمی ، قاموس الفاظ و اصطلاحات قرآن، اسلامک بک سینٹر، نئی دہلی ۲۰۰۴ء،ص ۵ (مقدمہ)

۴۷۔ ایضاً،ص ۹ (مقدمہ)

۴۸۔ ایضاً،ص ۶ (مقدمہ)

۴۹۔ ایضاً،ص ۶ (مقدمہ)


☆

# جدید اردو تفاسیر میں تفسیر نکاح المقت

محمد یٰسین مظہر صدیقی

اصلاحِ معاشرت کے تعلق سے اسلام نے متعدد قوانین بنائے، کسی جاہلی قانون کو کالعدم قرار دیا، کسی کی اصلاح کی، کسی کی نوکِ پلک سنواری اور کسی کو جوں کا توں باقی رکھا۔ ان تمام اصلاحوں کے پیچھے حکمت و مصلحت کے عناصر کارفرما تھے۔ ایک ایسی رسم بد "نکاح المقت" (ناپسندیدہ نکاح) کی تھی۔ وہ جاہلی معاشرے میں بھی بری سمجھی جاتی تھی، اسی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا۔ عربوں کے بعض افراد و طبقات میں یہ برا رواج پڑ گیا تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماؤں سے باپ کے مرنے کے بعد نکاح کرلیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اصلاً ان کے توارث وترکہ کی ایک ریت تھی جو بعض بدقماشوں نے اپنالی تھی، ورنہ عرب جاہلی معاشرہ اس سے پاک تھا۔

ہمارے بعض مفسرین کرام نے متعدد طبقاتِ عرب کو اس ناپسندیدہ اور نفرت انگیز نکاح کا مجرم قرار دیا ہے جیسا کہ اگلی بحث میں آئے گا۔ ان کا پورا انحصار دراصل تعمیم کے انداز پر ہے۔ وہ عمومی روایات اور عام تبصروں کا سہارا لے کر بعض طبقات کو اس میں ملوث قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے سب سے عجیب وغریب یثرب/ مدینہ کے بعض طبقات کے عمومی ابتلا کا خیال ہے۔ ان بزرگوں کی نظر صرف مکہ اور مدینہ کے قریش و انصار قبائل پر ٹکی تھی لہٰذا وہ اس کے آگے نہیں دیکھ سکے، حالاں کہ وہ حقیقت نہیں ہے۔ امام ابن قتیبہ دینوریؒ جیسے ماہرین فن نے "نکاح المقت" کا جرم کرنے والوں کی ایک فہرست دی ہے جو دس سے آگے نہیں بڑھتی۔[1]

بہر حال قرآن مجید نے اس نفرت انگیز رواج کی تحریم کو، جو پہلے سے موجود تھی،

وحیِ الٰہی سے مؤید کر کے مستقل بنا دیا۔ اور واضح الفاظ میں حکم نازل فرمایا: ”**ولا تنکحوا ماںکح آباؤکم من النساء الا ماقد سلف انه کان فاحشة ومقتا وساء سبیلا.**

(سورہ نساء-۲۲: اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تمہارے باپ، مگر جو آگے ہو چکا، یہ بے حیائی ہے اور کام غضب کا، اور بری راہ ہے“ شاہ عبد القادرؒ: (اور جن عورتوں سے تمہارے آباء نے جو نکاح کیا تھا وہ نکاح تم نہ کرنا، مگر جو ہو چکا، بلا شبہ یہ بے حیائی اور نفرت کا کام ہے اور برا طریقہ ہے)[۲] اس آیت کریمہ کی تفسیر و تشریح میں سابقہ نکاح مقت کے علاوہ بعض دوسرے احکام بالخصوص فقہی نظریات و آراء بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اردو مفسرین کرام کی تشریحات کے حوالے سے ان کا ایک تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان اردو والوں پر عربی کے قدیم و جدید مفسرین و شارحین کا اثر واضح طور سے نظر آئے گا کہ اس سے مفر نہیں۔

شاہ عبد القادر دہلویؒ نے مزید کوئی خاص تشریح نہیں کی ہے، صرف ”**الا ماقد سلف**“ مگر جو ہو چکا کو مزید مدلل کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے صرف ترجمہ کیا ہے اور حاشیہ و فائدہ کوئی نہیں دیا۔[۳] ڈپٹی نذیر احمدؒ نے زیادہ بحث اہل جاہلیت کے سلوک زن سے کی ہے اور آخر میں زیر بحث مسئلے پر لکھا: ”الغرض یہاں تک عورتوں پر بے جا حقوق سمجھ رکھے تھے کہ بیٹا بھی اپنے باپ کا وارث ہوتا تو اپنی دوسری ماں سے نکاح کر لیتا۔ اللہ نے ان آیتوں میں ان سب حرکتوں سے منع فرما دیا۔“ ڈپٹی موصوف نے اپنے ترجمہ میں اسے ماضی کا دستور قرار دینے کا صیغہ استعمال فرمایا ہے: ”...... یہ بڑی بے حیائی اور غضب کی بات تھی اور بہت ہی برا دستور تھا۔“ مولانا آزاد نے اسی پر اکتفا کیا ہے۔[۴]

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بیان القرآن میں ترجمہ کے بعد اپنے اردو حواشی میں پہلے تو ترجمہ کی عبارت میں بعض باتیں بین قوسین بڑھائی ہیں اور ان کے لیے کشاف اور روح المعانی کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا موصوف نے روح المعانی کے زیرِ اثر اس آیت کی تشریح میں بھی صوفیانہ پہلو نکال لیا ہے کہ مرشد کو تائب گناہگار مرید کے پچھلے گناہوں اور تقصیروں کا حوالہ دے کر اسے شرمندہ نہ کرنا چاہیے۔ ان کی اصل تفسیر کے نکات ان ہی

کے الفاظ میں یہ ہیں: ''(۱)...... جاہلیت میں بعض لوگ ایسا کرتے تھے مگر شائستہ لوگ اس زمانہ میں بھی ان کو برا جانتے تھے اور اس کو نکاحِ مقت کہتے تھے اور جو اس نکاح سے اولاد ہوتی تھی اس کو مقتی کہا کرتے تھے ''کـذا فی الکشـاف'' اسی لیے احقر نے اس میں عرف بڑھا دیا ہے کیوں کہ ان کے عرف میں اس کا لقب مقت مشہور تھا۔ اور عقلاً بے حیائی ہونا اور شرعاً بوجہ منہی عنہ ہونے کا اس کا برا طریقہ ہونا ظاہر ہے۔ (۲) حتی کہ اگر کوئی ایجاب وقبول کر بھی لے تو وہ نکاح منعقد نہ ہوگا۔ پس باطلِ محض ہے، اسی طرح نساءِ محرمات آئندہ بھی۔ اس کے اعلیٰ درجہ کے قبح ظاہر کرنے کے لیے وجوہ اس کی مذمت کی ارشاد فرمائیں ہیں۔ (۳) مسئلہ نکاح شرعاً حکم وطی میں ہے۔ جب باپ کی موطوءۂ حکمیہ سے نکاح حرام ہے تو جو اس کی موطوءہ حقیقیہ ہو، گو بلا نکاح ہو، اس سے بدرجہ اولیٰ نکاح حرام ہے (۴) اور یہی مذہب ہے امام ابوحنیفہؒ کا کہ جس عورت سے باپ نے زنا کیا ہو اس سے بیٹا نکاح نہیں کرسکتا (۵) اسی طرح جہاں جہاں نکاح سے تحریم مؤید ہوجاتی ہے زنا سے بھی ہوجاتی ہے۔'' حاشیہ میں مولانا موصوفؒ نے عربی میں اسی بات کو مزید مدلل کیا ہے جو کشاف، روح المعانی وغیرہ سے مستعار ہے۔ حضرت گرامی نے کشاف وغیرہ کی عبارت کو حقیقت سمجھ کر قبول فرمالیا۔ مقتی اولاد کا ثبوت کسی بھی واقعہ، اثر یا شہادت سے نہیں ملتا۔ اسی طرح نکاح کے معنی کا معاملہ ہے۔ [۵]

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ حضرت تھانویؒ کے مسترشد تھے مگر وہ قدیم تفاسیر سے بھی خوب استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے آیتِ مذکورہ بالا کے ترجمہ پر دو حواشی لکھے ہیں ایک ''الا ماقد سلف'' پر اور دوسرا آیت کریمہ کے اواخر میں۔ اول حاشیہ کے تحت، ان کے نکات ہیں:

''یعنی اس حکم کے نزول سے قبل جو ہوچکا، اب اس پر باز پرس نہیں۔ ''ای قبل نزول آیة التحریم فانه معفو عنه (کبیر) لاتنکحوا. نکاح عقدِ تزوج کے معنی میں تو ظاہر ہی ہے لیکن یہاں اس سے وسیع تر لغوی مفہوم مطلق صحبت کرنے کا لیا گیا ہے۔ ''فیـه تـحـریـم وطئ موطوئة الا ب بنکاح اوبملک یمین او بزنا ، کما هو

مذھبنا، وعلیه کثیر من المفسرین "(مدارک)

"مانکح آباؤ کم" عرب جاہلیت کے اس دستور کی طرف اشارہ ہے کہ سوتیلی ماؤں سے بھی نکاح کرلیا جاتا تھا اور مدینہ میں یہ دستور زیادہ تھا: قال ابن عباسؓ وجمھور المفسرین: کان اھل الجاھلیة یتزوجون بازواج آبائھم (کبیر). وکانت ھذہ السیرة فی الانصار لازمة، وکانت فی قریش مباحة مع التراضی (قرطبی)

"مانکح" میں مامَنْ کے معنی میں ہے: ما بمعنی مَن (جلالین) وتکون ما بمعنی "الذی" .ومن والدلیل علیه أن الصحابة تلقت الآیة علی ذلک المعنی" (قرطبی)

"آبائکم" اس کے ذیل میں وہ بیویاں بھی آگئیں جو دادایا نانا کے نکاح میں رہ چکی تھیں: واسم الآباء ینتظم الاجداد (روح) والآباء ھنا یشتمل الاب ومن قبله من عمود النسب (نھر)

دوسرے حاشیہ کے تحت وہ لکھتے ہیں قرآن مجید نے تین لفظ استعمال کیے ہیں اور تینوں سے الگ الگ اشارے ہیں:

"فاحشة" ۔ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز ہے۔

"مقتاً" ۔ مذاقِ سلیم رکھنے والوں کے عرف میں بڑی بے حیائی کی چیز تھا۔ مقت کہتے ہیں ایسی بری چیز کو جسے دیکھ کر گھن یا کراہت پیدا ہو: "المقت بغض شدید لمن تراہ تعاطی القبح (راغب)" ۔خود اہل جاہلیت بھی اس نکاح کو بہت بری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا۔

ساء سبیلا. یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح ہیں، امام رازیؒ نے فرمایا کہ قبح کے تین درجے ہوتے ہیں: ایک قبح عقلی، دوسرے قبح شرعی، تیسرے قبح عرفی۔فاحشه میں اشارہ اول کی جانب ہے، مقتا میں دوم کی جانب، ساء سبیلا میں سوم کی طرف"۔ مولانا مرحوم نے پیشروؤں سے صرف اپنے مطلب کی باتیں اخذ کی ہیں اور مخالف موقف

والی قطعی نظر انداز کر دیں۔ سوتیلی ماؤں سے نکاح جاہلی دستور نہ تھا، نکاح بمعنی جماع صحیح نہیں ہے اس طرح "ما" کی بحث۔ مفصل کلام تجزیہ میں آتا ہے۔۶

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تدبر قرآن میں نکاح المقت اور مقتی کی لغوی تشریح اور عربوں کے جاہلی رواج کا مختصر ذکر کر کے زواج المقت پر مختصر تبصرہ کیا ہے کہ ''عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ باپ کی منکوحات بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے ان سے زن وشو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس آیت نے اس فعلِ شنیع کی حتمی ممانعت کر دی...... '' مولانا موصوفؒ کا تیسرا نکتہ بہت اہم ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں کا ذکر قرآن میں عام صیغے سے جو آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں لازماً پوری قوم مبتلا تھی۔ بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برائی کسی خاص طبقے کے اندر محدود ہوتی ہے لیکن اس سے متعلق قانون چوں کہ سب پر حاوی ہوتا ہے اس وجہ سے خطاب عام رہتا ہے۔ یہاں اس برائی کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود شاہد ہیں کہ اس کا کھلی ہوئی بے حیائی اور مبغوض ہونا عرب کے شرفاء کو بھی معلوم تھا۔'' ۷ مولانا موصوف کا یہ تبصرہ کہ باپ کی منکوحات وراثت میں بیٹے کو ملتی تھیں قطعی غلط ہے اور قباحت محسوس نہ کرنے کی تردید خود ان کے دوسرے اور آخری تبصرے سے ہو جاتی ہے کہ وہ قباحت محسوس کرتے تھے۔

مولانا محمد جوناگڑھی کے ترجمہ پر مولانا صلاح الدین یوسف کا حاشیہ انتہائی مختصر ہے:

'' (۴) زمانہ جاہلیت میں سوتیلے بیٹے اپنے باپ کی بیوی (یعنی سوتیلی ماں سے) نکاح کر لیتے تھے۔ اس سے روکا جا رہا ہے کہ یہ بہت ہی بے حیائی کا کام ہے۔ (لاتنکحوا مانکح آباؤکم) کا عموم ایسی عورت سے نکاح کو ممنوع قرار دیتا ہے جس سے اس کے باپ نے نکاح کیا لیکن دخول سے قبل ہی طلاق دے دی۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ بات مروی ہے اور علماء اس کے قائل ہیں (تفسیر طبری)۔'' سوتیلی ماں سے شادی کو ایک عام ابتلاء قرار دینے کا تعمیمی رجحان اس تشریح میں موجود ہے۔ چند کے جرم کو

پوری قوم کے سر منڈھ دیا گیا ہے۔۸؎

شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور نواب وحید الزماں حیدر آبادیؒ بالخصوص موخر الذکر کے ترجمہ پر جو حاشیہ ہے وہ یہ ہے:

''ف۳۰ جاہلیت کے دستور کے مطابق بیٹے کے لیے اپنے باپ کی منکوحہ (سوتیلی ماں) سے شادی کر لینا جائز تھا۔ چناں چہ حضرت قیس بن اسلتؓ نے اپنے والد کی وفات پر جب اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کرنا چاہا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اسے سخت حرام قرار دیا۔ (ابن کثیر) حدیث سے ثابت ہے کہ ایسا نکاح کرنے والا واجب القتل ہے (مسند احمد)۔

مفتی محمد شفیعؒ نے اپنے معارف القرآن میں حسب دستور ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر میں مولانا تھانویؒ کے ترجمہ وتشریح دینے کے بعد محرمات کی تفصیل دی ہے اور معارف و مسائل کے تحت ان پر مفصل بحث میں آیت کریمہ سے متعلق بعض باتیں عام انداز سے اور بعض خاص انداز سے کہی ہیں۔ ان کی بحث مختصر کے نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم'' جاہلیت کے زمانہ میں اس میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیتے تھے۔ اس آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منع فرمایا اور اس کو موجبِ مقت یعنی خدائے پاک کی ناراضگی کا باعث بتایا۔ ظاہر ہے کہ یہ کیسی اخلاق کی موت اور کردار کی خرابی ہے کہ جس کو ایک عرصہ تک ماں کہتے رہے، اس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ لیا۔

۲۔ مسئلہ: آیتِ شریفہ میں باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی قید نہیں لگائی ہے کہ باپ نے ان سے وطی بھی کی ہو، لہٰذا کسی بھی عورت سے اگر باپ کا عقد بھی ہو جائے تو اس عورت سے بیٹے کے لیے نکاح کبھی بھی حلال نہیں۔

۳۔ اسی طرح بیٹے کی بیوی سے باپ کو نکاح کرنا درست نہیں، اگر چہ بیٹے کا صرف نکاح ہی ہوا ہے: قال الشامی: وتحرم زوجۃ الاصل والفرع بمجرد

العقد دخل بھا اولا."

۴۔ مسئلہ: اگر باپ نے کسی عورت سے زنا کرلیا ہوتو بھی بیٹے کواس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔"

مولانا مفتی مرحوم نے باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کے سلسلے میں سوتیلی کی قید نہیں لگائی جو ضروری تھی کیوں کہ ابھی تک جاہلی دور کی ایک روایت بھی نہیں ملی جس کے مطابق جاہلیت والے اپنی سگی ماں سے نکاح کر لینے کے مرتکب ہوئے ہوں۔ دوسرے "جاہلیت میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا" کا فقرہ بھی تعمیم کا انداز رکھتا ہے۔ اول تو وہ عام نہیں تھا دوسرے اس میں قطعی باک سمجھا جاتا تھا ورنہ وہ نکاح مقت کیوں کہلاتا۔ باپ کی منکوحہ سے نکاح کے حرام ہونے اور عدم وطی کی بحث بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ آیت میں نکاح سے مراد عقد زواج ہے، وطی و جماع نہیں۔ پھر نکاح محرمات کا باطل ہونا ظاہر ہے جیسا کہ ان کے مرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے۔۹

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں آیت کریمہ سے متعلق تین حواشی تحریر فرمائے ہیں: اول کا تعلق "الا ماقد سلف" کے اصول قرآنی اور اس کے اطلاق سے ہے، دوسرے کا محرمات سے نکاح کرنے کے بارے میں اسلامی قانون سے اور تیسرے میں باپ سے ناجائز تعلق رکھنے والی عورت کا بیٹے پر حرام ہونے سے ہے۔ ان تینوں کو بالترتیب نقل کیا جاتا ہے:

"۳۲ تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعموم قرآن مجید میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ "جو ہو چکا سو ہو چکا"۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانے میں جو غلطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو ان پر گرفت نہیں کی جائے گی بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلو اور جو غلط کام ہیں انھیں چھوڑ دو۔ دوسرے یہ زمانۂ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھہرایا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ پچھلے قانون یا رسم ورواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعدم اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو

ناجائز اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جارہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے ان کی اولاد حرام قرار دی جارہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حق وراثت ساقط کیا جارہا ہے۔ اسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں انھیں بھی کالعدم ٹھہرادیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کمائی ہو اس سے واپس لی جائے گی یا مال حرام ٹھہرائی جائے گی۔

۳۳ اسلامی قانون میں یہ فعل فوج داری جرم ہے اور قابل دست اندازی پولیس ہے۔ ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطی جائداد کی سزا دی ہے۔ اور ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا کہ: "من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ": جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کردو۔" فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمد تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کرلیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کی ہو تو اس پر حدِ زنا جاری ہوگی اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

۳۴ ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی ماں دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں نیز اس حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت کے ساتھ باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سلف میں سے بعض اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جس عورت کو باپ نے شہوت سے ہاتھ لگایا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سلف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ

جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں۔ مگر یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہوسکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملہ میں ان قانونی موشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیر نکاح اور قبل نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ کا فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''من نظر الی فرج امرأة حرمت علیه امها وابنتها'': جس شخص نے کسی عورت کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالی ہو اس کی ماں اور بیٹی دونوں اس پر حرام ہیں۔ اور ''لاینظر الله الی رجل نظر الی فرج امرأة وابنتها'': خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالے''۔ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہوجاتا ہے۔'' [۱۰] مولانا مرحوم نے عام مفسرین کی مانند سوتیلی ماں سے نکاح کی تحریم کو نزول آیت کریمہ کے بعد مانا ہے حالاں کہ وہ قدیم دین ابراہیمی کا قانون ہے جو عربوں میں رائج چلا آرہا تھا، ورنہ وہ اسے نکاح مقت کیوں کہتے۔ دوسرے فرج کا ترجمہ اعضاء صنفی بہت وسیع ہوجاتا ہے، اس کو مقام خاص تک محدود کرنا چاہیے کہ حدیث کے لفظ کا تقاضا یہی ہے۔

## مختصر تجزیہ:

اگرچہ تفسیرِ آیت کریمہ میں زیادہ توجہ اردو مفسرین کی تشریحات پر مرکوز رکھی گئی ہے تاہم بعض بنیادی عربی تفاسیر کی بعض روایات وآراء اس میں از خود آگئی ہیں۔ وجہ بہت

صاف وسادہ ہے کہ اردو مفسرین نے اہم اسلامی مفسرین سے استفادہ کیا اور اس کے بغیر ان کا گزارہ بھی نہ تھا۔ خلف بہر حال سلف پر انحصار کرنے پر فطری اور تاریخی طور سے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ متعدد اردو مفسرین نے اپنے خاص فقہی نقطۂ نظر کے مطابق پیش رو مفسرین کی آراء وتعبیرات میں سے صرف اپنی پسندیدہ روایات لی ہیں سوائے ایک آدھ کے۔

مذکورہ بالا مفسرین وشارحین کی تعبیرات پر نکتہ بہ نکتہ مختصر تبصرہ کرنا ضروری اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ اول بحث یا نکتہ یہ ہے کہ سوتیلی ماں سے نکاح عرب جاہلی معاشرہ کا عام دستور نہ تھا جیسا کہ متعدد حضرات کرام نے بتادیا ہے۔ وہ چند افراد بلکہ گنے چنے افراد کا انحراف تھا جو اپنے دینی اور معاشرتی دستور کو توڑ کر اپنایا گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عرب جاہلی معاشرے میں بھی اس نکاح کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا اور اسے سندِ صحت و قبول حاصل نہ تھی۔ اسی بنا پر اس کو "نکاح المقت" کہا گیا۔ وہ صرف شرفاء واکابر کے معیارِ شرافت ہی کے خلاف نہیں تھا بلکہ ان کے دینی نظام اور معاشرتی دستور کے بھی خلاف تھا۔ عرب جاہلی معاشرہ نے اس نکاح کو حرام ہی سمجھا اور قرار دیا، جس طرح دوسرے بعض معاشرتی اور دینی انحرافات کو حرام سمجھا اور قرار دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جاہلی معاشرے نے اس حرام نکاح کو برداشت کرلیا تھا اور اسلامی قانون نے اس حدِ برداشت کو بھی توڑ دیا۔ حرام تو وہ پہلے ہی تھا یعنی دین ابراہیم میں جس کے وہ پیروکار تھے اس کی طرف ان شارحین نے توجہ نہیں کی اور بعض پیش رو مفسرین کی عمومی آراء قبول کرلیں جیسے مقتی اولاد وغیرہ اور ان کی آثار وروایات سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اب اسلامی آخری شریعت نے اس حرام کے نفاذ کا اعلان کردیا۔ اسلامی قوتِ نافذہ۔ اسلامی ریاست۔ نے اس کے لیے حدود وتعزیرات اور قوانین نہ صرف بنائے بلکہ بزور شمشیر ان کا نفاذ بھی کیا۔ آیتِ کریمہ میں اس کا نظری تحریمی نفاذ ہے اور احادیث وسننِ نبوی میں اس کا عملی اور حقیقی نفاذ ملتا ہے۔ اور واقعات سیرت وتاریخ حقیقی شہادت فراہم کرتے ہیں۔

۲۔ بعض مفسرین کرام بالخصوص ڈپٹی نذیر احمدؒ نے سابقہ آیاتِ کریمہ میں عائلی اور نکاحی قانونوں اور رواجوں سے اس آیتِ کریمہ کو جوڑا ہے اور نظمِ قرآن مجید کے لحاظ سے وہ اہم ترین ارتباط ہے جس کا احساس بعض حاملینِ نظم بھی نہیں کر سکے۔ سوتیلی ماں سے نکاح کی تحریم دراصل جاہلی دور میں رائج متعدد نکاحوں کی تحریم سے وابستہ ہے اور جن کا ذکر حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ملتا ہے۔ حدیث بخاری-۵۱۲۷ کے مطابق چار قسم کے نکاح اس دورِ جاہلی میں رائج تھے جن میں تین کو محمدی شریعت نے کالعدم قرار دیا اور صرف ایک نکاح کو باقی رکھا جو عہد نبوی اور دوسرے اسلامی ادوار میں بلکہ آج تک رائج ہے۔ سوتیلی ماں سے باطل نکاح کا تعلق ان سابقہ مردود اور حرام نکاحوں سے تھا اور قرآن مجید نے اس کی شدید شناعت کے پیش نظر اس کا خاص ذکر کیا۔ بقیہ کو وحیِ حدیث کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ بحث کافی طویل ہے اور اس کے لیے شروح حدیث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔[۱۱]

۳۔ آیتِ کریمہ کا ترجمہ میں بالعموم تمام ہی مترجمین نے الفاظِ قرآنی میں سے ایک خاص لفظ کا خیال نہیں کیا ہے۔ اور وہ ہے: ''ما'' یعنی فرمایا گیا: ''ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم من النساء الخ''. اس کا بہتر اور لفظِ قرآنی کے مطابق ترجمہ ہوگا ''اور تم وہ نکاح نہ کرنا جو تمہارے آباء اجداد نے عورتوں سے کیا ہے۔'' اس میں سوتیلی ماؤں کے علاوہ تمام نکاح جاہلی بھی آ جاتے ہیں۔ جن مفسرین وشارحین کو لفظ ''مانکح'' نے الجھن میں ڈالا انھوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ''ما'' یہاں بمعنی ''من'' ہے جیسا کہ قرطبی اور جلالین کے حوالے سے تفسیر دریا آبادی میں گزرا۔ امام قرطبیؒ[۱۲] نے یہ تو تسلیم فرمایا کہ صحابہ کرامؓ نے اسی معنی کو کہ ''جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا'' یعنی بمعنی ''من'' کے مطابق ہی اس لفظ قرآنی کو پایا اور سمجھا تھا۔ مگر اس سے بحث نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ ''ما'' کو کیوں استعمال فرمایا؟ وہ بآسانی ''من'' بھی اس کی جگہ استعمال کر سکتا تھا۔ لہٰذا نظمِ قرآنی اور اصول تفسیر دونوں بتاتے ہیں کہ یہاں ''مانکح آباؤکم من النساء'' کا ''من نکح آباؤکم من النساء'' سے بڑا اہم امتیاز وفرق ہے اور وہ عام ومطلق اور خاص ومقید کا فرق ہے۔ ''من'' میں صرف نکاحی بیویاں شامل ہو جاتیں۔ ''مانکح

آبــاؤ کــم" میں آباء اجداد اور بالخصوص باپوں کے عورتوں سے ہر طرح کے جاہلانہ نکاح بالخصوص ان کے طریقے بھی آ گئے۔ قرآن مجید میں "مــا" اور "مــن" کے ایسے ہی بہت سے مقاماتِ امتیاز ہیں۔ امام رازیؒ نے اس کی یہی تعبیر کی ہے: "۳۱..... وعــلــی هــذا یـکـون الـمـراد منه النهی عن ان تنکحوا نکاحا مثل نکاح آباؤ کم....." لہٰذا ترجمہ میں اس کی رعایت ضروری ہے۔

۴۔ اسی لفظ و نظمِ قرآنی اور اصول وضابطۂ ترجمانی کا دوسرا اقتضا یہ ہے کہ لفظِ نکاح کو اس کے عرفی معنوں میں رکھا جائے۔ اس سے عقدِ زوجیت ہی مراد ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف لفظ نکاح استعمال فرمایا ہے اور اس سے معروف نکاح وشادی اور بیاہ کے معنی ہی مراد لیے جاتے ہیں اور کوئی بھی اسے لغوی معنی وطی یعنی جماع کے معنی میں نہیں لیتا۔ عرب جاہلی کے دستورِ نکاح ہوں یا اسلامی تصورِ عمل نکاح دونوں میں صرف نکاح کے معنی شادی اور ازدواج کا بندھن ہے۔ جن مفسرین کرام نے ایک خاص نقطۂ نظر سے متاثر ہو کر یہاں نکاح کو جماع - جائز و ناجائز۔ کے معنی میں لیا ہے اور لغوی معنی ہی کو راجح کہا ہے انھوں نے نظمِ قرآنی اور اصولی تفسیر دونوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر زنا، جماع وغیرہ کے معنی پر مشتمل الفاظ اس تعلقِ شہوانی کے قیام واظہار کی خاطر استعمال کیے ہیں۔ اس کی مراد اگر جماع اور نفسانی خواہش کا تقاضا پورا ہونے سے ہوتی تو وہ ان معانی کا حامل لفظ یہاں بھی لاتا۔ مگر اس نے دونوں جگہ " ولا تنکحوا" اور " مــا نـکـح آباؤ کم" صرف لفظ نکاح استعمال کی جو صرف اصطلاحی معنی رکھتا ہے اور ان سے جماع مراد نہیں ہو سکتا۔ ورنہ الزامی طور سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر آباء کا نکاح زنا کے زمرے میں تھا تو مخاطبین کو بھی ان سے زنا نہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیوں کہ دونوں جگہ لفظ نکاح ہی ہے اور دونوں کا معنی یکساں ہونا چاہیے۔

امام ابن تیمیہؒ وغیرہ نے قرآنی مترادفات اور الفاظ کے سلسلے میں ایک نادر، بے مثال اور مستقل اصول بیان فرمایا ہے۔ اول یہ کہ قرآن مجید میں مترادفات نہیں ہیں اور دوم یہ کہ جو لفظ جس جگہ استعمال ہو گیا ہے اس کے وہی معنی ہیں جو متبادر ہیں اور جن کی

طرف اہل زبان کا ذہن فوراً جاتا ہے۔ لہٰذا متبادر معنی ہی مراد لینے ضروری اور لازمی ہیں اوران کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑا جاسکتا:

"...... فان الترادف فی اللغة قلیل، وما فی الفاظ القرآن فإما نادر وإما معدوم، وقل ان یعبر عن لفظ واحد بلفظ واحد یودی جمیع معناه بل یکون فیه تقریب لمعناه...... [۱۳] ومابعد آیت کریمہ میں نکاح کے لفظ کو دوسرے معانی میں لیے جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ متبادر ومعروف واصطلاحی معانی کو چھوڑ کر ایسے الفاظ ومعانی سے تعبیر کی جائے جو لفظ قرآنی کی مراد نہیں ہیں۔ متبادر ومعروف معنی ہی کو انھوں نے مراد الٰہی بھی قرار دیا ہے۔ لہٰذا نکاح سے جماع یا وطی مراد لینا صحیح نہیں ہے اور ایسا صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ پہلے ایک طے شدہ نظریہ یا خیال کے مطابق آیتِ کریمہ کا مطلب لیا اور بیان کیا جائے۔ اس رجحان نے متعدد آیاتِ کریمہ کے معانی کے ساتھ ظلم روا رکھا ہے اور ان میں مثال کے طور پر سورۂ روم: ۳۹ میں وارد لفظ ''ربوا'' کے اصل معنی سے ہٹا کر اپنے مزعومہ معانی کا لباس پہنانے کی سعی نامشکور ہے۔

۵۔ آیت کریمہ میں لفظ نکاح کے لغوی معنی وطی اور جماع کو مزید وسعت دے کر زنا تک لے جایا گیا۔ اس کا احاطہ صرف اپنے خاص افکار وتاویلات کے سبب کیا گیا ہے ورنہ آیتِ کریمہ سے اس کا استشہاد یا استنباط صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ بات اپنی جگہ صحیح ہے جیسا کہ مولانا مودودی نے مزاجِ شریعت کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے کہ ایسی عورت سے جس سے باپ یا بیٹے یا کسی دوسرے محرم کا جسمانی تعلق رہ چکا ہو اس کو نکاح میں لانا یا اس سے تعلقِ زن وشو قائم کرنا صریح بے حیائی ہے اور عقل اور شریعت، تہذیب وشرافت کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دیتے، صرف بے غیرتی، کجروی اور انحراف اجازت دیتا ہے بیسواؤں اور کسبیوں تک کے ضوابطِ تعلقات میں اس کا اہتمام رکھا جاتا تھا کہ اگر کوئی باپ کی منظورِ نظر رہ چکی تھی تو وہ اس کے بیٹے کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی۔ اب اگر کوئی ان اخلاق باختہ اور آبرو فروش عورتوں سے بھی زیادہ بے حیائی اور حرام کاری پر اترنا چاہے تو اس کے لیے پھر کوئی حد اخلاق ہی نہیں۔ وہ جانور سے بھی بدتر ہے بلکہ ابلیس بھی اس سے پناہ مانگے ہے۔

۶۔ ایک عمومی رجحان یہاں خاص میلان بن کر ابھرتا ہے اور وہ ہے پیش روؤں سے صرف اپنے مطلب کی بات لینا اور ان کے دوسرے آراء اور دلائل سے صرف نظر کرنا۔ زنا سے تحریم کے ثبوت میں بعض ائمہ کرام کا مسلک اور مفسرینِ عظام کا موقف تو نقل کیا گیا لیکن دوسرے منافی یا مخالف آراء ونظریات اور ان کے دلائل کو صاف نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ خالص جانب دارانہ تفسیر ہے۔ اس سے عام قاری کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ منقولہ اقوال کے حاملین کرام بھی اسی موقف کے قائل تھے حالاں کہ ان کا نقطۂ نظر قطعی دوسرا تھا۔ پوری بحث کا یہ موقع نہیں کہ طول کلام ہوگا۔ صرف امام رازیؒ کی بحث بر زنا سے تحریم کی طرف توجہ دلانا کافی ہے کہ نکاح سے جو مصالح وفوائد حاصل ہوتے ہیں وہ زنا سے نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس سے صرف تحریم/حرمت کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے جب کہ وصیت، وراثت، نسب وغیرہ کچھ نہیں ثابت ہوتا لیکن امام رازی سے یہ بحث نقل نہیں کی گئی اور نہ ان کا موقف بتایا گیا۔ بلا شبہ امام رازی کی تفسیر اس نکتہ پر سب سے محققانہ اور صحیح ہے۔[۱۵]

۷۔ آخری بات یہ ہے کہ متنِ قرآن کریم میں صرف الفاظ قرآنی کے معانی اور متبادر وظاہری معانی لینے چاہئیں اور معروف معانی سے اعراض نہیں کرنا چاہیے۔ پھر تعبیر و تشریح میں اپنا مسلک اور موقف ضرور بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس سے کیا کیا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ اور استنباطی مسائل وآراء اور تعبیرات پر ہی ہمیشہ اختلاف فقہاء ومفسرین رہا ہے۔ اور وہ صحیح بھی ہے کہ ہر شخص اپنے اصول وفہم کے مطابق استنباط کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر جو آیت مذکورہ میں نکاح المقت کے حوالے سے آیا ہے اختلافِ فقہاء سلف وخلف ملتا ہے۔ اور یہ بھی طے شدہ ہے کہ استنباطی تعبیرات حتمی اور قطعی نہیں ہوتیں۔ صرف مخصوص احکام قطعی ہیں اور ان پر اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح ہر ایک کے نزدیک حرام ہے اور کوئی کر لے تو باطل محض ہے۔ اس پر اجماع کلی ہے۔ زنا سے حرمت وتحریم کا معاملہ استثنائی ہے اور اس پر اختلاف ہے اور اختلاف والے اپنے اپنے اختلاف کو مانیں یا نہ مانیں وہ ان کی منشا ہے، مگر وہ یقیناً منشائے الٰہی اور منشائے شریعت نہیں ہے۔

# حواشی ومراجع


۱۔ امام ابن قتیبہ دینوری، کتاب المعارف، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ۱۱۲-۱۱۳: (تسمیہ من خلف امراۃ ابیہ بعدہ میں صرف سات خواتین کا ذکر ہے)

۲۔ شاہ عبدالقادر دہلوی، تفسیر موضح القرآن، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۳۶۵، ص ۷۸

۳۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، فتح الرحمان، بحوالہ پانچ ترجمہ والا قرآن مجید، اقبال پرنٹنگ پریس، دہلی، ب ت، ص ۱۰۸

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۶ء، (باراول) ۲/۴۴۴

۵۔ مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند، ۱۳۷۳، ۲/۱۰۷-۱۰۸

۶۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی)، صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ، ب ت، ۲/۳۰-۳۲

۷۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۲/۲۷۱-۲۷۲

۸۔ مولانا صلاح الدین یوسف حاشیہ برترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ، ص ص ۲۱۲-۲۱۳

۹۔ مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، مکتبہ مصطفائیہ، دیوبند، ب ت، ۲/۳۵۵-۳۵۸

۱۰۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۳، ۱/۳۳۵-۳۳۷

۱۱۔ امام ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۷، ۹/۲۲۸-۲۳۵؛ محمد یٰسین مظہر صدیقی، وحی حدیث، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

۱۲۔ امام قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، تحقیق عبدالرزاق المہدی، دارالکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۰م، الطبعۃ الثانیۃ، ۵/۹۹-۱۰۰؛ جلال الدین سیوطی وغیرہ، تفسیر جلالین، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۷۶، ص ۷۳

۱۳۔ امام رازی، التفسیر الکبیر، داراحیاء التراث الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۵، الطبعۃ الاولی، ۴/۹

۱۴۔ امام ابن تیمیہ، مقدمۃ فی اصول التفسیر، دمشق، ۱۹۳۶، ص ۱۱، نیز ظاہری معانی (متبادر) کے لیے ملاحظہ ہو محمد یٰسین مظہر صدیقی ''متن قرآن کریم: تشریح وتفسیر'' مشمولہ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن، شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۲

۱۵۔ التفسیر الکبیر، ۴/۲۱-۲۲


☆

# فہم قرآن میں عصری علوم سے استفادہ
## بیسوی صدی کا ایک تفسیری رجحان

وسیم احمد

ہر زمانے میں مفسرین نے کلام پاک کے معانی اور مطالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے زمانے کی علمی سطح اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے مطابق اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ عہد حاضر میں سائنسی علوم نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور اس کے زیر اثر ہونے والے نت نئے اکتشافات نے کائنات کے بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ ہٹا دیا ہے۔[1] چناں چہ آفاق و انفس کے بے شمار گوشے جو اس سے پہلے فہم انسانی کی گرفت سے باہر تھے، اب اس کی دسترس میں آچکے ہیں۔ ان علوم کی روشنی میں قرآن کریم کے معانی اور مفاہیم کو سمجھنے اور بہت سی آیات کے مطالب تک رسائی میں آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں اور قرآنی علوم و معارف کے بہت سے ایسے پہلو جو اس سے پہلے انسانی فہم سے باہر تھے ان کا سمجھنا اب آسان ہو گیا ہے۔ فہم قرآن کے میدان میں یہ بیسوی صدی کا ایک امتیازی پہلو ہے اور اس پہلو پر گزشتہ برسوں میں معتد بہ لٹریچر وجود میں آیا ہے۔ اس مضمون میں اس موضوع کے بعض گوشوں کے مطالعہ کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کردیا ہے (ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر. (القمر: ۱۷) اعجاز و بلاغت کے اعتبار سے یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے اور اس کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ ہر ذہنی سطح کے لوگ اس سے ہر زمانے میں دل و دماغ کو مطمئن کردینے والی رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ علوم و معارف کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے

جس کی نہ کوئی حد ہے نہ پایاں۔ چناں چہ جیسے جیسے علم ترقی کرتا جائے گا اس کے بہت سے ایسے گوشے سامنے آتے جائیں گے جو اس سے پہلے فہم انسان کی رسائی سے یکسر باہر تھے۔

سائنسی علوم کی روشنی میں قرآنی آیات کو سمجھنے کی ابتدائی کوششیں انیسویں صدی میں شروع ہوگئی تھیں۔ اس دور کے مخصوص حالات کے باعث مسلمان عوام کے درمیان بالعموم اور علماء کے درمیان بالخصوص مغربی علوم کی نسبت سے شدید ردعمل پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں مغربی علوم کی تحصیل کا احساس بڑھ رہا تھا اور اس کے نتیجے میں مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن ودماغ میں مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہورہے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ سائنس اور جدید عقلیات کی روشنی میں ان شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے اور جدید ذہن کی تشفی کا سامان فراہم کیا جائے۔ اس کی ابتداء بھی سرسید نے کی جو مسلمانوں میں جدید تعلیم کے سب سے بڑے داعی تھے۔

تہذیب الاخلاق میں چھپے سرسیدؒ کے مضامین اور بعد میں ان کی ''تفسیر القرآن'' انھیں کوششوں کے نتیجے میں سامنے آئیں۔ لیکن اس زمانے میں ایک طرف تو سائنسی علوم میں پختگی نہیں آئی تھی اور دوسری طرف ان علوم کا بیجا رعب عام طور پر ذہنوں پر طاری تھا۔ جس سے سرسیدؒ جیسے لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ اس لیے ان کی ''تفسیر القرآن'' جس کی انھوں نے بلاشبہ قوم کے نوجوانوں کو مغربی علوم کی مرعوبیت سے نکالنے اور قرآن واسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے تصنیف کی تھی، خود بھی اس مرعوبیت کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود وہ قبول عام حاصل نہ کرسکی۔

بعد میں جیسے جیسے سائنسی علوم میں پختگی آتی گئی ان کی طرف سے مسلمانوں کے ذہنوں سے شکوک وشبہات بھی دور ہوتے گئے۔ بیسوی صدی کے وسط میں مولانا وحیدالدین خاں کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج''[۲] اور مولانا عبد الباری ندوی کی ''مذہب اور سائنس''[۳] جیسی کتابیں شائع ہوئیں جن میں بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے ثابت کیا گیا کہ سائنس کی روشنی قرآن کی صداقت اور حقانیت کے باب میں شک پیدا کرنے کے بجائے اس کو اور واضح اور ثابت کرتی ہے اور اس کے بہتر فہم کی راہ ہموار کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سائنسی علوم جیسے جیسے ترقی کرتے جا رہے ہیں فہم قرآن میں مفید و معاون بنتے جا رہے ہیں اور صحیح معنوں میں قرآن کی آیت: **سنریھم ایتنا فی الأفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق (حم سجدہ: ۵۳)** کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔

قرآن کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جو زبان پر بہت آسانی سے جاری ہو جاتے ہیں اور یہ ہر زمانہ اور ہر دور کی علمی اور ذہنی سطح کے مطابق بنی نوع انسان کے دل و دماغ میں اپنا پیغام ہدایت پہونچا دینے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآن علوم کا سر چشمہ اور پوری انسانی تاریخ میں علم کا سب سے بڑا محرک اور مروج رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم کی ترقی اور پھیلاؤ اور اس کے نتیجہ میں ذہن و دماغ میں وسعت و کشادگی سے اسے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ قلب و نظر میں کشادگی اس کی پنہائیوں اور گہرائیوں کے بہتر ادراک کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور ذہن و دماغ میں وسعت جس طرح قرآنی تعلیمات کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ علوم میں کتنی ہی ترقی ہو جائے وہ قرآنی علوم کی انتہا تک نہیں پہونچ سکتے اور نہ ہی اس کی معنویت میں محدودیت کا احساس کر سکتے ہیں۔ ہاں ان کی مدد سے اس کے معانی و مفاہیم کی تہہ دار گہرائیوں اور پنہائیوں تک رسائی اور ان کے بہتر ادراک کی صلاحیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ آئندہ صفحات میں اس نوعیت کی بعض مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے اس نکتہ کی کسی قدر وضاحت ہوتی ہے۔

## انسان کی تخلیق سے متعلق چند آیات

قرآن کریم کی متعدد آیات انسان کی تخلیق کے ابتدائی مراحل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

**افرأیتم ماتمنون. اانتم تخلقونه ام نحن الخٰلقون (الواقعہ: ۵۸-۵۹)**

جس زمانے میں خلیوں کے اجزاء Chromosomes اور ان میں

Genetic Codes وغیرہ کی تفصیلات ہنوز علم میں نہیں آئی تھیں عام طور پر علماء اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے تھے۔[۲۹]

''کیا تم نے دیکھا کہ جو (نطفہ) تم ٹپکاتے ہو اس کو (انسان) تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں''۔ یعنی تـخلقونہ سے نطفے کو انسان بنانا مراد لیتے تھے۔ لیکن اب جب کہ یہ تفصیلات سامنے آچکی ہیں تو اس تکلف کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مٹی کے اجزاء جو غذا کی صورت میں انسان کے جسم میں پہنچتے ہیں ان سے مرد عورت کے نطفے کے خلیے Spermاور Ovum کا بنانا اور پھر انھیں جوڑ کر مخلوط نطفہ کا ایک مکمل خلیہ بنا دینا جس میں نئے بننے والے انسان سے متعلق ساری تفصیلات موجود رہتی ہیں، اللہ رب العالمین کی ایسی لطیف کاری گری ہے جسے اس احسن الخالقین کے علاوہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا اس لیے اس آیت میں تخلقونہ سے خود نطفے کی تخلیق مراد لینا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ عبد اللہ یوسف علیؒ اپنے انگریزی ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے۔

Do ye see ?The (Human Seed) that ye emit,Is it

ye who create it, or are we the creator?

یہ بات سورہ نجم میں اور زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ ارشاد ہے: ''هو اعلم بكم اذ انشاكم من الارض واذ انتم اجنة فى بطون امهتكم'' (النجم: ۳۲)

اس آیت میں بھی بہت سے علماء نے 'اذانشاکم من الارض' کا ترجمہ ''جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا'' کیا ہے اور اس سے آدمؑ کا زمین سے پیدا کیا جانا مراد لیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہاں بھی عام انسانوں کا زمین سے پیدا کیا جانا مفہوم کو بہتر طور پر ادا کرتا ہے۔

## انسان کے لیے زمین کو سازگار بنانے سے متعلق آیات

انسان کے رہنے بسنے کے لیے زمین کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح سازگار بنایا ہے

اس کو قرآن نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ سورہ ملک میں ارشاد ہے:

هو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه والیه النشور . (الملک:۱۵)

وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اسی طرف جی اٹھنا ہے۔

علم طبقات الارض کے جاننے والے کچھ بہتر اندازہ کر سکتے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کس طرح ہموار کیا ہے اور نہایت گرم اور سیال مادے (گول زمین کا اندرونی حصہ جو مستقل تیزی کے ساتھ حرکت بھی کرتا رہتا ہے) کے اوپر کس طرح ایک ہموار فرش بچھا دیا ہے۔ ارشاد ہے:

والارض فرشنٰها فنعم المٰهدون (الذریات:۴۸)

اور ہم نے زمین کو فرش کے طور پر بنایا سو ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔

پھر اس فرش کو سیال مادے کے اوپر مضبوط جمانے کے لیے پہاڑوں اور چٹانوں کے ذریعہ اس کو مضبوطی عطا کی تا کہ اندرونی مادے کی حرکت کی وجہ سے اوپری فرش بھی ہلنا نہ شروع کر دے۔

والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم وانهرا وسبلا لعلکم تهتدون (النحل:۱۵)

اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیے تا کہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے۔ اور اس نے نہریں اور رستے بنائے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

پھر اس فرش میں ہمارے ضرورت کی چیزیں رکھ دیں۔

وجعل فیها رواسی من فوقها وبٰرک فیها وقدر فیها اقواتها.
(حم سجدہ:۱۰)

اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنا دیے اور اس زمین میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں تجویز کر دیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

والارض مددنها والقينا فيها رواسی انبتنا فيها من كل زوج بهيج تبصرة وذكری لكل عبد منيب. (ق۷-۸)

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑوں کو جمایا، اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائیں۔ جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی کا ہر رجوع ہونے والے بندے کے لیے۔

بارش کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں اور وہ بارآور (Fertile) ہوجاتی ہے۔ ہوا کی نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ (CO2) وغیرہ ایسے اجزاء ہیں جو زمین کو بارآور (Fertilize) کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ بارش کے پانی میں گھل کر زمین میں پہنچتے ہیں۔ بجلی چمک کر نائٹروجن کو بادلوں کے پانی میں گھولتی ہے۔ آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ (CO2) بھی پانی میں گھل جاتی ہیں اور بارش کے ساتھ زمین میں پہنچتی ہیں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ومن آيته يريكم البرق خوفا وطمعا وينزل من السماء ماء فيحی به الا رض بعد موتها. ان فی ذالک لآيت لقوم يعقلون (الروم: ۲۴)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ اور آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وارسلنا الريح لواقح فانزلنا من السماء ماء فاسقينكموه . وما انتم له بخزنين. (الحجر: ۲۲)

اور ہم بھیجتے ہیں بوجھل ہوائیں، پھر آسمان سے پانی برسا کر وہ تمہیں پلاتے ہیں اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو۔ (ترجمہ: مولانا محمد جوناگڑھی)

اس ترجمے میں ''الریح لواقح '' کا ترجمہ 'بوجھل ہوائیں' کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اس کا ترجمہ 'بوجھل کرنے والی ہوائیں' زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اسی مفہوم کو اختیار کرتے ہوئے ''وارسلنا الریح لواقح '' کا ترجمہ 'اور ہم ہی ہواؤں کو بارآور بنا کر چلاتے ہیں' کیا ہے۔ ہوائیں ہی بادلوں کو اٹھا کر اتنے اوپر لے جاتی ہیں کہ وہاں پر بخارات (Vapors) جم جاتے ہیں اور بادل پانی سے بوجھل ہوجاتے ہیں۔ اس طرح 'الریح لواقح ' کا مفہوم بوجھل کرنے والی ہوائیں' بہتر طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اس کا ایک ترجمہ Winds Fertilizing بھی کیا گیا ہے۔[۵] حالاں کہ مترجمین نے یہاں بھی اس کا مفہوم (To fill heavily the clouds with water) لیا ہے لیکن Fertilizing سے زمین کو Fertile کرنے کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے اور یہ مفہوم اوپر دی گئی تشریح سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

اسی طرح زمین کو ایک خاص رفتار سے اس کے محور پر چلانا تا کہ رات اور دن ایک مناسب رفتار سے آتے جاتے رہیں، اس محور کو ایک خاص زاویے پر جھکا کر موسم اور ہواؤں کو بدلنے کا انتظام کرنا وغیرہ بے شمار ایسی حکمتیں ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارے کیے ہیں ان کی تشریح سائنسی علوم سے ہوتی ہے۔

ان فی خلق السموت والارض واختلف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحیابه الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریح والسحاب المسخر بین

بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات ودن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جوانسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام سے زمین میں ہر قسم کی

السماء والارض لآیت لقوم یعقلون. (البقرة: ۱۶۴)

جاندار مخلوق کو پھیلا دیتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور آسمان اور زمین کے درمیان مسخر بادلوں میں بے شمار نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

ان نشانیوں کی طرف قرآن نے واضح اشارے کر دیے ہیں۔ ان کی تفصیل میں جایئے تو احاطہ دشوار بلکہ ناممکن، ہاں اس نتیجہ پر پہونچنا آسان ہو جاتا ہے کہ:

قل لو کان البحر مداد لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی ولو جئنا بمثله مددا. (الکهف: ۱۰۹)

کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی (کی جگہ) ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے (اور باتیں احاطہ میں نہ آئیں) اگر چہ اس کی مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لیے ہم لے آئیں۔

## انسان کو زمین پر خلیفہ بنائے جانے سے متعلق چند آیات:

قرآن کریم میں حضرت آدمؑ کا قصہ کئی جگہوں پر بیان ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

"واذ قال ربک للملئکة انی جاعل فی الارض خلیفة قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم مالا تعلمون وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملئکة فقال انبئونی باسماء

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔ فرمایا بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور سکھلا دیے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا ان سب

هولاء ان كنتم صادقين قالو اسبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم قال یادم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انى اعلم غيب السموت والارض واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون"(البقرة: ۳۰-۳۳)

چیزوں کو فرشتوں کے پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو۔ بولے پاک ہے تو ہم کو نہیں معلوم مگر جتنا تو نے ہم کو سکھایا بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا اور حکمت والا ۔فرمایا اے آدم بتادے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام۔ پھر جب بتادیے اس نے ان کے نام فرمایا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

ان آیات میں غور کرنے کے بعد دو سوال خاص طور سے ذہن میں آتے ہیں:

پہلا سوال یہ آتا ہے کہ فرشتوں نے کس بنا پر کہا کہ "اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء"۔ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ انسان جسے اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ کی حیثیت سے پیدا کرنے والے ہیں وہ اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ مفسرین نے اس سوال کے متعدد جواب دیے ہیں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے ان سب کا احاطہ نہایت مختصر اور جامع انداز میں اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیونکر معلوم ہوا اس میں بہت سے احتمال ہیں۔ جنات پر قیاس کیا، یا حق تعالیٰ نے پہلے بتادیا تھا، یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا۔ یا سمجھ گئے کہ حاکم وخلیفہ کی ضرورت جبھی ہوگی جب ظلم وفساد ہوگا، یا حضرت آدمؑ کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں (جیسا کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ کو دیکھ کر کہا تھا کہ بھکول ہوں گے) اور ایسا ہی ہوا"[۶]

آج کل سائنس کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے بھی زمین پر بہت سے جانور رہتے تھے جن کا مادہ بھی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ معلوم ہے کہ جانوروں (مثلاً شیر، کتے، بندر وغیرہ) میں جنسی اور علاقائی بنیادوں پر لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ

بھی ممکن ہے کہ فرشتوں نے انھیں جانوروں پر قیاس کر کے سمجھا ہو کہ زمینی اجزاء سے بنا ہوا انسان بھی انھیں خصوصیات کا حامل ہوگا۔

دوسرا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ اسماء کا علم جو آدمؑ کو دیا گیا اس کی کیا حقیقت ہے اور کیا وجہ ہے کہ فرشتوں جیسی مقرب مخلوق اس علم میں آدمؑ کی برابری نہ کر سکی۔

عام طور پر علماء نے اسماء سے نام مراد لیے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو کن کے نام سکھائے ؟ اس سوال کے جواب میں دو قول قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں اور اس میں احساسات (Feelings) کے نام بھی شامل ہیں۔ ۷ دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد آدمؑ کی ذرّیت کے نام ہیں اور خاص کر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد مٹانے اور عدل قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔ ۸ اس سلسلے میں علماء کے دلائل ان کی تفاسیر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اکثر حضرات فرشتوں کے مقابلے میں انسان کو علمی اعتبار سے افضل مانتے ہیں۔ اس کی تائید قرآن و حدیث سے نہیں ہوتی۔ ۹

دراصل انسان کے علم اور فرشتوں کے علم میں بنیادی فرق ہے اور اس بنا پر کسی ایک کو دوسرے سے افضل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ دونوں کے علم و عمل کا میدان ان کے حالات اور دائرہ کار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ آیت میں اسماء سے مراد 'علامات' (Symbols) لینا آیت کے مفہوم میں زیادہ وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح جو مفہوم نام سے پیدا ہوتا ہے وہ بھی اس میں شامل رہتا ہے اور اس کی مدد سے انسان اور فرشتوں کے علم میں جو بنیادی فرق ہے اسے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ انسانی علم کی بنیاد 'علامات' (Symbols) کی پہچان ہے، اس کی طرف اشارہ قرآن کی آیت۔ الذی علم بالقلم. علم الانسان مالم یعلم (العلق:۴-۵) سے بھی ہوتا ہے کیوں کہ قلم سے (Symbols) ہی بنائے جاتے ہیں۔

انسان کے علم کی بنیاد مشابہتی استدلال (Approximate Logic) ہے۔ ۱۰ اسی بنیاد پر وہ Symbols کو پہچانتا ہے۔ فرشتوں کے دائرہ کار کا جو

علم ہمیں حاصل ہے اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ فرشتوں کے علم کی بنیاد قطعی استدلال (Exact Logic) ہے۔ دونوں کے فرق کو مثال کے ذریعہ بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک آسان مثال کمپیوٹر کی ہے جس میں صرف دو O' Symbols' اور '1' استعمال ہوتے ہیں۔ ان Symbols کو پانچ وولٹ (5 Volts) اور صفر وولٹ (0 Volts) سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اسے تصویر نمبر۔۱ میں دکھایا گیا ہے۔ ان کے درمیان 2.5 Volts کو حد فاصل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح اگر دوران علامت (Symbol duration) میں یہ 2.5 Volt سے زیادہ ہو تو '1' کو ظاہر کرتا ہے اور اگر اس سے کم ہو تو 'O' کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح اگر کسی وجہ سے علامت (Symbol) مسخ ہو جائے تو بھی ایک حد کے اندر اس کا پہچاننا آسان رہتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں تصویر نمبر ا میں پیش کی گئی ہیں اور وہیں ان کی مختصر وضاحت بھی کی گئی ہے۔

ان علامات ('O' اور '1') کو ظاہر کرنے کے لیے ایک دوسرا ذریعہ روشنی کو بنایا جاسکتا ہے۔ ایک نہایت چھوٹے سوراخ سے اگر کسی وقت میں روشنی ظاہر ہو تو اسے '1' اور نہ ظاہر ہو تو اسے 'O' سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بھی ظاہر ہونے والی روشنی کو '1' اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ ایک خاص مقدار سے زیادہ ہوتی ہے۔

انسان جس طرح علامات (Symbols) کو پہچانتا ہے وہ کمپیوٹر کے مقابلے میں کافی پیچیدہ ہے۔ علامات (Symbols) بھی بے شمار ہیں اور وہ کثیر الابعاد (Multi-dimensional) بھی ہوسکتے ہیں۔ یہاں بھی ایک آسان مثال حروف کو پہچاننے کی لی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے انگریزی حرف N کو لیا جاسکتا ہے اس میں صرف تین عناصر (Elements) استعمال ہوتے ہیں۔ تصویر نمبر ۲ میں صرف ایک عنصر کو اپنی جگہ سے ہٹایا گیا ہے جس میں ایک حد تک تو اسے N کی حیثیت سے پہچانا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد یہ H سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان جو علامات (Symbols) کو مشابہتی استدلال approximate logic کی بنیاد پر پہچانتا ہے۔ ایک حد کے اندر مسخ شدہ علامات کو پہچان لیتا ہے، جن علامات کی اسے پہچان

کرائی گئی ہے، مسخ شدہ علامت کو ان میں سے جس علامت سے زیادہ قریب پاتا ہے اسی حیثیت میں اس کی پہچان کر لیتا ہے۔ لیکن فرشتہ جس کے علم کی بنیاد قطعی استدلال (Exact logic) ہے اگر کسی علامت کو اس کی قطعی (Exact) صورت سے ذرا بھی مختلف پائے گا تو کہہ دے گا کہ یہ وہ علامت (Symbol) نہیں ہے جو ہمیں بتائی گئی ہے۔ اس سے ملائکہ کا جواب یعنی "قالو اسبحانک لاعلم لنا الا ماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم" (البقرۃ: ۳۲) بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ علامات (Symbols) میں مشابہت (Approximation) کا پہلو موجود رہتا ہے۔

اس پس منظر میں انسان اور ملائکہ کے دائرہ کار کا مسئلہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فرشتوں کو اللہ کی طرف سے بلا واسطہ احکامات و پیغامات ملتے ہیں اور انھیں غلطیوں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کا علم بھی قطعیت (Exactness) کی بنیاد پر ہے۔ انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہے جس کے لیے اسے فرقان اور میزان عطا کی گئی ہے لیکن اسے فتنہ و فساد کے ماحول میں کام کرنا ہوتا ہے اس لیے اسے ایک حد کے اندر ارادہ واختیار کی آزادی دی گئی ہے اور اس کے دائرہ کار کے مطابق اسے مشابہتی استدلال (Approximate Logic) کی سہولت مرحمت کی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی حدود قائم کردی گئی ہیں یعنی فرقان ومیزان جو کتب الٰہی میں اسے عطا کی گئی ہیں۔ گویا علامات (Symbols) کی پہچان ایک علامتی امتحان تھا جس کے ذریعہ خلیفہ کی حیثیت میں کام کرنے کے لیے جن بنیادی صلاحیتوں کی ضرورت تھی انھیں ظاہر کیا گیا۔

علامات (Symbols) کی پہچان کو ہی آگے بھی اولاد آدم کے لیے علم کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس کی طرف قرآن کی آیات **علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم** (العلق: ۴-۵) اشارہ کرتی ہیں۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ حروف خواہ کسی بھی زبان کے ہوں بنیادی علامات (Symbols) ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قطعی استدلال (Exact Logic) کی بنیاد پر جو علم فرشتوں کو حاصل ہوتا

ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن مشابہتی استدلال (Approxmate Logic) کی بنیاد پر انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو اخذ کرنے اور پھر نقل (Reproduce) کرنے میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے تحت واقع ہوتا ہے اس لیے اس کی خرابیوں سے انسان کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ قایم فرمایا اور کتابیں نازل فرمائیں یہ سلسلہ حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوا جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں عظیم ترین کتاب عطا کی اور ہر اعتبار سے اس کی حفاظت کا اہتمام فرمایا جیسا کہ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون (الحجر: ۹)

زمین پر خلیفہ کی حیثیت سے کام کرنے میں مشابہتی استدلال (Approximate Logic) کی ضرورت کی وضاحت کے بعد خلیفہ کی ایک دوسری اہم خصوصیت کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ یہ عظیم صلاحیت اللہ کی دی ہوئی توفیق سے آدمؑ کی توبہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔[۱۱] اس صلاحیت کی اہمیت کا اندازہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ہوتا ہے۔[۱۲] کسی غلطی کے بعد توبہ کر لینے سے بندہ اللہ کی رحمت سے ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے وہ غلطی کی ہی نہ ہو۔ سورہ توبہ میں رب کریم نے اپنے اچھے بندوں کی کچھ اعلیٰ صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔[۱۳] ان میں پہلی صلاحیت 'التئبون' (توبہ کرنے والے) ذکر فرمائی اور آخری صلاحیت 'الحفظون لحدود اللہ' (اللہ کے حدود کا خیال رکھنے والے) بیان کی ہے۔ زمین پر خلیفہ کی حیثیت میں کام کرنے کے لیے ان دونوں صلاحیتوں کی اہمیت اور ضرورت بالکل واضح ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان، زمین اور پہاڑ وغیرہ سبھی Exact Logic کی بنیاد پر کام کرتے ہیں یعنی اپنے خالق کی دی ہوئی ہدایت سے ذرا بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ (ربنا الذی اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدی) انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی دے کر اس کی حدود بتا دی گئیں اور ان حدود کے اندر رہ کر احکامات کی پابندی کی ہدایات دی گئیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ مشابہتی استدلال (Approximate

(Logic کی سہولت ہی تھی جس کی وجہ سے انسان ان حالات میں کام کرنے کا مکلف ہوا۔ اس کی طرف سورہ احزاب کی آخری آیات اشارہ کرتی ہیں۔ ارشاد ہے:

**انا عرضنا الا مانة على السموت والارض والجبال فابين ان يحملنها واشفقن منها و حملها الانسان انه كان ظلوما جهولا ليعذب الله المنفقين والمنفقت والمشركين والمشركت . ويتوب الله على المؤمنين والمؤمنت وكان الله غفورا رحيما.**

منافقین ومشرکین کو عذاب دینے اور مومنین کی توبہ قبول کرنے کی علت تصویر نمبر ا میں دی گئی تفصیلات سے واضح ہوتی ہے۔ جہاں Approximate Logic کی روشنی میں غلطیوں کے امکانات اوران کی نوعیت واضح کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ 'فعال لما یرید' تو اللہ کی ذات ہے۔ انسان کو ارادہ واختیار کی جو آزادی اللہ نے دی ہے اس کے حدود بھی اس نے متعین کردیے ہیں ان حدود کا خیال نہ کر کے اگر انسان من مانی کرنے لگے تو گویا اس نے اپنی خواہشات کو اپنا الٰہ بنالیا اور یہ شرک ہے۔

**فتبارك الله احسن الخالقين**

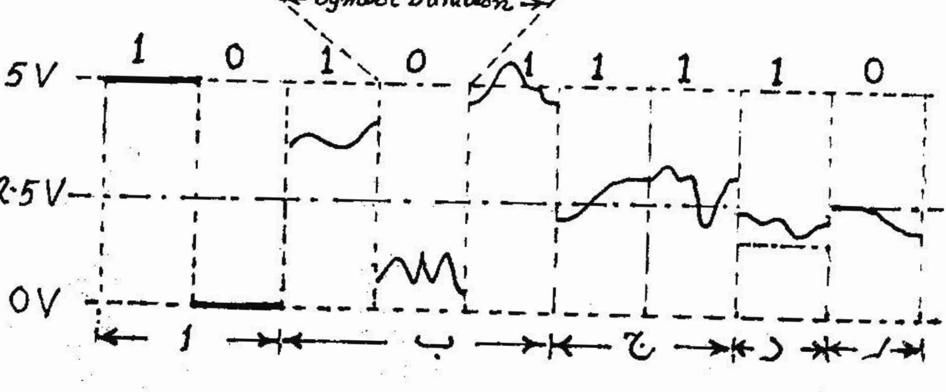


تصویر نمبر ا: 'O' اور '1' علامات اوران کی حدود

(الف) علامات (Symbols) جنھیں قطعی استدلال (Exact Logic)

اور مشابہتی استدلال (Approximate logic) دونوں کی بنیاد پر پہچانا جاسکتا ہے۔

(ب) علامات (Symbols) کی مسخ شدہ شکلیں جنھیں صرف مشابہتی استدلال (Approximate Logic) کی بنیاد پر پہچانا جاسکتا ہے۔

(ج) ان علامات (Symbols) کا غالب حصہ '1' کی طرف ہے لیکن ایک چھوٹا حصہ 'O' کی طرف بھی ہے اب اگر پورے Symbol کو ذہن میں نہ رکھ کر صرف تھوڑے سے حصے کو دیکھ کر فیصلہ کرلیا جائے تو اس میں غلطی کا امکان رہے گا۔ یہ غلط فیصلہ اگر دانستہ طور پر غلط نتیجہ نکالنے کے لیے یا کسی طاغوتی اثر کے تحت کیا جائے تو ظلم و جہالت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اگر نا دانستہ طور پر کیا جائے تو محض ایک غلطی ہوگی جو مشابہتی استدلال (Approximate Logic) کی کمزوری کی وجہ سے واقع ہوگی۔ احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ پورے Symbol کو بغور دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

(د) حد فاصل ہی اپنی جگہ سے ہٹ جائے (یا ہٹادی جائے) یا غیر واضح ہو یا مسخ ہو جائے تو غلط فیصلہ کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس صورت میں صحیح فیصلہ کے لیے Symbol کا اپنی قطعی پوزیشن (Exact Position) کے قریب تر ہونا زیادہ ضروری ہے۔

(ر) اس صورت میں Symbol کا ایک حصہ ایسا ہے کہ اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دوسرا حصہ 'O' کی طرف ہے اس لیے یہ 'O'Symbol کو ظاہر کررہا ہے۔ اس کی ایک مثال بغیر اعراب کے الفاظ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ مثلاً 'اس' سے This اور That دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں اور صحیح فیصلہ سیاق وسباق کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

تصویر نمبر۲: N یا H کے ایک عنصر (Element) کے اپنی جگہ ہٹنے کی مختلف شکلیں۔

## حواشی و مراجع

۱۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

**وان من شیء الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (الحجر: ۲۱)**

اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب خزانے (کے خزانے) ہیں اور ہم اس (چیز) کو ایک متعین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں۔

سائنسی علوم اور ان کی ترقی کو بھی اسی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔علم کے خزانے میں سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کی ضرورت، ان کی کوشش اور ان کی صلاحیت کے مطابق جتنا چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔

۲۔ مولانا وحید الدین خاں ''مذہب اور جدید چیلنج'' مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی۔ باراول ۱۹۶۶ء

۳۔ مولانا عبد الباری ندوی ''مذہب اور سائنس'' مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔ باراول ۱۹۷۱ء

۴۔ ملاحظہ فرمائیں مولانا اشرف علی تھانویؒ ترجمہ قرآن کریم مع مختصر حواشی' مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''تفہیم القرآن' مولانا امین احسن اصلاحیؒ تدبر قرآن۔

۵۔ "Translation of the meanings of the NobleQuran" by Dr. Mohammad Taqi-ud-din Al-Hilali and Dr.Mohammad Mohsin Khan, King Fahd Complex for the Printing of the Holy Quran, Madinah, KSA.

۶۔ القرآن الکریم (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن وتفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی) مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ المنورۃ۔ (نوٹ: تفسیر میں سورہ بقرہ اور سورہ نساء کے حواشی مولانا محمود حسن کے ہیں)

۷۔ تلخیص تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (مرتبہ: مولانا صدرالدین اصلاحیؒ) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۳۰، مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن، ربانی بک ڈپو،

دہلی، ۱۹۹۱، جلد اول، ص ۱۲۲-۱۲۴۔

The Holy Quran- The English Translation and Commentary by Abdullah Yusuf Ali, Revised and Published by King Fahd Complex for the Printing of the Holy Quran, Madinah, pp.15-16

۸۔ امین احسن اصلاحیؒ، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۵، جلد اول، ص ۱۶۰-۱۶۱

۹۔ حوالہ سابق، ص ۱۶۴-۱۶۵، صحیح بخاری جلد ۹، حدیث نمبر ۵۰۲

۱۰۔ S.K. Pal and D.P. Mandal,"Fuzzy Logic and Approximate Reasoning: An Overview" Journal of the IETE (Special Issue on Pattern Recognition) 1991, Vol.37, No.5-6 , P. 548.

۱۱۔ سورہ بقرہ: ۳۷، سورۃ الاعراف: ۲۲-۳۳، سورہ طہٰ: ۱۲۱-۱۲۲۔

۱۲۔ سورہ بقرہ: ۲۲۲، النساء: ۱۴۶، مریم: ۶۰، الفرقان: ۷۰-۷۱۔

۱۳۔ سورۃ التوبۃ: ۱۱۱-۱۱۲۔

☆

# اسلامی نظریۂ کائنات
## وحدتِ مشیت و رضا

محمد ریاض کرمانی

عام مذہبی معاشروں کا مشترکہ عقیدہ ہے کہ کائنات اپنے خالق کی مشیت سے وجود میں آئی ہے اور خالق اس کائنات میں جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسلام میں بھی یہ عقیدہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اسلام میں اس کائنات کے ہر مظہر کے پیچھے اصل قوت اللہ کی مشیت اور اس کی اجازت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسانی اعمال بھی صرف اس وقت موثر ہوتے ہیں جب مشیّتِ الٰہی کی مدد و نصرت شامل حال ہو اور اُدھر سے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اس عقیدے پر یقین کرنا جس قدر آسان ہے اسی قدر مشکل اس کو سمجھنا ہے، لیکن مذہب میں اس کی اہمیت اور اسلامی علمی جدّ و جہد میں اس کی شدید ضرورت کے پیشِ نظر ذیل میں اس عقیدے کو وحی اور عقل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

### ۱۔ نظامِ مشیت

مشیّت شآء کا مصدر ہے اور شآءَ کے معنی ہیں اُس نے چاہا۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ کے بہت سے مشتقات استعمال ہوئے ہیں جن سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیّت محیط ہے اور کُل کائنات میں اس کا عمل دخل ہے[1]۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے اور اس کے بارے میں کُــن کہتا ہے وہی کچھ ہو جاتا ہے[2]۔ چنانچہ ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ کل کائنات ایک نظامِ مشیّت ہے اور دنیا کی ہر شئ کو مشیّت کی ایک نوع کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً مشیت - الشمس، مشیت - القمر، مشیّت - الناس، مشیّت - الوَحی اور مشیّت - التجر بہ وغیرہ۔ اللہ کی مشیت مختلف اشیاء کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو منظم کائنات میں مربوط پائی

جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم کائنات کو ایک مکمل نظام مشیت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور پھر اس کی مختلف اشیاء کو ذیلی مشیتوں کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کائنات بحیثیت مجموعی نظامِ مشیت ہے تو کہکشائیں اس کے ذیلی نظام ہیں۔ پھر اُن کے ذیلی نظامہائے شمسی ہیں، جن کے ذیل میں ہمارا نظامِ شمسی، پھر اسکے مختلف سیارے وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ بالا مثالیں مادّی مصنوعات سے ہیں، مگر مشیت غیر مادّی مصنوعات مثلاً روح، عقل، قوت، ملائکہ اور جن وغیرہ کی صورت میں بھی موجود ہے۔ غیر مادّی مشیت سے بھی ماوراء منتزع یا مجرد مشیّت ہے جو دراصل اللہ کی صفت ہے جو فرض کیجئے کہ اللہ میں نہ ہوتی تو وہ کوئی چیز وجود میں ہی نہ لاتا۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ چیزیں وجود میں لاتا ہے اور اتنی بڑی کائنات ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے تو پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہے کہاں؟ جہاں تک منتزع مشیّت کا معاملہ ہے تو اس کے لئے اس قسم کے سوال کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، کیونکہ وہ تو اللہ کی صفت ہے اور اس لحاظ سے وہ اللہ کے وجود میں اسی طرح شامل ہے جس طرح اس کی صفت رحمت و تخلیق شامل ہے۔ اس لئے اس کے لئے کسی مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر مادّی اور غیر مادّی مصنوع مشیّت کے قیام و عمل کے لئے مکان کی ضرورت بہر حال ہے۔ کیا یہ مکان اللہ کی ذات سے باہر ہے؟ یہ ممکن نہیں کیونکہ اللہ کی ذات بے انتہا ہے۔ کیا مصنوع مشیّت اللہ کی ذات میں گھلی ملی ہے؟ اس کا امکان بھی نہیں ہے کیونکہ صورتیں اللہ کی ذاتی قربت کو برداشت نہیں کر سکتیں ۳۲، اب ایک ہی امکان باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اشیا کی تخلیق یعنی اپنی مشیت کو صورتوں میں ڈھالنے اور ان صورتوں کو عمل پر لگانے کے لئے خود اپنی ذات میں وسیع خلاء قائم کرے۔ اس خلاء کو ہم عدم کہتے ہیں۔ یہی وسیع ترین عدم ہے جس کو ہم دوسرے الفاظ میں معمل مشیت کہہ سکتے ہیں جو اللہ کے انتہائی قرب کو برداشت کر سکتا ہے۔ عدم ہی ایسا مکان ہے جو اللہ کی تخلیقی عمل کا مقام ہو سکتا ہے اور جو مادّی اور غیر مادّی مصنوع مشیت سے کئی گنا بڑا ہے۔ چنانچہ اللہ کی مشیّت خواہ وہ غیر مادّی یا مادّی صورتوں میں ہو یا صرف عملی سطح پر پائی جائے، دراصل عدم ہی میں کام کرتی ہے۔ اب تک کی گفتگو کے نتیجے میں

اللہ کی مشیّت کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں۔

ا۔ منتزع مشیّت : یعنی مجرد، بے شکل مشیّت جو اللہ کی صفت ہے اور جس کی وضاحت شَآءَ، اراد، قضٰی، امر اور اذن جیسے الفاظ سے ہوتی ہے۔

۲۔ معمل مشیّت : یعنی عدم، خلاء، مکان، عمل گاہ یعنی اللہ تعالیٰ کا میدانِ کار۔

۳۔ مصنوع مشیّت :

(ا) غیر مادّی : مثلاً روح، عقل قوت، ملائکہ، اجنّہ۔

(ب) مادّی : یعنی ہمارے گردوپیش اور زمان ومکان میں موجود قابلِ مشاہدہ کائنات جس میں ہم خود بھی شامل ہیں۔

مذکورہ بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ صرف پہلی قسم یعنی منتزع مشیّت پر ہی لفظ مشیّت کا لغوی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ باقی اقسام منتزع مشیّت کا خَلْقی سطح پر اظہار ہیں۔ بہر حال بالکل اسی طرح جس طرح مجرد حسن مصنوع حسن کے تعلق سے ہی سمجھ میں آتا ہے اسی طرح منتزع مشیّت کو مصنوع مشیّت کے ذریعہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اب خواہ یوں کہا جائے کہ ہر مخلوق اس کی مشیّت سے ہے یا یوں کہا جائے کہ ہر مخلوق اس کی مشیّت ہے، اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کسی چیز کے موجود یا غیر موجود ہونے میں مشیّت ہی اصل ہے جسے کسی حال میں بھی لاتعلق نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا مذکورہ بالا تینوں اقسام کی تفہیم بہت ضروری ہے۔

## ۱.۱. منتزع مشیّت کا نظام

منتزع مشیّت اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کے تعلق سے مکمل طور سے قابلِ فہم نہیں ہوسکتی۔ البتہ بشری سطح پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کچھ بنانا اور کچھ بننا چاہتا ہے۔ انسانی سطح پر یہ چاہنا جذبات کی ایک قسم ہے جو کچھ کرگزرنے کے لئے ایک بیج کی طرح کام کرتی ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ انسان کی بہت سی مشیّتیں پوری نہیں ہوتیں، وہ بس دل میں پیدا ہوتی ہیں اور درد دے کر چلی جاتی

ہیں۔ چنانچہ یہ بشری مثال اللہ کی مشیّت کا اندازہ کرنے کے لئے محض ایک علامت ہے۔ اللہ کی مشیّت کوئی جذبہ نہیں ہے بلکہ یہ ہمیشہ عمل میں آتی ہے اور تاثیر پیدا کرتی ہے۔

اللہ کی منتزع مشیّت میں تمام مؤثر قوتیں مثلاً ارادہ، امر، اذن، تسخیر، تقدیر اور تدبیر خالص اور کامل ہوتی ہیں جو علم کی بے انتہار روشنی میں عمل درآمد کرتی ہوئی واقعات کو گرفت میں رکھتی ہیں۔ اللہ نے اپنی منتزع مشیّت کو اپنی مخلوق کی نسبت سے کس انداز سے واضح کیا ہے اس کو سمجھانے کے لئے ذیل میں کچھ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں۔

## ۱.۱.۱. منتزع مشیّت اور تخلیق

| | |
|---|---|
| ۱۔ لِلّٰہ ملکُ السموات والارض یخلق مایشآء یھب لمن یشآء اناثا ویھب لمن یشآء الذکور. (الشوریٰ:۴۹) | اللہ زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ |
| ۲۔ وربک یخلق مایشآءُ ویختار ما کان لھم الخیرۃ سبحان اللہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ (القصص:۶۸) | تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور وہ (خود ہی اپنے کام کے لئے جسے چاہتا ہے) منتخب کرلیتا ہے، یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے اللہ پاک وبرتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ |
| ۳۔ واللّٰہ خَلَقَ کل دابۃٍ مِّنْ مآء فمنھم من یمشی علیٰ بطنہ ومنھم من یمشی علیٰ رجلین و منھم من یمشی علیٰ اربع یخلق اللہ مایشآء ان اللہ علی کل شیٔ قدیر. (النور:۴۵) | اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ |

## ۱.۱.۲. منتزع مشیّت اور فطری افعال

| | |
|---|---|
| ۱۔الم تر الی ربک کیف مدّ الظلّ ،ولو شآءَ لَجعَله ساکناً ج ثمّ جعلنا الشّمسَ علیہِ دلیلاً (الفرقان:۴۵) | تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے۔اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنادیتا۔ہم نے سورج کو اُس پر دلیل بنایا۔ |
| ۲۔ وینزّلُ مِنَ السَّمَآءِ من جبالٍ فیھا من بردٍ فیُصیبُ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَصْرِفُہٗ عن مَنْ یَّشَآء (النور:۴۳) | اور وہ آسمان سے اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں ، اولے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان سے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے۔ |

## ۱.۱.۳. منتزع مشیّت انسان کی تخلیق

| | |
|---|---|
| ۱۔ھو الّذی یُصَوِّرُکمَ فی الارحامِ کیفَ یَشَآءُ لاَ اِلٰہَ الاّ ھو العزیز الحکیم (آل عمران : ۶) | وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے۔ اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ |
| ۲۔قالَ ربِّ انّٰی یکونُ لِی غلامٌ وقد بَلَغَنِیَ الکِبَرُ وَامراتِی عاقر قالَ کذالِک اللّٰہُ یَفعَلُ مَایَشآء (آل عمران : ۴۰) | زکریا نے کہا پروردگار بھلا میرے یہاں لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ جواب ملا ایسا ہی ہوگا۔اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ |

۳۔ قالت ربِّ انّٰی یکونُ لِی وَلَدٌ ولم یمسسنی بَشَرٌ قالَ کذالِک اللّٰہُ یخلُقُ مَایَشَآءُ اذا قضٰی اَمراً فاِنّما یقولُ لَہٗ کن فیکون (آل عمران : ۴۶)

مریم بولی پروردگار میرے یہاں بچہ کہاں سے پیدا ہوگا، مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جواب ملا ایسا ہی ہوگا اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔

## ۴.۱.۱ منتزع مشیّت اور انسانی اختلافات

۱۔ وَلَوشَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّةً وَّاحدةً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِی مَاآتکم فاستبِقُوا الخیرات (المائدہ: ۴۸)

اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اُس میں تمہاری آزمائش کرے لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔

۲۔ وَلوشَآءَ اللّٰہُ مااقتتَل الّذِین من بعدھم من بعد مَا جَاءَ تھم البینٰتُ ولکنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْھُمْ مَن آمنَ وَمِنْھُمْ مَنْ کَفَرَ وَلوشآءَ اللّٰہُ مَااقتَتَلُوا وَلکنَّ اللّٰہَ یَفْعَل مَا یُرید (البقرہ : ۲۵۳)

اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے۔ مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

## ۵.۱.۱ منتزع مشیّت اور انسانی علم

۱۔وعلَّم آدمَ الاسْمَآءَ کلّھا (البقرۃ : ۳۱)

اللہ نے آدم کو سارے نام سکھا دیئے۔

٢۔ فَتَلَقّٰی آدَمُ مِن رَّبِّہٖ کلماتٍ فتابَ علیہِ اِنَّہٗ ھو التوّابُ الرحیم (البقرہ : ٣٦)

آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کرتوبہ کی جس کواس کے رب نے قبول کرلیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اوررحم فرمانے والا ہے۔

٣۔ یَعْلَمُ مَابَینَ ایدیھم وَمَا خَلْفَھُمْ وَلاَ یُحیطُونَ بِشَیۡءٍ مِنْ عِلْمِہٖ اِلاّ بِما شَآءَ (البقرہ: ٢٥٥)

جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفت اورادراک میں نہیں آسکتی الّا یہ کہ کسی چیز کاعلم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے۔

## ٦.١.١. اللہ کی منتزع مشیّت اور دنیا میں انسان کی مشیّت

١۔ اِنَّکَ لاتھدی مَن اَحْبَبْتَ ولٰکِنَّ اللّٰہَ یھدی مَنْ یَّشَآء (القصص:٥٦)

اے نبی تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔ مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

٢۔ اِنَّ ھٰذِہٖ تذکرہ فَمَنْ شَآءَ اتَّخذَ اِلٰی ربّہٖ سبیلاً وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلاّ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہ (الدھر : ٢٩-٣٠)

یہ ایک نصیحت ہے اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔ اورتمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔

٣۔ ان ھو الاّ ذکر لّلعٰلَمین لِمن شَآءَ منکم اَنْ یَّستَقِیم وَمَاتَشَآؤنَ اِلاّ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ربُّ العٰلَمینَ.
(التکویر: ٢٧-٢٩)

یہ تو سارے جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے تم میں سے ہراس شخص کے لئے جوراہِ راست پر چلنا چاہتا ہو۔ اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔

## ۷.۱.۱ اللہ کی منتزع مشیّت اور آخرت میں انسان کی مشیّت

۱۔ لایسمعونَ حَسیسها وهم فی مَااشْتَهتْ اَنْفُسُهم خَالِدون (الانبیاء: ۱۰۲)

وہ (جنت میں) جہنم کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ اپنی مَن بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے۔

۲۔ وَقالُو الحمدُ لِللّٰهِ الّذي صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاورَثنَا الارضَ نتبوّاُ من الجنة حیثُ نَشآء (الزمر: ۷۴)

اور وہ کہیں گے شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا۔ اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔

۳۔ ولکم فیها مَا تَشتهِی انفسُکم ولکم فیها مَا تدّعون. (حٰم السجدہ: ۳۱)

وہاں جو کچھ تم چاہو گے وہ تمیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ بھی تمہاری ہوگی۔

۴۔ وقال الذینَ فِی النّارِ لِخزَنَةِ جَهنَّمَ ادْعوربّکم یُخَففْ عنَّا یوماً مِن العذاب . قالُوا أوَلَمْ تک تاتیکم رُسُلَکُمْ بِاالبَیِّنٰتِ قالُوا بلٰی قالُوا فاذْعُوا وَمَادُعَاءُ الکٰفرینَ اِلاّ فِی ضللٍ (المومن: ۴۹-۵۰)

پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہلکاروں سے کہیں گے ”اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کردے“۔ وہ پوچھیں گے ”کیا تمہارے پاس رسول بیّنات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟ وہ کہیں گے ”ہاں“ جہنم کے اہلکار بولیں گے ”پھر تو تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دعا اکارت جانے والی ہے“

مذکورہ بالا آیات سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ کل کائنات اللہ ہی کی ہے۔ چاند، سورج، ستارے اور ان کی حرکت اللہ کی مشیّت ہی سے قائم ہیں۔ ہواؤں کی رفتار اور رخ، پانی کا دورانیہ، بارش کا وقت اور مقام اللہ کی مشیّت ہی طے کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا وجود ہمارے تمام تر اختلافات کے ساتھ اللہ کی مشیّت ہی سے ہے۔ اللہ کی مشیّت

کے بغیر ہم علم بھی حاصل نہیں کر سکتے ۔ موجودہ نظم کائنات میں ہماری اپنی مشیّت موجود تو ہے مگر وہ بھی اللہ کی مشیّت کے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتی ۔ مذکورہ آیات کی روشنی میں ہم درج ذیل نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی منتزع مشیّت اصل الاصول ہے۔

۲۔ کل مخلوق اللہ کی منتزع مشیّت کی صنعت گری کا نتیجہ ہے۔

۳۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ کوئی اور تنظیم بھی ہو سکتی تھی ۔ اللہ جب چاہے گا اس کو دوسرے انداز سے منظّم کر دے گا۔

۴۔ مخلوق ہونے کی وجہ سے انسانی مشیّت بھی اللہ کی مشیّت ہی سے ہے۔

۵۔ موجودہ تنظیم میں انسان کی مشیّت کا محدود اختیار کُل تنظیم کے مناسب کرنے کے لئے خدائی ہدایت کی ضرورت ہے جس میں انسان کا امتحان ہے۔

۶۔ اگر انسان اپنی مشیّت کو کل تنظیم کے مناسب نہیں کرتا تو خود ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ تنظیم بہر حال اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔

۷۔ اللہ کی مشیّت کے اصل الاصول ہونے کے لحاظ سے ہر واقعہ اللہ کی مشیّت ہی کا ایک رخ ہے خواہ وہ انسانی نقطۂ نظر سے بہت قیمتی ہو یا معمولی، حسین ہو یا کریہہ النظر، بہترین ہو یا بدترین ۔ مشیت الٰہی ہونے کے لحاظ سے ہر چیز اپنی جگہ صحیح، درست، مناسب، عمدہ اور حسین وجمیل ہے۔

اب ہم ایسے الفاظ پر گفتگو کرتے ہیں جو معنی اور مفہوم میں لفظ مشیّت کے قریب تر ہیں تاکہ قرآن مجید کی روشنی میں مشیّت کے مکمل مفہوم کی وضاحت ہو سکے۔

### ۸.۱.۱ منتزع مشیّت اور ارادہ

اکثر مشیّت اور ارادہ کو مترادف کی حیثیت دی جاتی ہے، قرآن مجید میں بھی ایسے کئی مقامات ہیں جہاں ایک ہی آیت میں یہ دونوں الفاظ مترادف کے بطور استعمال ہوئے ہیں ۔ (۲:۲۵۳، ۱۷:۱۸، ۴:۳۹)۔ بعض آیتوں میں لفظ ارادہ استعمال ہوا ہے مگر

اس سے مشیّت کا مفہوم واضح ہوتا ہے (۱۳:۱۱، ۳۳:۱۷، ۱۶:۸۵)۔ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے جیسے مشیت اور ارادہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے یعنی ارادہ بھی مشیت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔

البتہ بعض دوسری آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارادہ مشیّت کے مقابلے میں کم یقینی ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مشیّت تو ہر حال میں پوری ہو کر رہتی ہے لیکن ارادہ کبھی تو مشیّت کی طرح پختہ ہوتا ہے اور کبھی مشروط۔ مشروط ارادے کی مثالیں ہم کو قرآن کی سورہ ۲ آیت ۱۸۵، سورہ ۴ آیت ۲۸، سورہ ۵ آیت ۶/اور سورہ ۴۰ آیت ۳۱ میں ملتی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی نہیں۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، اللہ تم پر زندگی کو تنگ کرنا نہیں چاہتا۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ان تمام آیات میں دینی تعلیم اور شرعی احکام زیر بحث ہیں جو حقیقت یہ ہے کہ نرمی، سہولت اور آرام سے پُر ہیں اور ان تعلیمات پر چلنے سے انسانیت کو فائدہ ہوتا ہے۔ بہرحال شریعت کے ذریعہ انسانیت کو سہولت اور فائدہ پہنچانے کا ارادہ خود انسانوں کے شریعت پر چلنے سے مشروط ہے۔ اس ارادہ کو ہم معلّق یا مشروط ارادہ کہہ سکتے ہیں۔ امام راغب نے مشیّت اور ارادہ پر متکلمین کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے جس سے دونوں کے درمیان دقیق فرق واضح ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئۃ بالکل ارادۃ کی طرح ہے۔ اور بعض کے نزدیک مشیئۃ نام ہے اصل میں کسی شئ کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا گو عرف میں اس کا استعمال ارادہ کی جگہ ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشیئۃ کے معنی ایجاد کرنے کے ہیں اور لوگوں کی طرف سے مشیّت کے معنی چاہنے کے ہیں۔ ان (متکلمین) کا بیان ہے کہ (کسی شئ سے متعلق) اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ اُس شئ کا وجود عمل میں آجائے۔ اور اللہ کے ارادہ کا ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ مراد لامحالہ وجود پذیر ہو کر ہی رہے، دیکھتے

نہیں ارشاد ہے یُرید اللّٰہ بکم الیُسر ولا یرید بکم العسر (اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) اور وَمَا اللّٰہُ یُرِیدُ ظُلماً للعباد (اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر) حالانکہ یہ معلوم ہے کہ کبھی کبھی تنگی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے مابین ظلم بھی۔

انسانی ارادہ کبھی کبھی بغیر ارادۂ الٰہی کے بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ اُس سے ابا فرماتا ہے۔ لیکن مشیّت انسانی بغیر مشیّت الٰہی کے وجود میں نہیں آتی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا تَشَآؤنَ الآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ العَالَمین ۴۔

مشیت اور ارادہ کے درمیان ایک اور باریک فرق یہ ہے کہ قرآن کریم میں کُن فیکون، کل آٹھ مقامات میں سے چار مقامات پر قضٰی امر اُ کے ساتھ، دو مقامات پر اَرَادَ کے ساتھ آیا ہے جب کہ شَآءَ کے ساتھ ''کُن فیکون'' کی کوئی مثال نہیں ملتی ۵۔ یعنی کُن فیکون کے مفہوم میں جو سرعت پائی جاتی ہے اس کو قضٰی اور ارادہ کے ساتھ تو جوڑا گیا ہے مگر شَآءَ کے ساتھ نہیں جوڑا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشیّت ایک مکمل منصوبہ ہے جب کہ قضٰی اور اَرَادَ اس منصوبے پر عمل درآمد کی طرف اشارہ کرتا ہے جب بھی اللہ کی نظر میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا مناسب ہو۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے منصوبے (مشیت) پر عمل درآمد کا فیصلہ (قضٰی) اور ارادہ (اَرَادَ) کر لیتا ہے تو امر (کُن) کی قوت سے اس کو ظہور میں لے آتا ہے۔ البتہ اس قسم کی فوری فیصلے کے علاوہ لفظ اَرَادَ عمومی منصوبے (مشیت) کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال فوری فیصلے 'جو عمومی منصوبے کے مطابق ہی ہوتا ہے' کی نشاندہی کے لئے ارادَ کا لفظ قضٰی کی طرح ہے جس کے ساتھ ''کُن فیکون'' استعمال ہوا ہے ۶۔ قضٰی کے معنی بالعموم فیصلہ کرنا، عزم کرنا اور کام کو مکمّل کرنا ہوتے ہیں ۷۔ غرض مشیت،

اِرادہ اور قضٰی کے معنی میں دقیق فرق ہے مگر یہ ایک دوسرے کے بدل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں البتہ ارادہ اور قضٰی مشیت سے قدرے مختلف ہونے کے باوجود مشیّت کا ہی جُز ہیں۔ درج ذیل چارٹ کے ذریعہ ہم مشیّت، ارادہ اور قضٰی کے درمیان نسبت اور فرق کو سہولت کے لئے پیش کرتے ہیں۔

مشیت ......... عمومی منصوبہ اور اس کے مطابق خصوصی فیصلے جنہیں ہمیشہ مکمل ہوکر رہنا ہے۔ مشیت میں ارادہ اور قضٰی بھی شامل ہے۔

ارادہ .......... کے تین مفاہیم۔

۱۔ مشیت کا ہم معنی۔

۲۔ معلق یا مشروط ارادہ۔ یعنی وہ ارادہ جس کی تکمیل انسانی عمل کے ساتھ معلّق ہو۔

۳۔ منصوبے کے مطابق مخصوص فیصلہ۔

قضٰی ......۱۔ منصوبے کے مطابق مخصوص فیصلہ۔

۲۔ قطعی فیصلہ۔

۳۔ مکمل شدہ۔

مذکورہ الفاظ کے درمیان یکساں اور متفرق معنی کی تفہیم کے لئے اس سے بہتر تعمیم شاید اور کوئی نہ ہو۔ البتہ ہمیں احساس ہے کہ تعمیمات میں اکثر مسائل ہوتے ہیں اور ان کی دقیق تفصیلات میں ابہام پیدا ہوسکتا ہے۔ مثلاً سرِ دست ایک مسئلہ یہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب مشیّت ایسا عمومی منصوبہ اور خصوصی فیصلوں کا مجموعہ ہے جن کی تکمیل بہر حال ہوتی ہے تو اس میں مذکورہ بالا چارٹ کے مطابق ارادہ دوم کی کیونکر گنجائش نکل سکتی ہے جب کہ وہ انسانی عمل پر موقوف ہے۔ یہ کھلا ہوا تضاد معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس تضاد کو یہ کہکر ختم کیا جاسکتا ہے کہ ارادہ دوم کے سلسلے میں بھی اللہ تعالٰی کی یہ قطعی مشیّت ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کو آسان رکھتا ہے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ذیل میں تصویراً سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

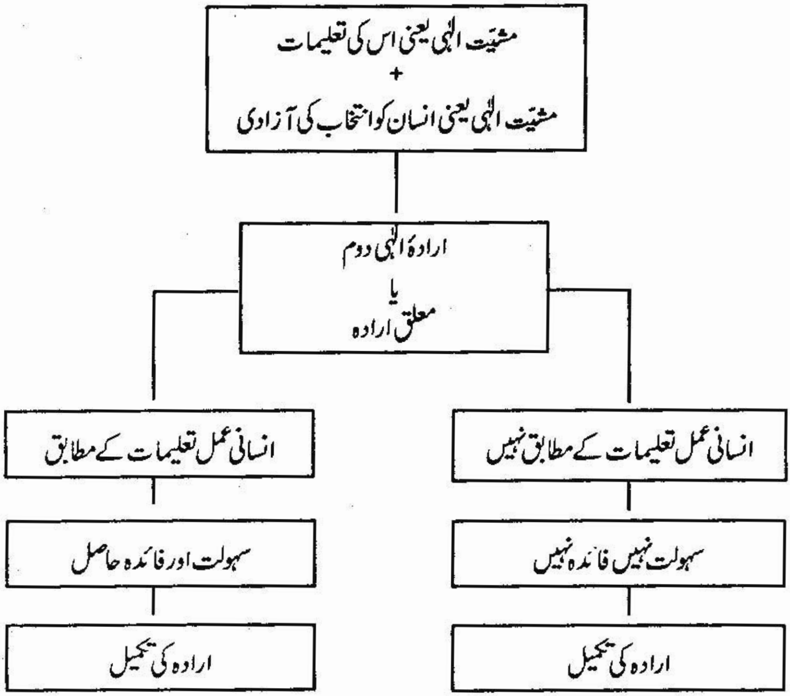


## ۹.۱.۱ منتزع مشیّت اور قضٰی

قضٰی کا لفظ خواہ اللہ کے تعلق سے بولا جائے یا انسان کے تعلق سے ہمیشہ فرمان، حکم، حرفِ آخر اور تکمیل کا مفہوم دیتا ہے۔ ہم نے اس لفظ کو اللہ کے تعلق سے اس مخصوص فیصلہ کے معنی میں لیا ہے جس کو بہر حال پایۂ تکمیل کو پہنچنا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے قضٰی وہ مخصوص مشیّت ہے جس کو بہر حال مستقبل قریب یا بعید میں یا فوراً عمل میں آ جانا ہے یا پھر وہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ چاروں اقسام کی مثالیں قرآن میں پائی جاتی ہیں۔

### ا۔ مستقبل بعید کے لیے۔

وان منکم الاّ واردُھا کان علٰی ربک حتماً مقضیاً (مریم: ۷۱)

تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمّہ ہے۔

## ۲۔ مستقبل قریب کے لیے۔

| | |
|---|---|
| قالَ کذالکِ قالَ ربّک هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ولِنَجْعَلَهٗ آیة للنّاس وَرحمةً منّا و کانَ اَمْراً مقضِیاً (مریم: ۲۱) | ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور کام ہو کر رہنا ہے۔ |

## ۳۔ فوری فیصلے کے لیے۔

| | |
|---|---|
| بدیع السمٰوات والارضِ وَاِذا قضٰی اَمْراً فاِنّمایقولُ لَهٗ کُنْ فیکون (بقرہ: ۱۱۷) | وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ |

## ۴۔ تکمیل شدہ عمل کے لیے۔

| | |
|---|---|
| فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سمٰواتٍ فی یومینِ وَاَوحٰی فی کلِّ سمآءٍ اَمْرَهَا (حٰمٓ سجدہ: ۱۲) | تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنادئے اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ |

## ۱۰.۱.۱۔ منتزع مشیت اور امر

عربی لغت میں امر کا لفظ حکم اور معاملہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنی میں خوب استعمال ہوا ہے۔ البتہ امر بمعنی حکم کی جمع اوامر ہوتی ہے جب کہ امر بمعنی معاملہ کی جمع امور ہوتی ہے۔ قرآن میں لفظ اوامر قطعی استعمال نہیں ہوا جب کہ امور کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس مقالے میں ہم اللہ کے اس امر سے بحث کر رہے ہیں جس کی جمع اوامر ہے۔ یہ امر ایک لحاظ سے ''کن'' کی طرح ہے کیونکہ 'کن' بھی ایک

طرح کا امر ہی ہے جو بالکل اسی طرح موثر ہوتا ہے جس طرح علّت اپنے معلول کے لیے موثر ہوتی ہے۔ اگر 'کن' یا امر کو علّت تصور کریں تو اس کا معلول یا تو کوئی نئی تخلیق ہوگی یا پہلے سے موجود مخلوق کے لئے کوئی ہدایت ہوگی۔

## امر، ارادہ اور کن

اوّل الذکر کو تخلیق اور آخر الذکر کو تقدیر، تسخیر یا تدبیر کہتے ہیں۔ سورہ یٰس آیت ۸۱-۸۲ میں تخلیق، امر، ارادہ اور کن کو بہت بلیغ انداز میں ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دیا گیا ہے کہ اللہ کی مشیّت اور تخلیق علّت و معلول کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سورہ الطلاق آیت ۳ (**ویرزُقْهُ من حيثُ لا يحتسب ومن يتوكل على اللّٰهِ فهو حسبهُ انَّ اللّٰه بالغُ امره قدجعل اللّٰهُ لِكلّ شَيْءٍ قدراً**) میں امر کو تقدیر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے امر مشییَ سے کوئی تخلیق فرماتا ہے تو ساتھ اس کے تقدیر بھی متعین کرتا ہے۔ ایک اور قرآنی آیت میں اللہ کا فرمان ہے کہ ''اس نے بنایا، متوازن کیا، تقدیر بنائی اور ہدایت دی ۸۔ اجرام سماوی کی حرکتیں اور ان کے زبردست ریاضیاتی قوانین بھی تقدیر الٰہی ہیں ۹۔ سورہ حم السجدہ آیت ۱۲ کے مطابق ان قوانین اور دوسرے بہت سے سماوی ضابطوں کے لئے ''امر'' اور ''قدر'' کے الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جس سے امر، تخلیق اور تقدیر کے درمیان رابطوں کا پتہ چلتا ہے۔

## امر اور تسخیر

امر جیسا کہ ہم جانتے ہیں حکم کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے بالمقابل تسخیر میں تصرف اور خدمت میں لگانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں تسخیر اللہ کا عمل ہے انسان کا نہیں جیسا کہ عصر حاضر میں مسلم سائنسدانوں کی اکثریت تصور کرتی ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے اپنے امر سے سورج، چاند، دن رات، سمندروں، جہازوں، اور زمین و

آسمان کی تمام اشیاء کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ یہ سب انسان کے لئے سود مند ہو گئی ہیں اور انسان ان سے فوائد حاصل کر سکتا ہے۱۰۔ آیات تسخیر کے مطابق تسخیر کے پیچھے اصل قوت امر الٰہی ہے۔ چنانچہ تسخیر بھی امر اور مشیت ہی کا ایک رخ ہے۔

## امر اور تدبیر

قرآن کریم میں امر اور تدبیر پانچ مقامات پر ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ البتہ ایک مقام کے علاوہ ان تمام مواقع میں ''امر'' معاملہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے حکم کے مفہوم میں نہیں۔ جب کہ اب تک ہماری بحث میں اسی مفہوم پر زور رہا ہے۔ ہمارے مفہوم سے متعلق آیت میں کہا گیا ہے **فالمدبراتِ امرا** (النازعات:۵)۔ اس آیت میں اللہ کے امر کی تکمیل میں ملائکہ کی تدبیرِ امر کا تذکرہ ہے۔ تاہم ملائکہ چونکہ اللہ کی مخصوص اور قوی مخلوق ہے جو اللہ کی مکمل تابعداری میں کچھ کام انجام دیتے ہیں اس لئے ان کی تدبیر در اصل اللہ کی تدبیر ہی کا ایک حصہ ہے کیونکہ وہ اللہ کے امر کے خلاف کچھ نہیں کر پاتے۔

امر بمعنی معاملہ (جمع امور) اور تدبیر جن آیات میں ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں اُن آیات میں کہا گیا ہے کہ اللہ وہ ہے جو تمام امور کا انتظام کرتا ہے جن میں مثلاً تخلیق و ہدایت۱۱، غذا کی فراہمی، زندگی اور موت کے امور۱۲، بغیر ستونوں کے آسمانوں کو بلند کرنا، سورج اور چاند کو مسخر کرنا تا کہ وہ متعین وقت تک حرکت کرتے رہیں۱۳ شامل ہیں۔ مزید یہ کہ وہی زمین سے آسمان تک تمام امور کی تدبیر کرتا ہے اور ایک ہزار سال کی رپورٹ ایک یوم میں لے لیتا ہے۔۱۴

## امر بمعنی حکم اور امر بمعنی معاملہ: کیا واقعی کوئی فرق ہے؟

امر کے دونوں مفاہیم کے درمیان فرق کی تحقیق بہت اہم ہے۔ انسانی نقطۂ نظر سے حکم اور معاملہ کے درمیان بہت اہم فرق ہے کیونکہ انسان کا ہر حکم ایک معاملہ تو ہے مگر اس کا ہر معاملہ کوئی حکم نہیں ہوتا۔ انسان کی ناکامی ظاہر ہے کہ اس کا ایک معاملہ ہے جب کہ وہ کوئی بھی حکم ناکام ہونے کی غرض سے نہیں دیتا۔ اس کے باوجود اس کے بہت

سے احکام بے اثر رہ جاتے ہیں۔ یہ یقیناً اس کا ایک معاملہ ہے جس پر اس کو ہمیشہ قدرت حاصل نہیں رہتی کہ وہ اس کو ہر حال میں اپنی مشیت کے مطابق مکمل کرلے۔ چنانچہ انسانی معاملات ہمیشہ اس کے احکام کے مطابق نہیں ہوتے۔ انسان کسی طور پر حکم دے مگر معاملہ کوئی اور رخ اختیار کرلے۔

اس صورتحال کے برخلاف اللہ کا امر دونوں مفاہیم میں اللہ کی مشیت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اب چونکہ اللہ کے تمام امور اس کی مشیت اور اس کے مطابق بعینہٖ پورے ہوتے ہیں اس لئے اللہ کے سلسلے میں امر (جمع اوامر) اور امر (جمع امور) کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن کی بہت سی آیات میں لفظ امر کو دونوں میں سے کسی بھی معنی میں لیا جائے پیغام ایک ہی رہتا ہے۔ مگر یہ اسی وقت درست ہے جب کہ امر مصدر کی شکل میں استعمال ہوا ہو۔ فعل کی شکل میں اس کے معنی صرف حکم ہوتے ہیں۔

## خلاصۂ امر

اللہ کا امر (جمع اوامر) دراصل اللہ کی وہ قوت ہے جس سے اس کی منتزع مشیّت کی تکمیل ہوتی ہے۔ منتزع مشیت اور امر ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اوّل الذکر خالص صفت ہے جب کہ آخرالذکر صفت ہونے کے ساتھ ساتھ عدم یا معمل مشیّت میں برسرِ عمل بھی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر منتزع مشیت ایک منصوبہ ہے تو امر اس منصوبے کو خارج میں صورت پذیر کرنے کی قوت اور اہلیت ہے۔ چنانچہ امر ایک منصوبہ بند اور بامقصد قوتِ تخلیق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل کائنات بنیادی طور پر منصوبہ بند، بامقصد، اور مصنوع مشیّت ہے۔

امر بمعنی حکم کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں۔ تخلیقی امر، تدبیری امر اور ہدایتی امر۔ تخلیقی اور تدبیری اوامر تو اللہ کی تخلیقی اور تدبیری قوتیں ہیں جن سے مذکورہ بالا ارادہ اوّل وسوم کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہدایتی امر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے انسانی اختیاری عمل کے مطابق موثر ہوتا ہے چنانچہ ہم امر کی تعریف مندرجہ ذیل طریقے پر کرسکتے ہیں۔

<u>اَمر محیط الکل منصوبہ بند تخلیقی اور تدبیری قوت اور ہدایتی اصول ہے</u>

## ۱۱.۱.۱ منتزع مشیت اور اذن

اذن کے مشہور معنی اجازت کے ہیں۔ البتہ یہ لفظ، امر، حکم، ارادہ اور مشیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مولانا عبدالرشید کا دعویٰ ہے کہ اذن کبھی بھی مشیت کے مفہوم کے بغیر نہیں ہوتا ۱۵۔ اس لحاظ سے اذن امر کی طرح ہی ارادہ کی تکمیل کرنے والی معمول کی تخلیقی اور تدبیری قوت ہے۔ مگر اذن اس سے زائد بھی کوئی خصوصی قوت ہے جو پہلے سے موجود مصوّر مشیّت کے تمام ظاہری تخالف کے باوجود ارادہ کو پورا کرتا ہے۔ معجزات اذن کی قوت ہی سے وجود میں آتے ہیں۔ چنانچہ اذن امر ہی کی طرح ہے اور خصوصی فراہمی بھی ہے۔ خصوصی فراہمی کے لحاظ سے یہ امر سے رخصت امر میں اضافۂ قوت، اور امر بالائے امر بھی ہے، ان تمام قسم کے معانی قرآنِ کریم کی درج ذیل آیات میں پائے جاتے ہیں۔

### ۱۔ اذن بمعنی امر

جبرئیل کا اللہ کے اذن سے رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل کرنا (البقرہ:۹۷) جادو کے ذریعہ کسی کو نقصان اللہ کے اذن کے بغیر نہ پہنچنا (البقرہ:۱۰۲) اور طیّب زمین میں اللہ کے اذن سے خوب پھل پھول آنا (الاعراف:۵۸) ایسے معمول کے افعال ہیں جو فطرت میں عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مواقع میں اذن کا استعمال بمعنی امر ہی ہے یہاں تک کہ جو کام فرشتوں سے لیا جاتا ہے اس کے لئے بھی اذن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ۱۶

### ۲۔ اذن بمعنی رخصت فی الامر

چاند، سورج ستارے اسی نے پیدا کئے اور یہ سب اسی کے امر کے تابع ہیں، خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے (الاعراف:۵۴) اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔ (الحج:۶۵)۔ ان آیات کے مطابق آسمانوں کی تخلیق و تسخیر اللہ کے امر سے ہیں اور اذن امر تسخیر کو رخصت دے دیتا ہے جس کے نتیجے میں اجرام سماوی زمین پر گر سکتے ہیں۔ البتہ یہ سوال حل طلب ہے کہ

آخر یہ رخصت عطا کس طرح کی جاتی ہے۔ بظاہر تو یہی مفہوم نکلتا ہے کہ جب کوئی جرم زمین پر گرتا ہے تو تسخیری امر کام کرنا بند کردیتا ہے۔ سائنسی نظریات کی روشنی میں تو یہ تاویل کی جاتی ہے کہ اجرام فلکی (شہابوں) کا زمین کی جانب گرنا خلا میں موجود کشش ثقل کی قوتوں کے درمیان تعامل وتصادم کا حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ طے کرنا باقی ہے کہ اذن (رخصت) مختلف زاویوں سے خلاء میں کام کرنے والی امر کی قوتوں کے درمیان ٹکراؤ کا راست نتیجہ ہے کہ بس آخر میں وہ ایک قوت باقی رہ جاتی ہو جو مائل بہ زمین ہو؟ یا یہ ایک خصوصی طور پر بہم پہنچائی گئی قوت ہے جو تصادم کی میزان کو زمین کی طرف یا کسی بھی سیارے کی طرف عملاً موڑ دیتی ہے اور شہاب وہاں جا گرتا ہے؟

## اذن، امر کی قوت میں اضافہ

طالوت کی فوجوں کو جالوت کے مقابلے میں فتحیابی (البقرہ: ۲۴۹-۲۵۱) اذن کی وجہ سے ہوئی۔ طالوت کی ان فوجوں میں کمزوری پیدا ہو جانا جنہوں نے اچھی طرح پانی پی لیا تھا امرِ تخلیقی کی وجہ سے ہوا کیونکہ طویل سفر کے بعد بیک وقت زیادہ پانی پی لینے سے اکثر یہی ہوتا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے پانی نہیں پیا ان کو اذن کے ذریعہ مدد ملی جو اُس امر کی قوت سے زائد تھی جس کا انہوں نے پانی نہ پی کر تحفظ کیا تھا۔ بدر میں بھی مومنین کو اللہ نے مدد دی کیونکہ اس کا ارادہ کافروں کی جڑ کاٹنے کا ہو گیا تھا۔ ۱۷ ایسا اس لئے ہوا کہ اللہ کو اپنے امر کی تکمیل کرنی تھی۔ ۱۸ دونوں کو دکھایا گیا کہ مدِّ مقابل کم تعداد میں ہے ۱۹۔ فرشتوں کے ذریعہ خصوصی مدد پہنچی ۲۰، بلکہ ایک طرح کی نیند اور بارش بھی مددگار ثابت ہوئی ۲۱۔ اور یہ سب اللہ کے اذن سے ہوا۔ اسی قسم کی مدد احد کے دن بھی آئی حتّٰی کہ ایک غلطی اور حکم عدولی کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے اٹھالی گئی۔ ۲۲

مقالے کے اس جُزء میں پیش کردہ آیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اذن اوّل تو اللہ کے تخلیقی امر سے متعلق ہوتا ہے۔ صبر، ثبات، پانی نہ پینا، میدانِ جنگ میں متعین کردہ جگہ اور حکم سے فرار نہ کرنا، یہ تمام ہدایات ان امور سے متعلق ہیں جن کا سلسلہ تخلیقی

امور سے جاملتا ہے۔ یہ تمام ہدایات جنگی قوت کو بحال رکھنے سے متعلق ہیں جو بذاتِ خود انسانی فطرت یا دوسرے الفاظ میں مشیت بصورت انسان کا ایک رخ ہیں۔ چنانچہ یہ مومنین اور غیر مومنین کے لئے برابر طور پر اہم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کے تخلیقی امر سے غیر مومنین بھی مسلح تھے۔ فرض کئے لیتے ہیں کہ اس تخلیقی امر کے اعتبار سے دونوں گروہ برابر طور پر مسلح تھے، یعنی دونوں گروہوں میں برابر کا صبر وثبات، نظم اور حکمت عملی تھی تاہم تینوں ہی جنگوں میں مومنین نفری اور آلاتِ حرب کے لحاظ سے بہت کمزور تھے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کے اذن سے فتحیاب ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مومنین کو پہلے تو اپنے آپ کو مشیت یعنی تخلیقی امر کے مطابق تیار ہونے کی تعلیم دی گئی۔ دوسری طرف دشمنوں نے بھی اپنے علم اور اپنی سمجھ کے مطابق یہی کیا۔ جب دونوں قوتوں کے درمیان جنگ ہوئی تو حقیقتاً تخلیقی امر کے دو زُمرے آپس میں ٹکرائے جس میں اذن کی ایک زائد قوت نے حصہ لے کر پانسہ مؤمن زُمرے کے حق میں بدل دیا۔ چنانچہ مومنین کی فتح کی شکل میں بحیثیت مجموعی مشیت ظہور پذیر ہوگئی۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ اذن کبھی کبھی امر کے لئے ایک زائد قوت ہوتا ہے اور انجام محض دو اُمور کے درمیان تعامل کا حاصل نہیں ہوتا بلکہ خارج سے اذن کی قوت فراہم کر کے میزان کو کسی ایک سمت میں عملاً جُھکا دیا جاتا ہے۔ فطری مظاہر میں بھی یہ حقیقت کارفرما ہو سکتی ہے۔

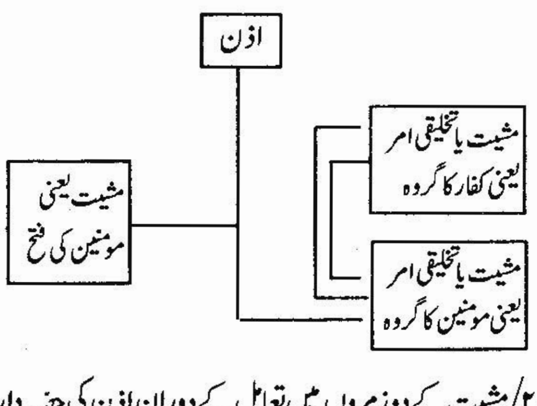


تصویر ۲/ مشیت کے دو زمروں میں تعامل کے دوران اذن کی حصہ داری۔

## اذن، امر بالائے امر

بعض اوقات پہلے سے قائم مشیت کے تمام تر تقاضوں کے برخلاف اذن کامیابی کے ساتھ عمل درآمد کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر اذن اصل میں امر بالائے امر ہوتا ہے۔ یہ مشیّت کے نظام میں شامل تمام اوامر سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ انسانی اصطلاح میں ایسے واقعات کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن ان کو آیات، بیّنات اور سلطان جیسے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے۔ بنیادی طور پر معجزات اللہ کی مشیّت اور ارادہ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ مشیت معمول بہ اور پہلے سے قائم مشیت کے نظام پر چھا جاتی ہے جس کو انسان اپنی عادت کے مطابق ناممکن سمجھتا ہے تو یہ کائنات میں ایک عظیم قوت کے عمل دخل کی علامت بن جاتی ہے۔ یہ اُن منتخب بندوں کے حق میں مددگار ہوتی ہے جن کے ہاتھ پر معجزات وجود میں آتے ہیں۔ مگر معجزات اذن کی عظیم قوت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔

| | |
|---|---|
| ۱. وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَاْتِيَ بِاٰيَةٍ الاّ بِاِذْنِ اللّٰه (الرعد : ۳۸) | اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔ |
| ۲. وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَاْتِيَ بِاٰيَةٍ الاّ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ (المومن : ۷۸) | کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا۔ پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ |

مذکورہ بالا آیات کے مطابق رسول صرف اللہ کے اذن سے ہی معجزہ دکھا سکتا ہے۔ دوسری آیت میں اذن کے لئے امر کا صیغہ بھی استعمال کر لیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اذن اصل میں امر ہی ہے۔ ایک ایسا امر جو پہلے سے قائم اوامر کو معطل کر کے اپنی تاثیر دکھاتا ہے۔ اس طرح وہ کسی شخص کے رسول ہونے کی صریح علامت بن جاتا ہے۔ قرآن میں دوسرے بہت سے مقامات پر حضرت موسیٰؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰؑ کے معجزات کے تذکروں میں اذن کے تعلق کو ابھارا گیا ہے[۲۳] ان تمام واقعات کا تعلق بالائے طبیعی امور سے ہے

اور یہ واقعات علی العموم نہیں ہوتے بلکہ خاص مواقع پر ہی ہوتے ہیں۔

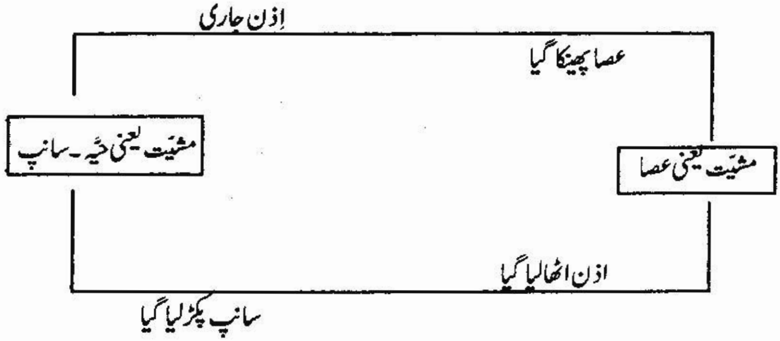


تصویر۳/معجزات کی مثال مشیّت واذن کی روشنی میں

## ۱۲۔ معمل مشیّت، عدم یا خلاء

ابتدا میں ہم نے نظام مشیّت کی تین قسمیں بیان کی تھیں۔ان میں سے پہلی قسم یعنی منترع مشیّت کو قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کے بعد اب ہم مشیّت کی دوسری قسم معمل مشیّت کی وضاحت کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ معمل مشیّت کوئی چیز نہیں ہوسکتی کیونکہ چیزیں اللہ جل جلالہٗ کے قرب میں اپنی ہیئت پر برقرار نہیں رہ سکتیں۔ چیزیں صرف عظیم خلاء میں سلامت رہ سکتی ہیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناسب فاصلے پر قائم رہ سکیں۔ یہ خلاء تخلیق کی ابتدا کے لئے بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ آج ضروری ہے تاکہ اشیاء اللہ کی تجلّیات قاہرہ سے ایک خاص فاصلے پر قائم رہ سکیں۔ یقیناً اشیاء کے وجود و بقا کے لئے یہ ضروری فراہمی اللہ ہی کے فضل سے ہوئی۔ چنانچہ اللہ کی مشیّت کا پہلا اظہار عظیم خلاء کی شکل میں ہوا جو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات میں فراہم کیا تاکہ اس میں اپنی مشیّت کو مصنوع کرے، اس طرح خلاء نہ صرف یہ کہ معمل مشیّت یعنی اللہ کی عمل گاہ ہے بلکہ یہ ضروری مشیّت بھی

ہے اور عدم بھی۔

ضروری معمل مشیّت کے لئے عدم کی اصطلاح سے غلط فہمی ہوسکتی ہے کیونکہ جب یہ ایک مرتبہ وجود میں آ گیا تو اس کو چیز کا نام تو ملنا ہی چاہئے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص عدم کو اس مخصوص معنی میں کوئی چیز کہتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ بذات خود ایک چیز ہونے کے باوجود خود اس میں ابتداءً کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ حتّٰی کہ آج جب کہ یہ عظیم کائنات کی بہت سی مصنوعات سے بھر دیا گیا ہے اس کا عظیم تر حصہ اب بھی خالی ہے۔ اس تفہیم سے خلاء کے مطلق ہونے کا اشارہ ملتا ہے جس کے لئے عدم کی اصطلاح ہی مناسب ہے۔ اور یہی عدم اللہ کا عرش ابتدا میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔ چنانچہ عدم، خلاء، معمل مشیّت، عرش ایک ہی ضرورت کے مختلف نام ہیں۔ یہی ضروری، معمل مشیّت یا عدم بیک وقت اللہ کی قلمرو بھی ہے اور اس کا عرش بھی۔

## ۱-۳ مصنوع مشیّت

منتزع مشیّت کے بارے میں ہم واضح کر آئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خالص صفت ہے اور بالائے تخلیق ہے۔ شَاءَ ، اَرادَ، قضٰی ، امر ، اذن وغیرہ الفاظ جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اللہ کی منتزع ، مجرد اور مطلق صفات و کمالات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ اس معنی میں ذہنی ہیں کہ اللہ کی ذات سے باہر ان کا علیحدہ کوئی وجود نہیں۔ البتہ خارجی مصنوعات جو دراصل اللہ کی منتزع مشیّت کا اپنی معمل مشیّت یا عدم میں اظہار ہیں، اللہ کی ذات سے الگ عدم میں موجود ہیں۔ اللہ اپنے امر اور اذن کی قوت سے اپنی معمِل مشیّت (عدم) میں جو کچھ چاہتا ہے بناتا اور کرتا ہے۔ اس طرح تخلیق سے پہلے کی مشیّت یا دوسرے الفاظ میں تخلیق کی سطح سے بلند تر جو مشیّت ہے وہ منتزع مشیّت ہے اور معمل مشیّت (عدم) میں ظاہر ہونے والی تخلیقات مصنوع مشیّت ہیں جو مخلوق بھی ہیں اور حادث بھی۔ چنانچہ ہم اُن کو مخلوقاتِ الٰہیہ کے نام سے جانتے ہیں جو غیر مادّی بھی ہوسکتی ہیں اور مادّی بھی۔

مخلوقات میں بھی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جن کی اپنی کوئی مشیت نہیں ہوتی اور وہ انتخاب کی دولت سے بہرور نہیں ہوتیں۔ چنانچہ براہ راست اللہ کی مشیت کے تابع ہوتی ہیں۔ ان مخلوقات میں ایک طرف غیر مادّی اشیاء اور ملائکہ شامل ہیں تو دوسری طرف مادّی چیزوں میں جمادات، نباتات اور حیوانات۔ البتہ جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے فرداً فرداً ان کی اپنی مشیّت اور ارادے سے نوازا ہے۔ وہ کئی ممکنات میں سے کسی ایک کو اپنے لئے پسند کرنے، حاصل کرنے، استعمال میں لانے اور اپنی ملک میں رکھنے کے انتخاب کی آزادی سے سرشار کئے گئے ہیں۔ حالانکہ ان مخلوقات کے وجود کا خاصا بڑا حصہ اُسی مشیّت کا پابند ہوتا ہے جو پوری کائنات اور خود ان کے وجود میں ہر وقت کارفرما ہے اور جس میں جنّ و انس اسی طرح مجبورِ محض ہیں جس طرح جمادات وغیرہ مگر انتخاب کے میدان میں وہ مجبورِ محض نہیں ہوتے۔

## ۱۔۴ شارع مشیّت یا نظام رضا

جنّ و انس کو انتخاب کے عمل سے گذرتے ہوئے مدد پہونچانے کے لئے ایک طرف تو عقل دی گئی ہے اور دوسری طرف وحی و رسالت کے ذریعہ ہدایت بھی فراہم کی گئی تاکہ انتخاب میں توازن قائم رہے اور وہ سلامتی کا راستہ چن سکیں۔ وحی کے ذریعہ ہدایت کا نظام برپا کرنا دراصل مشیت الٰہی کی تیسری سطح ہے جس کو ہم شارع مشیّت کہہ سکتے ہیں۔ اب چونکہ شارع مشیت کو تسلیم کرنے اور اس کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھالنے کی کوشش کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اس لئے اس نظام مشئیت کو نظامِ رضا بھی کہہ سکتے ہیں۔

## ۲۔ خلاصۂ بحث

ہم نے اب تک جو گفتگو کی ہے اس کے خلاصے اور ایک نظر میں اس کو سمجھنے کے لئے تصویر ۲ کی مدد لیتے ہیں۔

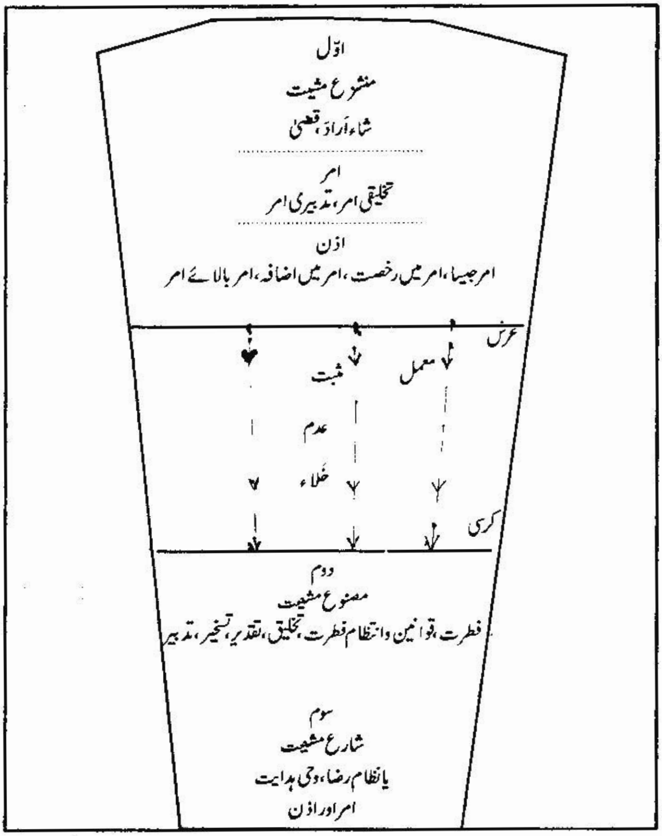


تصویر نمبر ۴، نظام مشیت و رضا کا نقشہ

اس تصویر کو نامکمل دائرے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ اس کو مکمل دائرہ تصور کریں۔ اس دائرے کے محیط پر اللہ تعالیٰ کی لامحدود مشیّت کو دکھایا گیا ہے یہ مشیت الٰہی کا اوّلین درجہ ہے جو دراصل اللہ کی صفت ہے اور اسی لحاظ سے منتزع، مجرد اور مطلق ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کو شآء، اراد، امر، اذن اور قضٰی جیسے الفاظ سے واضح کیا گیا ہے۔ اگر دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اللہ کی منتزع مشیّت کے بھی تین پہلو ہیں۔ ایک وہ پہلو جس کو شاءَ، ارادَ اور قضٰی جیسے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرے دو پہلو امر اور اذن ہیں جو مشیّت کے اظہار کی قدرت کاملہ سے تعبیر ہیں۔ امر تخلیقی بھی ہوتا ہے اور تدبیری بھی۔ البتہ قرآن میں اذن کبھی تو صرف امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی امر سے مختلف

معنی میں۔ اس دوسری حیثیت میں کبھی تو اذن امر کو رُخصت کر دیتا ہے، کبھی یہ امر کی قوت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے اور کبھی یہ امر بالائے امر ہوتا ہے۔

دوسرے دائرے میں خالی جگہ ہے جو عدم کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ عدم، تخلیق کے وجود میں آنے سے پہلے انتہائی مرکز تک عدم ہی تھا جو بیک وقت اللہ کا عرش بھی تھا اور اس کی قلمرو بھی۔ آج بھی جب کہ مرکز میں تیسرا دائرہ وجود میں آچکا ہے یہ اس کی قلمرو ہے۔ اللہ کی قلمرو ہونے کی نسبت ہی سے ہم نے اس کو معمل مشیت کا نام دیا ہے۔ البتہ موجودہ صورتحال میں یہ قلمرو بیرونی اور مرکزی حصّوں میں منقسم ہے۔ بیرونی حصہ آج بھی عدم ہی ہے جس کے مزید بیرونی اور اندرونی حصّوں کو علی الترتیب عرش و کرسی کہہ سکتے ہیں۔

تیسرا دائرہ دراصل مرکزی دائرہ ہے جس میں اللہ کی مشیّت کا سطح دوم پر متشکل اظہار ہوتا ہے۔ اس کو ہم نے مصنوع مشیت کا نام دیا ہے۔ اسی پر فطرت، قوانین و نظامِ فطرت، تخلیق، تقدیر، تسخیر، تدبیر وغیرہ الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی مصنوع مشیت کے ایک چھوٹے سے مگر ذی ارادہ مخلوق کے لئے بہت اہم حصے میں تیسرے درجے کی مشیّت یعنی شارع مشیّت کو ظاہر کیا گیا ہے جس کا دوسرا نام نظام رضا ہے اور جس میں وحی، ہدایت، شرعی امر، قضٰی اور اذن شامل ہیں۔ اس طرح کل کائنات کی تفہیم نظام مشیّت و رضا کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اس تفہیم کو نظریہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مقابلے میں نظریۂ وحدۃ المشیّت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اوّل الذکر دونوں نظریئے ہمارے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔

## ۲۔ مشیّت امر اور روح

مشیّت اور امر سے متعلق ہم مفصّل گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم امر اور روح کے درمیان تعلق، روح کے تصور اور اس کی اقسام پر بحث کرتے ہیں۔

### ۲۔ا۔ روح کیا ہے

روح اصل میں کیا ہے اس کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ امرِ الٰہی سے ہے۔

ویسئلونکَ عنِ الروح قلِ الروح من امر ربّی وما اوتیتم من العلم الاّ قلیلاً (بنی اسرائیل : ۸۵)

آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے تم کو علم کم ہی دیا گیا ہے۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ کہ امر کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم روح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ روح اللہ کے امر سے وجود میں آتی ہے۔ ہم دونوں مطالب کو ساتھ ملا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح اللہ کے اوامر میں سے ایک خاص امر بھی ہے اور اس امر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کوئی لطیف شئَ بھی ہے۔ گو ہم اس لطیف شئَ کی کنہ تک تو نہیں پہنچ سکتے لیکن قرآنِ کریم میں اس لفظ کے استعمالات سے کسی حد تک یہ اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کہ روح ایک مخصوص قسم کا امر ہے۔ قرآنِ کریم میں لفظ روح چھ مختلف سیاقوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ اللہ کی مہربانی اور اس کی مدد کے لئے [۲۴]

۲۔ وحی [۲۵]

۳۔ جبرئیلؑ [۲۶]

۴۔ مریم عذرا کے بطن میں پھونکی گئی کوئی شئَ [۲۷]

۵۔ آدم علیہ السلام کے جسد میں پھونکی گئی کوئی شئَ [۲۸]

۶۔ امر کے عام معنی میں۔ [۲۹]

سیاق اوّل و دوم کو ملانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحی کے لئے روح کا لفظ اللہ کی مہربانی کا مفہوم دیتا ہے۔ یہی وحی ایک مخصوص معنی میں انسان کے لئے مخصوص قسم کی زندگی کا سبب بھی ہوتی ہے۔ یعنی ہدایت، صحیح سوچ اور بلند مقاصد عطا کر کے وحی انسان کے حق میں بطورِ خاص زندگی کا سبب بنتی ہے اور انسان کو بطور خاص قوت عطا کرتی ہے۔

تیسرے چوتھے اور پانچویں سیاق میں روح کا کسی زندہ شئَ جبرئیل۔ مریم اور آدم سے تعلق کا پتہ چلتا ہے جب کہ یہ زندہ اشیاء اللہ کی بہت خاص مخلوقات ہیں جن کو مخصوص طریقے سے وجود بخشا گیا ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ اشیاء کی تخلیق سے متعلق

لفظ روح کا استعمال مخصوص طریقِ تخلیق کی وجہ سے کیا گیا ہو۔ حضرت آدمؑ کی خصوصی تخلیق مٹی سے اور حضرت عیسیٰؑ کی خصوصی تخلیق بغیر باپ کے تو معلوم ہی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہم آگے وضاحت کریں گے ان کے لئے روح کا لفظ کس بنا پر خاص ہے۔ ان مواقع پر لفظ روحی، اور روحنا بھی اس اہمیت اور خصوصیت کے طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جبرئیلؑ بھی اس معنی میں بہت اہم ہیں کہ وہ تمام ملائکہ سے زیادہ قوی ہیں اور ان کی تمام فرشتے اطاعت کرتے ہیں ۳۰۲ آدم وعیسیٰ علیہما السلام کی تخلیق کے لئے عین ممکن ہے کہ اللہ نے اپنے مخصوص امر سے مخصوص روح بنا کر ان میں پھونکی ہو۔ اسی طرح یہ عین ممکن ہے کہ جب صرف عدم تھا تو مخصوص امر (روح) کے ذریعہ مخصوص تخلیق یعنی کائناتی روح بنا کر عدم میں پھونک دی گئی ہو جس نے دنیا کی تخلیق کے لئے ابتدائی جرم کا کام دیا ہو۔ ہمارا یقین ہے کہ کائناتی روح کائنات کی ہر زندہ و مردہ چیز میں پائی جاتی ہے دراصل چیزیں کائناتی روح سے بنی ہیں اور کائناتی روح ہی کے سمندر میں معلق ہیں۔ چنانچہ یہ پوری کائنات بحیثیت مجموعی ایک زندہ شئ ہے اور روح کے ذریعہ مربوط ہے جو آخری تجزیے کے طور پر اللہ کا امر ہے یا اس کے امر سے ہے۔

## ۲.۲ امر سے روح تک

ہم کو چونکہ نہ تو امر کی کنہ کا پتہ ہے اور نہ ہی ہم روح کی کنہ سے واقف ہیں اس لئے امر سے روح تک کی تبدیلی بھی ہمارے لئے غیب میں ہے۔ غالباً مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی مندرجہ ذیل وضاحت اس سلسلے میں کافی ہوگی۔ انہوں نے انسانی روح پر گفتگو کی ہے مگر جو حکم انسانی روح پر جاری ہوتا ہے وہی کائناتی روح کی تفہیم میں بھی مددگار ہوگا۔

> ''عین ممکن ہے کہ قادرِ مطلق اور مصورِ برحق جلّ وعلا کا امرِ بے کیف (کن) باوجود صفتِ قائمہ بذاتہٖ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہو جائے۔ ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں۔ وہ ارواح و ملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں

اور ''امر الٰہی'' بحالہ قدیم رہے، امکان و حدوث کے آثار و احکام
ارواح وغیرہ تک محدود رہیں اور ''امرِ الٰہی'' ان سے پاک و برتر رہے''[۱۳]

## ۲۔۳۔ کائناتی روح سے سماوات وارض تک

جس طرح امر سے روح تک کا سفر نا معلوم ہے اسی طرح روح کے غیر مادّی اور مادّی شکلوں میں تبدیلی کا عمل بھی نا معلوم ہے۔ البتہ اوّل الذکر کے مقابلے میں ثانی الذکر ایک لحاظ سے مختلف ہے۔ مذکورِ اوّل میں امر اور روح دونوں ہی نا قابل مفہوم ہیں جب کہ مذکور دوم میں کم از کم ایک سمت یعنی مخلوق کی موجودہ شکلیں قابلِ فہم بھی ہیں اور کسی حد تک معلوم بھی۔ چنانچہ اگر ہم کثیف ترین شیٔ یعنی مادہ سے ابتدا کرتے ہوئے پیچھے کی طرف لطیف ترین شئے یعنی روح کی طرف سفر کریں تو واقعات کے سلسلے کو مکمل کرنے کے لئے خالی جگہوں کو کسی طرح بھر سکتے ہیں۔ یا اس کے برخلاف لطیف ترین روح سے ابتدا کرتے ہوئے نور، نار اور مادّہ کی طرف درجہ بدرجہ سلسلہ جوڑ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح لطیف تر ہے، نور اس سے کثیف، نار اور بھی کثیف اور مادّہ سب سے زیادہ کثیف ہے۔ سائنسی تجربات کی روشنی میں ہم جانتے ہیں کہ مادّہ دراصل قوت ہی ہے جو کسی طرح ایٹمی ذرّات کی شکل اختیار کرتی ہوئی مختلف قسم کے ایٹموں کی ترکیب کا باعث ہوتی ہے اور مادّی عناصر کو جنم دیتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مادّہ ٹوٹ کر نار اور نور میں بدلتا ہے اور جلنے کے عمل میں کثیف اشیا لطیف اشیا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جب کہ ٹھنڈ پانے پر لطیف اشیاء پھر کثیف ہو جاتی ہیں۔ دباؤ کا بھی اسی طرح کا اثر ہوتا ہے۔ پانی ٹھنڈا ہونے پر سخت برف بن جاتا ہے اور گرم ہونے پر بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر گیس کو دبایا جائے تو وہ تکثیف کے ذریعہ رقیق کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ کثافتیں حرارت اور دباؤ کے اثر سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ اجرامِ سماوی متواتر دَوری حرکت میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ اوّلین مخلوق یعنی کائناتی روح کے لطیف تر کرہ کو ترچھے دباؤ کے

ذریعہ عملِ تکثیف سے گذارا گیا ہوگا جس کی وجہ سے اس کرہ میں بہ یک وقت دَوری حرکت اور کثافت کا عمل واقع ہوا۔ نتیجتاً نور، نار اور مادّہ وجود میں آئے اور کائناتی روح کے بھونروں میں گردش کرنے لگے۔ مادّے کے ابتدائی ذرّات ایک دوسرے سے مختلف اشکال میں اللہ کے منصوبے کے تحت ملنے لگے اور عناصر وجود میں آگئے۔ کائناتی درجہ حرارت بلند ہونے کی وجہ سے جلنے والے عناصر آکسیجن کی موجودگی میں جلنے لگے۔ پہلا کیمیائی ردّعمل ہائڈروجن اور آکسیجن کے درمیان ہوا جس سے پانی بنا اور درجہ حرارت بلند ہونے کی وجہ سے بھاپ کی شکل میں رہا اور کائناتی روح کے بھونری اثر سے وہ کرۂ روح کے کناروں کی طرف منتقل ہوگیا۔ چنانچہ پانی کی بڑی مقدار عرش و کرسی کے نیچے جمع ہوگئی۔

| | |
|---|---|
| وھو الّذی خلق السمٰوٰتِ والارضَ فی ستۃِ ایّامٍ وّکان عرشہٗ علی المآءِ (ھود : ۷) | اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا جب کہ اُس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ |

اس تفہیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے تخلیقی امر سے کائناتی روح بنائی جس میں بے شمار امکانات رکھے۔ دوسرا امر تدبیری تھا جس نے اصلاً قوت تکثیف کی حیثیت سے کام کیا لیکن اس میں تخلیقی مضمرات بھی شامل تھے، انہیں مضمرات میں سات آسمانوں کی تخلیق بھی شامل ہے۔ کائناتی روح کے امکانات کو نار، نور اور مادّہ کی سطح پر طبیعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی مطالعات کے ذریعہ کافی کچھ سمجھا جاسکتا ہے، مگر یہ امکانات ہماری محسوسات کی دنیا تک محدود نہیں ہیں۔

## ۴.۲ روح اور زندگی

مذکورہ گفتگو سے واضح ہوگیا کہ نور، نار اور مادہ کائناتی روح کے مکثوفات ہیں جو کائناتی روح کے اس بہت بڑے کرۂ میں معلّق اور گردش میں ہیں جواَب بھی اپنی اصل پر قائم ہے۔ ابھی یہ سب بغیر زندگی کے ہیں۔ البتہ جب ان کو ایک مخصوص ترتیب دے دی جاتی ہے تو ان میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس ترتیب کے لئے ایک خاص تخلیقی امر

دیا جاتا ہے۔ یہی وہ حیاتی امر ہے جو زندگی کی روح کے نام سے مشہور ہے۔ اس حیاتی امر یا حیاتی روح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کائناتی روح کے مختلف مدارج میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ جبرئیلؑ جن کا دوسرا نام روح اور روح القدس ہے کائناتی روح کے ایک حصّے میں حیاتی امر یا حیاتی روح کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اس کو روح یا روح القدس اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی اصل کائناتی روح ہے جس میں روح حیات ڈال دی گئی ہے۔ باقی ملائکہ کو نا قابلِ مشاہدہ نور میں روحِ حیات ڈال کر پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کی اصل نور ہے۳۲۔ جنّات کو جن کی اصل نار ہے، نار میں روح حیات ڈال کر بنایا گیا ہے۔ درختوں حیوانوں اور انسانوں کو جن کی اصل مادّہ ہے، مادّے میں روح حیات ڈال کر بنایا گیا ہے۔

## ۵.۲ جواب دہ اور ذمہ دار روح

البتہ وہ مخلوقات جن کو اختیار وارادہ سے نوازا گیا ہے اور جو صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کر کے دونوں میں سے کسی کو اختیار کر سکتے ہیں ان کو ایک اور روح دی گئی ہے۔ ہم اس کو ذمہ دار یا جوابدہ روح کہتے ہیں۔ یہ روح خالق اور مخلوق کے درمیان شعوری تعلق کا لطیف ذریعہ ہے۔ ہمارے علم میں اس قسم کی صرف دو مخلوقات جن وانس ہیں۔ ان کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ اپنی مادّی بنیادی ضروریات ہی کی طرف تمامتر جھکے رہتے ہیں یا اُن ضروریات کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو ان کو وحی کے ذریعہ بتائی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم روح کی تین قسمیں کر سکتے ہیں۔

۱۔ کائناتی روح

۲۔ حیاتی امر یا حیاتی روح

۳۔ جواب دہ یا ذمہ دار روح

کائناتی روح ہر شئ میں موجود ہے کیونکہ اشیاء بنیادی طور پر کائناتی روح کی مکثوفات ہی ہیں۔ البتہ اب یہ کم از کم چار شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ کائناتی روح بحالتِ اصل ...... کائناتی روح کے کرہ کا بہت بڑا حصہ اب بھی

اپنی اصل حالت میں ہے جس میں خود اس کے ملکوفات قائم ہیں۔

۲۔ نور: اس حد تک تکثیف زدہ کائناتی روح کہ نور وجود میں آ گیا۔

۳۔ نار: اس حد تک تکثیف زدہ کائناتی روح کہ نار وجود میں آ گئی۔

۴۔ مادّہ: اس حد تک تکثیف زدہ کائناتی روح کہ مادہ وجود میں آ گیا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ جدول ۱ میں پیش کرتے ہیں۔ اس جدول کے مطابق پہلے تخلیقی امر سے کائناتی روح وجود میں آئی۔ دوسرا امر تدبیری بھی تھا اور تخلیقی بھی۔ اس امر کے ذریعہ کائناتی روح کی تکثیف کی گئی۔ چنانچہ کائناتی روح کے اندر نور، نار اور مادّہ ظاہر ہو گیا جب کہ اس کا بہت بڑا حصہ اب بھی اپنی اصل حالت پر باقی رہا۔ کائناتی روح کی ہر حالت کے کچھ جُز کو امر حیاتی یا روحِ حیاتی

جدول ۱ امر الٰہی، روح کی مختلف شکلیں اور حیات

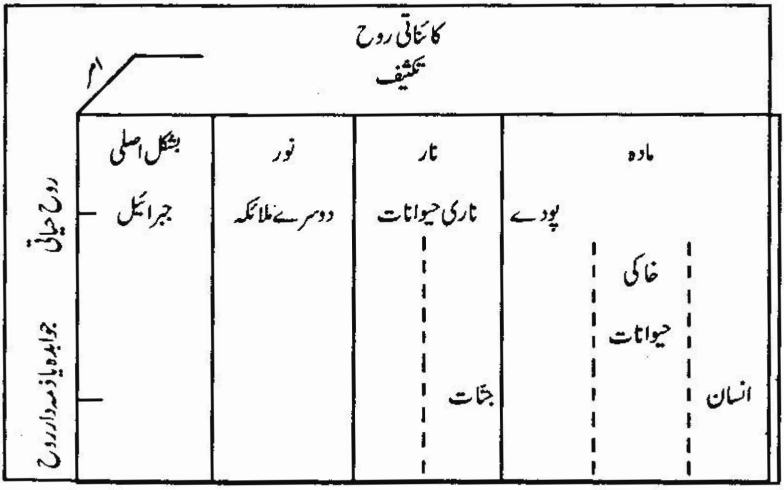


کے ذریعہ مخصوص ترتیب دے کر جبرئیل، دوسرے فرشتے، ناری جاندار اور مادّی جاندار پیدا کیے گئے۔ اب ایک اور قسم کی روح پیدا کی گئی جس کا نام جوابدہ یا ذمہ دار روح ہے جو ہر جوابدہ ناری مخلوق یعنی جنات اور جوابدہ مادّی مخلوق یعنی انسان کے لئے خاص تھی۔ یہ روح اپنے رب سے ہدایات وصول کرتی ہے اور جسد کی طرف اس ہدایت کو منتقل کرتی ہے

تا کہ وہ اپنے لئے زندگی کی راہ چن سکے۔ عہد الست میں اسی روح سے عہد کا تذکرہ ہے اور یہ جوابدہ شخص کی ذمہ داری میں حصہ بٹاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو انعام اور سزا دونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ موت کے وقت امر حیاتی یا روحِ حیاتی کو کھینچ لیا جاتا ہے۔ اس سے ہر زندہ چیز کو درد کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ مومنین و صالحین کے لئے اس درد میں کمی کردی جاتی ہے جب کہ کفار و غیر صالحین کے لئے اس میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ موت کے وقت جوابدہ روح کو بھی کھینچا جاتا ہے جس کا اس کو بھی درد ہوتا ہے۔ اس روح کو برزخ میں رکھا جاتا ہے جہاں وہ کسی شخص کے جسد میں داخل کئے جانے سے پہلے موجود تھی۔ معاد میں اس کو پھر جسم کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ ہماری اس تفہیم کے مطابق وہ روح جس کو برزخ میں رکھا جاتا ہے اور حمل کے چوتھے ماہ میں جنین کی طرف منتقل کیا جاتا ہے یا وہ روح جو حضرت آدمؑ میں پھونکی گئی تھی زندگی کی روح نہیں ہے۔ یہ وہ روح ہے جو کسی شخص کو ذمہ دار اور جوابدہ بناتی ہے۔ کیونکہ یہ روشنی کا منبع ہے جو اللہ سے روشنی وصول کر کے بندے کی طرف منتقل کرتی ہے۔ عہد الست اس ذمہ داری اور جوابدہی کی طرف واضح اشارہ ہے۔[۳۳]

<u>خلاصہ یہ کہ انسان کائناتی روح کا ایک مکشوفہ ہے جس کو روحِ حیاتی کے ذریعہ زندگی عطا کی گئی ہے اور جوابدہ روح کے ذریعہ جوابدہ بنایا گیا ہے۔</u>

## ۵.۲ لَوح و قلم

لوحِ محفوظ کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس کے لئے ام الکتاب (الرعد:۳۹، الزخرف:۴)، کتاب (الحدید:۲۲) کتاب مکنون (الواقعہ:۷۸) کتابٌ حفیظ (قٓ:۴) اور لوحٌ محفوظٌ (البروج:۲۲) جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ البتہ یہ کہاں موجود ہے اسکی طرف اشارہ احادیثِ رسول ﷺ سے ملتا ہے۔ مشیّت الٰہی کے اس اہم پہلو سے متعلق تصورات قائم کرنے میں ہم کو احادیثِ رسول ﷺ سے کسی حد تک مدد ملتی ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اللہ کی مشیّت دراصل اس کا پُرعلم و حکمت منصوبہ ہے۔ اس لحاظ

سے یہ اس کی ایک صفت ہے جس کو کوئی بھی شخص نہ دیکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے اس کے برخلاف لوح محفوظ ایک مخلوق ہے جو حالانکہ بالفعل نا قابلِ رسائی ہے لیکن اگر اس کو کسی خاص مخلوق (فرشتوں) تک کسی طرح پہنچا دیا جائے تو نا قابل مشاہدہ نہیں ہے۔ اب ہم رسول اللہ ﷺ کے اقول کی روشنی میں لوحِ محفوظ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں

۱۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا کہ اللہ نے زمین و سماوات کو بنانے سے پچاس ہزار برس پہلے تقدیریں بنائیں۔ ۳۴

۲۔ نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ارض و سمٰوات کی تخلیق سے دو ہزار برس پہلے کتاب لکھی''۔ ۳۵

۳۔ ولید بن عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا کہ اللہ نے پہلے قلم بنایا۔ پھر اس سے کہا لکھ۔ قلم نے پوچھا کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا ابد تک جو کچھ بنایا جائے گا اس کی تقدیر لکھ''۔ ۳۶

ان احادیث نبوی سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی منتزع مشیت یعنی خود اللہ کے باطن میں اس کا تخلیقی منصوبہ بحیثیت اس کی صفت علمی کے الگ شیٔ ہے اُس منصوبے سے جو لوحِ محفوظ نام کی کسی شیٔ پر قلم نام کی کسی شیٔ سے لکھ دیا گیا ہے۔ اللہ کی منتزع مشیت ازلی اور ابدی ہے جب کہ لوحِ محفوظ اور قلم زمان و مکان کی مخلوقات ہیں اور ہماری اصطلاح کے مطابق مصنوع مشیت کے درجے کی چیزیں ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ لوح و قلم کہاں ہیں۔ ذیل کی دو حدیثوں میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دونوں حدیثیں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں۔

۱۔ جب اللہ نے مخلوقات کو بنایا تو عرش پر اپنے پاس موجود کتاب میں لکھا: میری رحمت میرے غضب پر چھائی ہوئی ہے۔ ۳۷

۲۔ اللہ نے زمین آسمان کی تخلیق سے پہلے اپنے ہاتھ سے ایک تحریر لکھی اور اس کو اپنے عرش کے نیچے رکھا۔ اللہ نے اس میں لکھا'' میری رحمت نے میرے غصے کو

ڈھانک رکھا ہے“ ۳۸

ایک روایت کے مطابق لوح محفوظ عرش پر ہے جب کہ دوسری روایت کے مطابق یہ عرش کے نیچے ہے۔ ہمارے نزدیک ان روایات سے لوحِ محفوظ کی وسعت اور عرش سے قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابن کثیرؒ کے مطابق لوح محفوظ ملاء اعلیٰ کے قرب میں ہے اور ہر قسم کی زیادتی، کمی، تبدیلی اور پلیدگی سے محفوظ ہے ۳۹، ابن کثیرؒ ابن عباسؓ کے الفاظ کو بھی یوں بیان کرتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ سفید موتیوں سے بنایا ہے، اس کے صفحات سرخ یاقوت کے ہیں۔ اس کا قلم اور الفاظ نور ہیں“

حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبے کو کائناتی روح کی بیرونی سطح پر اس وقت کندہ کردیا جب کہ اُس کے اندر ناقابلِ مشاہدہ نور کا ظہور ہو چکا تھا۔ اسی نور کو کائناتی روح کے صفحات پر مکمل منصوبہ تخلیق کندہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ قلم نور ہے الفاظ نور ہیں جب کہ صفحات کائناتی روح کے موتی اور یاقوت سے بنے ہوئے ہیں۔ یہی کائناتی روح وہ واسطہ ہے جس کے ذریعہ لوحِ محفوظ کے نورانی الفاظ ساتویں آسمان تک منتقل کر کے مرکوز کردئے جاتے ہیں جہاں پر وہ ملاء اعلیٰ کے لئے قابلِ مشاہدہ ہو جاتے ہیں جو احکام وصول کر کے ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ فرشتے زندہ، باشعور اور متحرک مخلوق ہیں جن کو ناقابلِ مشاہدہ نور سے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ یہ اللہ کے ان احکام کو وصول کرنے کے لئے مناسب ترین مخلوق ہیں۔ اس کے علاوہ تمام عالم میں ملائکہ کے واسطے کے بغیر بھی اللہ کے احکام کائناتی روح کے درمیان سے گذرتے ہوئے جاری ہوتے رہتے ہیں جس کے لئے مکانی و زمانی ابعاد کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اذا اراد شیئاً اَنْ یقولَ لَهُ کن فیکون ۴۰

اب تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز کو بھول جائیے اور صرف اللہ کی مشیّت کو یاد رکھئے۔ اللہ کی مشیّت یعنی کائنات، اللہ کی مشیّت یعنی انسان، اللہ کی مشیّت یعنی انسان کا علم، اللہ

کی مشیّت یعنی انسان کی مشیّت ، اللہ کی مشیت یعنی انسان کی لاعلمی۔ انسان کو علم یا تو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے یا تجربہ کے ذریعہ۔ مشیت الٰہی کے سمندر میں مقیم انسان کو جسے خود اس کی مشیّت ملی ہوئی ہے اپنے اعمال کو مشیّت الٰہی کے مطابق کرنا اُن علوم کی روشنی میں جن کو علیحدہ علیحدہ علوم مشیّت اور علوم رضا کہتے ہیں۔

علومِ مشیّت انسان کے آگے میدانِ کار کے بڑے بڑے امکانات کھول دیتے ہیں۔ علوم رضا اُس کے اعمال کو صحیح رخ دیتے ہیں اور ان کی حد بندی کرتے ہیں۔ دونوں علوم کا ارتقاء وَحی اور تجربہ کی روشنی میں ہوتا ہے۔ علمِ رضا کردار سازی کرتا ہے، مقاصد و اصول عطا کرتا ہے مگر عملی انطباق کے لئے تجربہ چاہتا ہے۔ علمِ مشیّت امکانات وا کرتا ہے، نئے میدانِ کار کھولتا اور اُن کو وسیع کرتا ہے۔ لیکن اعمال کو مناسب حدود میں رکھنے کے لئے اور مقاصد و اہداف متعین کرنے کے لئے وحی کی ہدایت کا مرہونِ منّت ہے۔

## ۳۔ نظامِ رضا

نظامِ مشیّت ہی کی طرح نظامِ رضا بھی لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح علمِ مشیّت کو انسان پر آہستہ آہستہ کھولا گیا ہے اور نسلاً بعد نسلٍ انسان پر نت نئی جہاتِ عمل روشن کی گئی ہیں، نظامِ رضا کو بھی انسان پر آہستہ آہستہ منکشف کر کے ترقی کرتی ہوئی نسلوں کو ضرورت کے مطابق ہدایت دی گئی ہے۔ مختلف پیغمبروں کی تاریخ اور ان کی کتابوں کی تعلیم سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اول یہ کہ اصول ہمیشہ نا قابلِ تبدّل رہے ہیں۔ دوم یہ کہ اصولوں پر عمل درآمد کی شکلیں معاشروں کی ترقی یافتہ حالتوں کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر پیغمبر یکساں اصولوں کی پابندی کے ساتھ اپنے اپنے احوال میں راہِ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنی تعلیم میں ایسی گنجائشیں بھی رکھتا تھا کہ مستقبل میں نشوونما اور ترقی بھی ہوتی رہے اور ہر پیغمبر نے بدکردار لوگوں کو کنارے لگاتے ہوئے اور اچھے لوگوں کو تربیت دیتے ہوئے مزید ترقی و بہبود کے لئے مثبت طور پر جدوجہد کی ہے تا کہ مکمل خلافت وجود میں آسکے۔ یہ خلافت پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے دور

میں پوری آب و تاب کے ساتھ وجود میں آ گئی جہاں وحی، تجربہ اور علومِ رضا و مشیت مکمل توازن کے ساتھ یکجہت تھے۔

نظام رضا میں بھی وُہی لغت مثلاً امر، اذن، قضا وغیرہ استعمال ہوئی ہے لیکن انطباقی سطح پر اس قدر سخت مفہوم میں نہیں جس قدر نظام مشیّت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان مشیت کے خلاف عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر وہ کھائے، پیئے اور سانس لئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ البتہ وہ اللہ کی رضا کی خلاف ورزی بغیر کسی فوری نقصان دہ نتیجے کے کرسکتا ہے جب کہ مشیّت کی خلاف ورزی کے نتیجے میں فوراً یا تو موت واقع ہوسکتی ہے جیسا کہ گلا گھونٹ لینے کی شکل میں ہوتا ہے یا متواتر فاقہ کرنے کے نتیجے میں کمزوری اور آخرکار موت ہوجاتی ہے۔ فطرت، جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، مشیتِ الٰہی کی مصوّر و متشکل صورت ہے جس میں ایک اور مصوّر و متشکل مشیّت یعنی انسان واقع ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشیت یعنی انسان اور مشیت یعنی فطرت کے درمیان تعامل ہوتا ہے۔ البتہ مشیّت ''الانسان'' کو مشیّت ''الفطرت'' کے ساتھ تعامل کے لئے ہدایت درکار ہوتی ہے تاکہ وہ صحیح اور پورا فائدہ حاصل کرسکے۔ نظامِ رضا یہ ہدایت فراہم کرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مشین کے ساتھ وارنٹی اور کچھ ہدایتیں بھی ہوں۔ اب اگر یہ مشین ان ہدایتوں کے مطابق استعمال کی جاتی ہے اور اس سے کام لیتے وقت یا رکھی ہوئی حالت میں تمام تحفظاتی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں تو یہ یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ عرصہ وارنٹی کے دوران تمام فوائد حاصل ہونگے۔ فطرت کے ساتھ ہمارے عمر بھر کے تعامل سے متعلق یہ وارنٹی ہم کو نظامِ رضا سے فراہم ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مشین سے متعلق وارنٹی اور ہدایات کسی نہ کسی طرح اُن اصولوں اور بناوٹوں پر مبنی ہوتے ہیں جن پر مشین کو ڈھالا گیا ہے۔ نظامِ رضا بھی نظامِ مشیّت پر مبنی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام رضا بھی نظامِ مشیت ہی کا ایک رُخ ہے۔ اس کے باوجود دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

> ''یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح
> ذہن نشین ہوجانی چاہئے کہ قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور

اُس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیّت اور اس کے اذن کے تحت رُونما ہونا لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ اُس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اُس کے صدور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اُس کے صدور کی گنجائش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیّت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متقی انسان کا ایمان و تقویٰ بھی مشیّتِ الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیّت کے تحت رُونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دوسری قسم کے واقعات کو اُس کی رَضا اور اُس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔[۱۴]

نظامِ مشیّت و رضا کے تعلق سے انسانی افعال کی چار قسمیں ہوسکتی ہیں۔ اوّل وہ افعال جو دونوں ہی نظاموں کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان کے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ فوز و فلاح حاصل ہوتی ہے۔ دوم قسم وہ افعال جو صرف مشیّت کے مطابق ہوں وہ اس دنیا میں تو کامرانی کا ذریعہ بن جاتے ہیں مگر اُخروی کامرانی یقینی نہیں ہوتی۔ تیسری قسم کے افعال سے جو صرف نظام رضا کے مطابق کئے گئے ہوں اُخروی کامیابی یقینی ہوتی ہے مگر دنیوی کامیابی یقینی نہیں ہوتی۔ البتہ اس قسم کے افعال دنیوی سطح پر بھی کسی حد تک مؤثر ہوتے اور اچھے اثرات مرتب کرتے ہیں کیونکہ نظام رضا بھی بہر حال نظامِ مشیت ہی کا ایک رُخ ہے۔ چوتھی قسم کے افعال جو نہ تو رضا کے مطابق ہوں اور نہ مشیت کے مطابق، اُن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی موثر نہیں ہو سکتے کیونکہ نظامِ مشیت

کے نصرت کے بغیر کسی بھی عمل کا انجام تو محض وقت اور قوت کی بربادی ہوتا ہے۔ اس سے نہ تو دنیوی منفعت ہو سکتی ہے اور نہ اُخروی انعام مل سکتا ہے۔

البتہ انسانی جدّ وجہد میں بالعموم سبھی قسم کے افعال شامل رہتے ہیں۔ فرد و معاشرہ، دونوں سطح پر یہی صورتِ حال ہے۔ ایک فرد کے افعال زندگی بھر انہی اقسام کے درمیان اِدھر یا اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ معاشرے میں سب طرح کے افعال ہر وقت ہوتے ہیں۔ حکمت جیسی قیمتی چیز کو تمام معاشروں میں تقسیم کیا گیا ہے گو اِس تقسیم کا تناسب الگ الگ ہے۔ اسی طرح ہدایت سے سبھی معاشروں کو فائدہ پہنچتا ہے گو پیغمبر مخصوص علاقوں اور زمانوں ہی میں آتے ہیں۔ چنانچہ سبھی معاشروں میں مشیت اور رضا کا علم پایا جاتا ہے حالانکہ اس لحاظ سے سبھی معاشرے مختلف ہوتے ہیں کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو کس قدر اہمیت کمی و کیفی اعتبار سے دیتے ہیں۔ اسلامی نظامِ رضا میں کچھ بہت اہم اور اصولی تصورات اور اخلاقی ضابطے ہیں جن کے ذریعہ انسان کی عقلی، ارادی اور جسمانی قوتوں کی بحالی، ہدایت اور نگرانی ہوتی رہتی ہے تاکہ نظامِ مشیّت میں گھرے رہ کر زندگی گذارتے ہوئے اپنے تعامل کے دوران مسلمان تمام افعال کو متوازن رکھ سکیں۔ تصوراتی حصہ توحیدِ الٰہی، توحیدِ مشیت جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، تصورِ انسان، تصورِ علم اور تصورِ آخرت پر مشتمل ہے۔ اخلاقی ضابطوں میں حلال، حرام، مباح وغیرہ شامل ہیں۔ انسان جس کو خود اُس کی اپنی مشیت دی گئی ہے یا دوسرا الفاظ میں مشیت ''الانسان''، مشیّت ''الفطرت'' کے ساتھ تعامل کرتا ہے۔ اللہ کی فوری مشیت پردے کے پیچھے سے کام کرتی ہے۔ انسان کو اپنے دونوں علوم یعنی نظامِ رضا و مشیت کے علوم سے اخذ ہونے والی ہدایت کی تابعداری کرنی ہوتی ہے۔

## ۳.۱۔ نظامِ رضا کے تصوراتی اجزا

نظامِ رضا کے تصوراتی اجزا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا (۱) توحید الٰہی (۲) توحیدِ مشیّت ) (۳) تصورِ انسان (۴) تصورِ علم اور (۵) تصورِ آخرت ہیں۔

توحیدِ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ پوری کائنات کا خالق، پروردگار اور ہادی صرف ایک ذاتِ واحد، اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی اللہ نے ہی اس کائنات کو اپنی مشیت سے بنایا ہے اور وہی اس کو تنہا بغیر کسی اور خدا کی مدد اور دخل اندازی کے چلا بھی رہا ہے۔ اللہ کی وحدت کا کھلا ہوا اظہار اس کائنات کے مختلف مظاہر کے درمیان وحدت کی شکل میں ہوتا ہے جو اسی وجہ سے ممکن ہے کہ دنیا اللہ کی متحدہ مشیت کا نتیجہ ہے۔ مشیتِ الٰہی کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مشیت جیسا کہ اوپر مفصّل کیا گیا ہمیشہ مربوط اور تال میل کے ساتھ ہوتی ہے۔

تصورِ انسانی سے متعلق سب سے پہلے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا غلام (عبد) ہے۔[۴۲] دوسری اہم بات یہ کہ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے[۴۳]۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص بحیثیت فرد کے وراثتی اعتبار سے بھی اور تہذیبی اعتبار سے بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ متحد ہے اور یہ اتحاد تاریخ میں پیچھے کی طرف مسلسل ہے یہاں تک کہ تمام انسانوں کے ماں باپ ایک ہی بابا آدم اور امّاں حوا ہیں[۴۴]۔ چوتھی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مختلف خوبیاں انسانوں میں اس طرح تقسیم کردی ہیں کہ کچھ افراد دوسروں سے افضل ہوجاتے ہیں لیکن اصل فضیلت تقویٰ میں ہے[۴۵]۔ تمام انسانوں کا جدِ امجد میں اتحاد پوری انسانیت کو متحد کرتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو بالکل واضح ہے۔ البتہ عبد اور خلیفہ کا مفہوم بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

## ۳.۱.۱ انسان، عبد اور عبادت کا تصور

لغت میں عبادت کے معنی میں عاجزی، فروتنی اور ذلت جس کے برخلاف قوت، عزت اور شرف جیسے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں عبادت اللہ کی ایسی اطاعت کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ عاجزی، ذلت اور اللہ کی محبت شامل ہو۔[۴۶] اور اگر علم المشیت کی زبان اختیار کی جائے تو اس طرح کہنا مناسب ہوگا کہ مشیت 'الفطرت' میں زندگی گذارتے ہوئے مشیت سے 'الانسان' کا نظام رضائے الٰہی کی روشنی میں محبانہ

عاجزانہ شعوری اور مربوط تعامل عبادت ہے۔ انسان اس معنی میں اللہ کا عبد ہے کہ اس کو تمام تر عاجزی اور محبت کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنی ہے۔ اُسے اللہ کو راضی رکھنے کے لئے اس بتائے ہوئے نظام رضا کے مطابق اپنی زندگی کو رکھنا بھی ہے اور اس کے لئے دعا بھی کرنی ہے تاکہ دنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت وحمایت حاصل ہوسکے۔

## ۳.۱.۲۔ انسان کا تصور (خلیفہ)

انسان زمین پر اس معنی میں خلیفہ ہے کہ وہ یہاں ایک جاننے والی، بااختیار اور ذمہ دار مخلوق ہے۔ [۴۷] نظامِ مشیت سے متعلق معلومات اس کو بااختیار بناتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ مشیت 'الفطرت' کے بارے میں ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ چنانچہ وہ زمین اور اس کے ماحول کا نگراں ہوجاتا ہے جس کے لئے وہ جواب دہ بھی ہے [۴۸]۔ اپنی ذمہ داری سے عہدہ براہونے میں سرخرو ہونے کے لئے نظام رضا کا علم مددگار ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ نظامِ مشیت ورضا کا علم اس کو ابتدائی طور پر خلافت کا اہل بنادیتا ہے۔ جب وہ اپنی مشیت کو مشیت ورضائے الٰہی کے علم کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو عملاً ''فی الارضِ خلیفہ'' ہوجاتا ہے۔ چنانچہ فی الارضِ خلیفہ بہ یک وقت عبداللہ فی الارض بھی ہوتا ہے۔ نظامِ مشیت ورضا کے علوم آپس میں متحد و یکجہت ہیں جو زمین پر عبد اور خلیفہ کی حیثیت سے انسان کے مقصد اور کارکردگی کو حقیقت کا جامہ دینے میں معاون ومددگار ہوتے ہیں۔

## ۳.۱.۳ علم کا تصور

نظامِ مشیت کی موحدانہ اسکیم میں جہاں رضا اور مشیت کا علم اور ساتھ ساتھ وحی اور تجربہ باہم متحد و یکجہت ہوتے ہیں انسانی علم بھی واحد، بلاتفریق اور سالم ہوتا ہے۔ جس طرح وحی اور تجربہ مل کر ایک مضبوط علمیاتی اصول کی تعمیر کرتے ہیں اسی طرح یہ ایک ہی وجودیاتی اصول یعنی مشیت پر مبنی بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کو علیحدہ علیحدہ مشیت۔ الوحی اور مشیت۔ التجربہ کہا جاسکتا ہے۔ وحی مشیت ہے، تجربہ مشیت ہے، علم بھی مشیت ہے۔

انسانی علم ایک ہی علمیاتی اور وجودیاتی اصول یعنی مشیت الٰہی پر منحصر ہے۔ چنانچہ ہم صحیح طور پر مندرجہ ذیل باتیں کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ جس طرح تمام باشعور اور دوسری مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے زُمرے اور نظام ہیں اسی طرح انسانی علم بھی اللہ کی مشیت ہے۔

۲۔ انسانی علم اللہ کی مشیت اور اُس کی رضا کا علم ہی ہوتا ہے۔

۳۔ انسان کا علم اللہ کے قبضے میں موجود علم ہی ہوتا ہے کیونکہ

(ا) انسان کوئی بھی ایسی چیز نہیں جانتا جس کو اللہ نہ جانتا ہو۔

(ب) اللہ اپنی مشیت کو اس سے پہلے جانتا ہے کہ انسان اُس سے واقف ہو۔

(ج) علم حضورِ الٰہی میں ایک سمندر ہے، جس کا کچھ حصہ جب بھی وہ چاہتا ہے انسان کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

۴۔ انسانی علم اللہ سے متعلق علم ہے کیونکہ

(ا) اللہ کی مشیت کا علم اللہ کی ایک صفت کا علم ہے۔

(ب) اللہ کی بہت سی صفات کا بیان و اظہار نظامِ رضا و مشیت (اس کی تخلیق) میں ہوتا ہے۔

اسلامی نظامِ فکر میں علم صرف وجودیاتی اصول اور علمیات کے لحاظ ہی سے متحد نہیں ہوتا بلکہ یہ دوسری جانب ہدایت اور مقصد سے بھی ملحق ہوتا ہے۔ اسلامی درجہ بندی میں بے ہدایت اور بے مقصد علم کو کمتر درجہ ملتا ہے۴۹۔ قرآن اُس علم کی بہترین مثال ہے جس میں وجودیاتی علمیاتی اور اخلاقی ضابطہ بندی کے درمیان وحدت بلندترین درجہ پر پائی جاتی ہے اور انسان اپنے آپ کو تجلّیات الٰہی کا مطالعہ کرتا ہوا، ہدایت تلاش کرتا ہوا اور خود اپنے وجود اور اپنے علم کا مقصد معلوم کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ جب ایک مسلمان اس کائنات میں سفر کرتے ہوئے اور خلا میں دور تک اجسام کا مشاہدہ کرتے ہوئے تجربی علم حاصل کرتا ہے تو قرآن اُس کے لئے ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں وحی اور تجربہ متحد ہو کر انسانی افعال کو بامقصد نتائج تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح وحی اور تجربہ واحد

وجودیاتی اصول میں منحصر رہتے ہوئے علمیاتی اعتبار سے یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور انسانی افعال کو مل جُل کر راہ یاب کرتے ہوئے علم و عمل کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مشیت سے ہی ان کی ابتدا ہوتی ہے اور ہمیشہ مشیت ہی سے ان کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

## ۳.۱.۴۔ آخرت کا تصور

اللہ کی مشیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ موجودہ صورتوں اور شکلوں کو درہم برہم کر کے ہم کو ہمارے اعمال کا حساب چکانے کے لئے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسکی مشیت کا بالکل ہی مختلف نظام ہوگا، جو بالعموم آخرت کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں اس کی مشیت کے مختلف نمونے الگ الگ مقام یعنی جنت اور جہنم میں موجود ہوں گے جہاں وہ اپنی مہربانی اور غضب کا علیحدہ علیحدہ اظہار کرے گا۔ مشیت اور رضا کے درمیان جو باریک تعلق ہے یہاں اس کو بیان کئے دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص توحید، آخرت اور آسمانی ہدایت پر یقین کرنے لگتا ہے، جو دراصل نظام رضا کے لازمی اجزا ہیں، تو اُس شخص کے افعال مشیت الٰہی کے وسیع چوکھٹے سے مطابقت کرنے لگتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ذاتی مشیت (خواہش) کو اللہ کی مشیت میں جذب کر دیتا ہے اور اپنے افعال کو اُس عظیم مشیت کی مطابقت میں وحی اور تجربی علوم کی مدد سے ڈھال لیتا ہے۔ ایک مومن سے قوی امید کی جاتی ہے کہ وہ نظامِ مشیت میں امن و توازن برقرار رکھے گا۔ چنانچہ مومن سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے جو مشیت کا مثبت پہلو ہے۔ اس کے برخلاف ایک کافر اپنے جہل کی بنا پر نظامِ مشیت میں بے توازنی اور فساد برپا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے جو نظام رضا کا منفی پہلو ہے۔

## ۳.۲.نظامِ رضا اور اخلاقی ضابطہ

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ نظام رضا میں اخلاقی ضابطہ بھی شامل ہے۔ اس اخلاقی ضابطے سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سے اعمال حلال ہیں اور کون حرام۔ کون مباح

ہیں اور کون مستحب اور مکروہ وغیرہ۔ ان کی طویل فہرست قرآن اور سنت میں موجود ہے جب کہ وہ چیزیں بھی اس فہرست میں شامل ہیں جو قرآن اور سنت میں پیش کردہ اصولوں، ضابطوں اور نمونوں سے ماخوذ ہیں۔ یہ اقسام اور ان سے متعلق ہدایات ایک مکمل اور جامع نظام ہدایت فراہم کرتی ہیں کہ جس کی طرف رجوع کرنا کسی بھی اقدام سے قبل یا وقت، جسمانی یا فکری قوت کو صرف کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اشد ضروری ہے۔

حرام اور حلال کی ابتدائی فہرست تو بہت چھوٹی ہے۔ نظام مشیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق نت نئی معلومات میں اضافے کی روشنی میں، سائنس وٹکنالوجی میں بے شمار دریافتوں اور سائنسی اشیاء کی مختلف انواع واقسام میں تیز گام بہتات کے پیش نظر یہ ابتدائی فہرست بہت ہی کم معلومات فراہم کرتی ہے۔ تاہم اسلامی فقہ کے ایک بہت ہی اہم اور سود مند اصول، 'قیاس' کو استعمال کر کے بہت سے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور کسی بھی نئی دریافت کی پیداوار اور استعمال سے متعلق حلال، حرام، مستحب، مکروہ یا مباح کا حکم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ صحیح قیاس کے لئے اشیاء کے درمیان مماثلتوں اور فرق کی پہچان ضروری ہے جس کے لئے تجربہ لازم۔ اگر وحی کے ذخیرے میں یہ معلوم ہو کہ کیا چیز حلال یا حرام ہے اور کس بنا پر ہے تو علم وحی سے فائدہ اٹھانا بھی لازم ہے۔ قیاس کے ذریعہ نئی دریافتوں کی جائز، ناجائز اور مشروط جائز جیسی تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ مباح اشیاء کی بھی ایسی ہی درجہ بندی کی جاسکتی ہے اور ان کی پیداوار کو لائسنس کے ذریعہ قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ انسانی مشیت کو اللہ کی مشیت کے قریب تر کرنے کے یہ کچھ طریقے ہیں تاکہ دونوں کے درمیان عمدہ قسم کا ربط قائم ہوسکے۔ جیسا کہ اوپر زور دیا گیا یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس ربط کے لئے نظامِ مشیت ورضا اور وحی وتجربہ کا جامع علم درکار ہے۔

## ۳.۲.۱ نظام رضا اور مقاصدِ شریعہ

اسلام کے نظامِ رضا کے مطالعہ کی ایک متواتر تاریخ ہے۔ اس کی بنیادیں خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس رکھیں تھیں۔ اصحابِ کرامؓ نے اس

عظیم کام کو جاری رکھا اور ایسے بے شمار ماہرین چھوڑے جن کے ذہن تیز اور قلوب پاک تھے۔ اس مکرّم کام میں نسلیں لگ گئیں جس کے نتیجے میں کچھ اصول سامنے آئے جن میں سے ''مقاصدِ شریعہ'' بہت اہم ہیں۔ اور اصولوں کی طرح یہ بھی قرآن وسنت کی جامع تعلیمات ہی سے ماخوذ ہیں۔ قرآن کی بہت سی آیات میں احکام کے ساتھ ان کے فائدوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔۵۰ ان مخصوص آیات کی روشنی میں استقراء کے عمل سے ایک کلّیہ اخذ کیا گیا ہے، یعنی'' قرآنی تعلیمات اور اسلامی شریعت با مقصد ہیں'' اس کلّیہ کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت کے چھ مقاصد بیان کئے گئے ہیں جن میں دورِ حاضر کی ترقیات اور انسانی افعال کے میدانوں میں وسعت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال چھ مقاصد ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ عقل کا تحفظ

۲۔ زندگی کا تحفظ

۳۔ دولت کا تحفظ

۴۔ حسب نسب کا تحفظ

۵۔ عزت وناموس کا تحفظ

۶۔ اسلامی عقیدہ اور مومنین کے طریقے کا تحفظ

مذکورہ بالا فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مقاصدِ شریعہ میں اقدار سے بھرپور عقلیت اور عالمگیریت پائی جاتی ہے۔ اِن مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نظام رضا میں پیش کردہ قوانین (جن میں مُثبت اور منفی احکام شامل ہیں) مشیأتی سچائیوں پر مبنی ہیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ قرآن اور سنت میں موجود ہے، اور باقی کو ہم تجربات کی روشنی میں معلوم کر سکتے ہیں۔ وہ ہستی جس کی مشیت پوری کائنات میں عمل پیرا ہے اچھی طرح واقف ہے کہ انسان جس کو خود اس کی اپنی (یقیناً بہت چھوٹی سی) مشیت ملی ہوئی ہے اللہ کی عظیم مشیت کے درمیان کس طرح عمل پیرا ہو کہ نہ تو نظام فطرت میں کوئی خلل واقع ہو، نہ معاشرتی تنظیم میں اور نہ انفرادی صحت کو خطرہ لاحق ہو۔ چنانچہ نظام مشیت

میں عمل پیرا ہونے کے لئے انسان کو نظامِ رضا کے ذریعہ جو رہنمائی ملتی ہے انسانی عقل کے ذریعہ اس کو سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ دونوں نظاموں کے درمیان تال میل ہے اور جیسے ہی انسان نظامِ رضا کی رہنمائی میں قدم بڑھاتا ہے وہ لازماً تال میل کے فوائد کا تجربہ کرتا ہے۔

## ۲.۲.۳ نظامِ مشیت اور مقصد

قرآنِ کریم جو اصلاً علومِ رضا کا ماخذ ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ نظام مشیت آیات سے پُر ہے۔ نظام مشیت کی یہ آیات اللہ کی توحید، اس کی قوت، علم وحکمت، رحم وکرم، انصاف اور مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہاں ہم نظام مشیت میں مقصد کی موجودگی پر گفتگو کریں گے کیونکہ جدید علوم کو فطرت میں مقصد کی موجودگی سے انکار ہے۔ گو علم اور عقلیت سے متعلق ہمارا تصور سائنسیت اور نیچریت کے ذریعہ متعین نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے نزدیک نظامِ مشیت سائنسی تصور فطرت میں محدود نہیں ہے، پھر بھی یہاں مقصد پر اپنی بحث کو ہم نیچر کی سطح تک ہی محدود رکھیں گے۔ اس سے ہم کو یہ بات سمجھنے میں مدد ملے گی کہ سائنس کے زیرِ مطالعہ رہنے والی نیچر کی سطح پر بھی مقصد کا وجود ظاہر وباہر ہے اور سائنس باوجود اس دعوے کے کہ اُس میں اقدار نہیں ہوتیں وہ نیچر میں مقصد کے وجود سے صرف نظر نہیں کرسکتی گو اِس نے اس حقیقت کو بڑی حد تک کنارے ضرور کردیا ہے۔ مقصد جو ایک قدر ہے نیچر کا لازمی جز ہے اور سائنس اس سے تجاہل برت کر قطعی طور پر مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔

ذیل میں دی گئی اسکیم (تصویر ۵) جو فطرت کی ہم آہنگی کا مظہر ہے، بتاتی ہے کہ فطرت کا ہر مظہر صرف علّت ومعلول کے سلسلوں میں پیوستہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر مظہر کو ایک متعین مقصد بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ سورج پودوں کو قوت پہنچاتا ہے پودے جو پتیوں کے ذریعہ اس قوت کو جذب کرتے ہیں بالعموم پھیلی ہوئی پتیاں رکھتے ہیں تاکہ قوت کو جذب کرنے کے لئے زیادہ سطح موجود رہے تو زیادہ سے زیادہ قوت جذب ہو اور زیادہ سے زیادہ غذا تیار ہوسکے۔ زندگی کا عمل چونکہ ہر خلیے میں ہوتا ہے تو انہیں مسلسل قوت کی رسد درکار ہوتی ہے جس کے لئے پودوں میں ایک بہت ہی پیچیدہ نظامِ نقلِ غذا پایا جاتا ہے۔

اس نظامِ نقل کے ذریعہ تنے، جڑ اور پھولوں تک غذا پہنچائی جاتی ہے۔ پھولوں میں بیج بنتا ہے جو پودے کی بقائے نسل کا ضامن ہوتا ہے۔ بیج بننے سے پہلے گُل زیرہ ایک پھول سے دوسرے پھول تک پہنچانے کے لئے ہوا اور بھنگے مددگار ہوتے ہیں۔ بھنگوں کی کشش کا باعث پھولوں کا رنگ اور ان کی خوشبو ہوتی ہے۔ رات میں کھلنے والے پھول بالعموم سفید اور تیز مہک والے ہوتے ہیں تاکہ بھنگے دور ہی سے کھنچے چلے آئیں اور پھر رات کی سیاہ چادر پر سفید پھول ان کو آسانی سے نظر آجائیں۔ اس کے برخلاف دن میں کھلنے والے پھول شوخ رنگ ہوتے ہیں تاکہ دن کی چمک میں وہ بھنگوں کو اچھی طرح دکھائی دیں۔

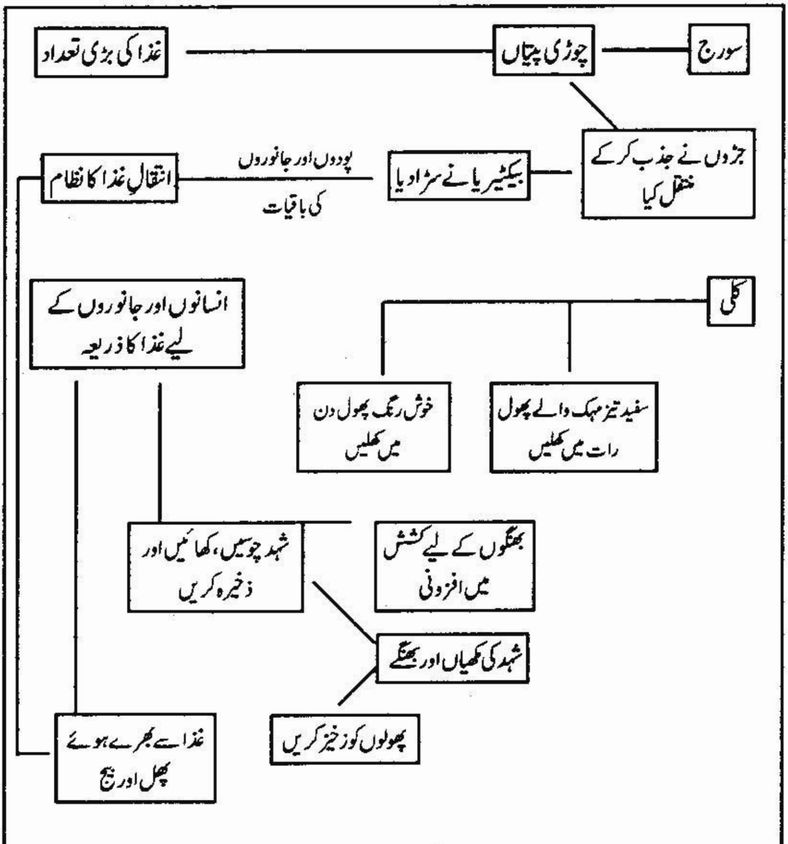


تصویر......۵

بھنگوں کو خود اپنے لئے پھولوں سے شہد جمع کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح پھولوں اور بھنگوں کے درمیان دوطرفہ دوستی ہوتی ہے جس کا دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ اُدھر بیج بننے کے لئے بھی غذا درکار ہوتی ہے جو پھل سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ زیرہ کاری اور بارآوری کے بعد پھل اور بیج ساتھ ساتھ ترقی پاتے ہیں۔ پھل میں جمع شدہ غذا بیج کے دَل کو ترقی دینے میں مددگار ہوتی ہے جب کہ دَل ایمبریو embryo کو غذا فراہم کرتا ہے۔ پھل اور دَل میں ذخیرہ شدہ غذا جانوروں اور انسانوں کے کام بھی آتی ہے۔ اس طرح زندہ فطرت کے تمام افراد کے درمیان بہت قریبی، دوطرفہ اور بامقصد اشتراکِ باہم پایا جاتا ہے۔ بامقصد فطرت کا ہر جز ایک دوسرے کے مقاصد کو بلاواسطہ یا بالواسطہ پورا کر رہا ہے۔ کُل نظام مشیت بامقصد ہے جس کا ایک جُز انسان بھی ہے۔

## ۳.۲.۳ اسلامی عقلیّت، علم اور مقصد

مذکورہ بالا مباحثہ ایسی عقلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں علم اور مقصد باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اسلامی عقلیت میں نہ تو بے مقصد علم کا کوئی مقام ہے اور نہ بے علم مقصد کی کوئی گنجائش۔ اسلام میں علم کا اوّلین ہدف اور اہم ترین مقصد دل و دماغ اور عمل میں توحید کو قائم و دائم کرنا ہے۔ ہمارے گرد وپیش کی دنیا میں اللہ کی آیات ہیں۔ اللہ کی ذات ایک ایسی حیران کن حقیقت ہے جس کو عقل نہیں سمجھ سکتی، پھر بھی اس کو قرآن، سنت اور مطالعہ فطرت کی مدد سے کسی حد تک قابلِ فہم کیا جاسکتا ہے۔ اس روشنی کے بغیر عقلیت نام کی کوئی بھی شئ اسلامی عقلیت نہیں ہوسکتی۔ سائنسی عقلیت جس میں توحید کا کوئی تصور نہیں، جو بے اقدار تصور علم کے لئے کوشاں ہو، وہ سائنس جو مذہب سے لاتعلق ہو، عقلیت کے بار بار دعووں کے باوجود اسلامی نظامِ افکار میں عاقل نہیں سمجھی جاسکتی۔ حقیقت جو خود محیر العقل ہے صرف ان لوگوں پر منکشف ہوتی ہے جو

۱۔ قومٍ یعقلون۔ [۵۱]

۲۔ اولو الالباب [۵۲]، متوسمین [۵۳]، اور قوم یفقهون [۵۴] ہیں۔

۳۔قومٍ یتفکرون ۵۵؎

۴۔قومٍ یومنون ۵۶؎ ہیں

وہ لوگ جو قرآنی عقیدۂ توحید کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں وہ قرآن کے بیان کے مطابق

۱۔ جاہل ۵۷؎

۲۔ جانوروں سے بدتر ۵۸؎

اور

۳۔ایسے گدھے ہیں جن پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ ۵۹؎

اور اس حقیقتِ واقعہ کا اطلاق مستند فلاسفہ اور سائنسدانوں پر تو کیا بلکہ مذہبی شخصیتوں پر بھی ہوتا ہے۔ ۶۰؎

عقیدہ توحید میں یہ بھی شامل ہے کہ فطرت میں ایک آزاد، خودمختار اور قوی ارادہ (مشیت) کام کرتا ہے اور یہ ارادہ بامقصد بھی ہے۔ اس سے بامقصد فطرت کا تصور سامنے آتا ہے۔ وہ سائنس جو مقصد پر یقین نہیں رکھتی اور صرف علّت و معلول کے سلسلوں پر منحصر رہتی ہے قرآن و سنت کی روشنی میں اس کو دانش اور حکمت جیسی صفات سے سرفراز نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی مشیت بے حس فطرت کے ساتھ تعامل نہیں کرتی بلکہ اس کو اللہ کی عظیم مشیت کے رُوبہ رو ہونا پڑتا ہے۔ توحید کے اس عقیدے کے بغیر نہ عقل کا وجود ہو سکتا ہے، نہ حکمت کا اور نہ حقیقی سائنس ہی وجود میں آ سکتی ہے۔

## ۴۔مشیتِ الٰہی ایک محیط الکل، ازلی اور ابدی عامل

اسلامی عقائد کے نظام میں مشیتِ الٰہی ایک محیط الکل، ازلی اور ابدی عامل ہے، باوجود اُن مراعات کے جو انسان کی چھوٹی سی مشیت کو عظیم الشان مشیت میں عطا کی گئی ہے۔ عالمِ غیب، عالمِ مشاہدہ اور انسانی میدانِ کار میں ہر واقعہ اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ انسانی اعمال ہمیشہ مشیتِ الٰہی کی حد بندیوں اور امداد کے زیر تاثیر اور نتائج ہمیشہ مشیت

الٰہی کی گرفت میں رہتے ہیں۔ یہ تحدید اور گرفت مصوّر مشیت کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے جس کا علم انسان حاصل کرتا رہتا ہے اور براہ راست اُس فعّال مشیت کے ذریعہ ہوتی ہے جس کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوتا اور جس کی وجہ سے انسان اپنی کامیابی کے تعلق سے ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتا ہے۔ اِس فوری مشیت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے بظاہر پُراعتماد علم اور عمل میں ہمیشہ اغلبیت کا عنصر شامل رہتا ہے۔ اِس اغلبیت میں اُس جہل کی کارفرمائی سے مزید اضافہ ہوتا ہے جو اکثر مصنوع نظامِ مشیت سے متعلق علمی دعووں میں شامل ہوتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اغلبیت نہیں ہوتی اور وہ اچھی طرح واقف ہوتا ہے کہ انسانی عمل بہرحال اس کی مشیت کے مطابق ہی انجام پذیر ہوگا۔

يَعْلَمُ مابينَ ايديهم وَمَا خَلْفَهُم وَلاَ يـحيطُونَ بشَيءٍ مِنْ عِلْمِه الاّ بِمَاشآءَ (البقره: ۲۵۵)

جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اُس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی، اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے۔

وَمَاتَشآؤنَ اِلاّ اَنْ يَّشآءَ اللّٰهُ ربُّ الْعَالَمِيْنَ. (التكوير : ۲۹)

اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ ربُّ العالمین نہ چاہے۔

## حواشی ومراجع


۱۔ آل عمران: ۲۶، ۴۰، ۷۷؛ المائدہ: ۱۷؛ الاعراف: ۱۸۸؛ یونس: ۴۹؛ ہود: ۱۰۷؛ الفرقان: ۴۵؛ الزمر: ۶۸؛ الدہر: ۳۔

۲۔ البقرہ: ۱۱۷؛ آل عمران: ۴۷، ۵۹؛ الانعام: ۷۳؛ النحل: ۴۰؛ مریم: ۳۵؛ الانبیاء: ۶۹؛ یٰس: ۸۲؛ المومن: ۶۸۔

۳۔ الانبیاء: ۵۵؛ الاعراف: ۱۴۳۔

۴۔ عبدالرشید، مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۹، جلد۳، لفظ شآءَ۔
۵۔ النحل: ۴۰؛ یٰس: ۳۸۔
۶۔ البقرہ: ۱۱۷؛ آل عمران: ۴۷؛ مریم: ۳۵؛ المومن: ۶۸۔
۷۔ عبد الرشید، محولہ بالا۔ جلد ۵، لفظ قضٰی۔
۸۔ الاعلیٰ: ۱-۳؛ الفرقان: ۲۔
۹۔ الانعام: ۹۶؛ یٰس: ۳۸۔
۱۰۔ الاعراف: ۵۴؛ ابراہیم: ۳۲؛ النحل: ۱۲، ۶۹؛ الجاثیہ: ۱۲۔
۱۱۔ یونس: ۱-۳۔
۱۲۔ یونس: ۳۱۔
۱۳۔ الرعد: ۲۔
۱۴۔ السجدہ: ۴-۵۔
۱۵۔ عبدالرشید، جلد ۱، لفظ اذن۔
۱۶۔ القدر: ۴۔
۱۷۔ الانفال: ۷۔
۱۸۔ الانفال: ۴۲-۴۳۔
۱۹۔ الانفال: ۴۳-۴۴۔
۲۰۔ الانفال: ۹۔
۲۱۔ الانفال: ۱۱۔
۲۲۔ آل عمران: ۱۵۲۔
۲۳۔ آل عمران: ۴۹؛ المائدہ: ۱۱۰؛ ابراہیم: ۱۱؛ سبا: ۱۲۔
۲۴۔ یوسف: ۸۷؛ الواقعہ: ۸۹۔
۲۵۔ النحل: ۲؛ المومن: ۱۵؛ الشوریٰ: ۵۲۔
۲۶۔ البقرہ: ۸۷، ۲۵۳؛ المائدہ: ۱۱۰؛ النحل: ۱۰۲؛ الشعراء: ۱۹۳؛ النبا: ۳۸؛ البینۃ: ۴۔
۲۷۔ النساء: ۱۷۱؛ الانبیاء: ۹۱؛ التحریم: ۱۲۔

۲۸۔ الحجر:۲۹؛السجدہ:۹؛ص:۸۲۔
۲۹۔ بنی اسرائیل:۸۵۔
۳۰۔ النجم:۵-۶،التکویر:۲۱
۳۱۔ شبیر احمد عثمانی۔ القرآن الکریم وترجمة معانیہ وتفسیرہ اِلی اللُّغةِ الاردیة، مُجَمَّع المَلِک فهد لِطَباعةِ المُصحَفِ الشریف ،(۱۹۸۹)،ص:۳۸۸۔
۳۲۔ ملائکہ کی اصل نور ہے۔اس کے ثبوت کے لئے دیکھئے۔صحیح مسلم بحوالہ مشکوۃ شریف تالیف ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب ،عربی اردو ترجمہ از عبدالحکیم خاں اختر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ،سوئی والان ،نئی دہلی ۔ جلد۳، کتاب الفتن ، باب بدء الخلق ،حدیث ۵۴۵۶،ص:۱۰۷۔
۳۳۔ الاعراف:۱۷۲۔
۳۴۔ جامع ترمذی۔''ابواب القدر ''اردو ترجمہ بدیع الزماں،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئی والان ،نئی دہلی (۱۹۸۳) جلد ا،ص:۷۹۹۔
۳۵۔ مسند احمد ،جلد۴،ص:۲۷۴(پرانی مصری طباعت)۔
۳۶۔ جامع ترمذی۔گذشتہ ص:۷۹۸۔
۳۷۔ مسند احمد ،گذشتہ۔جلد۲،ص:۲۶۰۔
۳۸۔ حوالہ سابق،ص:۳۹۷۔
۳۹۔ ابن کثیر۔تفسیر القرآن الکریم ،داراحیاء الکتب العربیۃ،عیسی البابی حلبی و شرکاءہ،الجزء الرابع،ص ص ۹۷-۴۹۶
۴۰۔ یٰس:۸۲۔
۴۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،(۱۹۸۲)،حاشیہ ۸۰ برائے آیت ۱۱۲ سورہ الانعام،ص:۵۷۳۔
۴۲۔ الذاریات:۵۶۔
۴۳۔ البقرہ:۳۰۔
۴۴۔ النساء:۳۰۔

۴۵۔ الحجرات:۱۳۔

۴۶۔ عبد الرشید ،مکمل لغات القرآن، جلد۴، ص:۲۱۱ تا ۲۱۴۔ مزید ملاحظہ کریں عبدالحق انصاری، ''مقاصدِ زندگی کا اسلامی تصور'' مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، (۱۹۸۰)،ص:۴۳ تا ۵۳۔

۴۷۔ البقرہ:۳۰۔خلافت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے ملاظہ کیجیے مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع،شبیر احمد عثمانی،سید قطب اور ابوالاعلیٰ مودودی کی تفاسیر۔

۴۸۔ ایضاً۔ اسلامی سائنس کے موضوع پر ملاحظہ کیجئے جنرل آف اسلامک سائنس علی گڑھ میں مختلف مفکرین کے شائع شدہ مقالات۔

۴۹۔ Nasr, S.H "Knowledge and the Sacred" Edinburgh University pres, Edinburgh (1981), Preface and Chapters 1-4. Also see Khurshed Anwar, "The Epistemology of Iqbal, Iqbal Academy, Pakistan, Lahore (1996)

۵۰۔ البقرہ:۱۷۹؛ الانبیاء:۱۰۷؛ العنکبوت:۴۵؛ الحدید:۲۵؛ الحشر:۷۔

۵۱۔ البقرہ:۱۶۴۔

۵۲۔ آل عمران:۱۹۰۔

۵۳۔ الحجر:۷۵۔

۵۴۔ الانعام:۵۸۔

۵۵۔ الرعد:۳؛ النحل:۱۱،۶۹؛ الروم:۲۱؛ الزمر:۴۲؛ الجاثیہ:۱۳۔

۵۶۔ یونس:۱۰۱؛ النحل:۷۹؛ النمل:۸۶؛ العنکبوت:۴۴،۶۹؛ الروم:۳۷؛ الزمر:۵۲۔

۵۷۔ البقرہ:۱۳،۱۳۰،۱۴۲؛ النساء:۱۱۱؛ الاعراف:۱۳۸،۱۵۵۔

۵۸۔ الانفال:۲۲،۵۵؛ الفرقان:۴۴۔

۵۹۔ الجمعۃ:۵۔

۶۰۔ الجمعۃ:۵۔

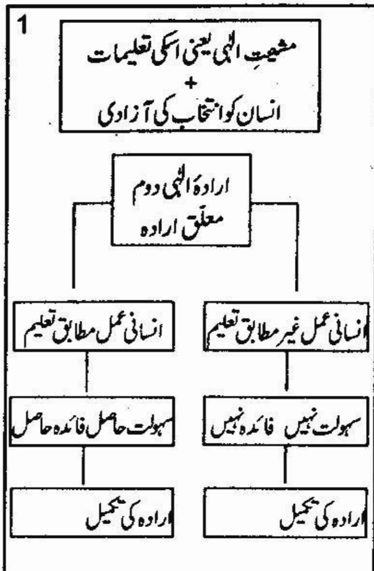


تصویر ۱: مشیت اور ارادہ دوم کے درمیان تعلق

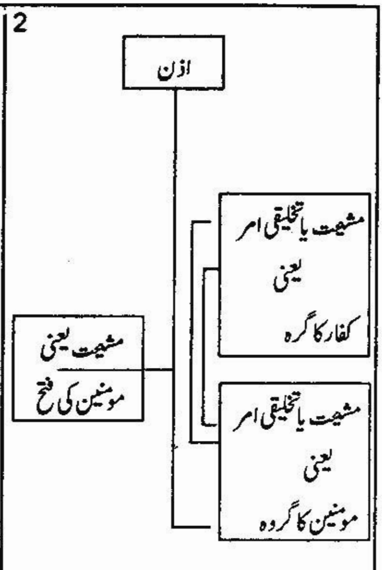


تصویر ۲: مشیت کے دو زمروں میں تعامل اور اذن کی حصہ داری

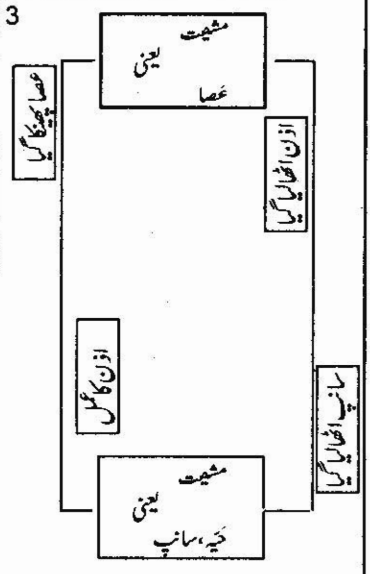


تصویر ۳: معجزات کی تمثیلی تعبیر: عصائے موسیٰ

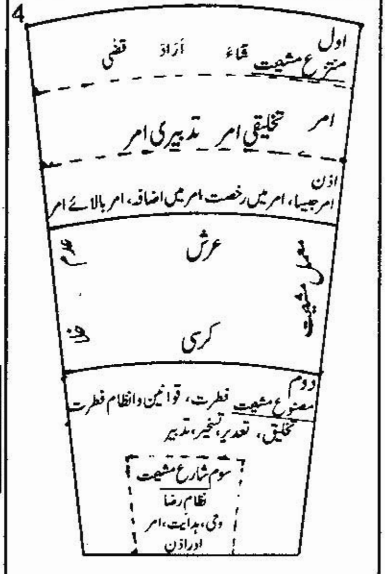


تصویر ۴: نظام مشیت و رضا کا نقشہ

# تیسری دنیا۔ قرآن کی روشنی میں

سلطان احمد اصلاحی

آج کی علمی اور سائنٹیفک دنیا میں ایک اصطلاح 'تیسری دنیا' کی استعمال کی جاتی ہے۔ تحریر کی طرح تقریر میں بھی اس کا اسی طرح رواج ہے۔ اور خواص سے اتر کر عوام میں بھی اب معمول کی بول چال میں اس کا اسی طرح بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں قرآن کی روشنی میں اس کا تجزیہ مقصود ہے۔ اللہ کی کتاب اس کو کس نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی روشنی میں اس کی کیا تصویر سامنے آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک حامل قرآن، متبع قرآن کا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ یہ اصطلاح اپنے آپ اس سے پہلے پہلی اور دوسری دنیا کی تفصیل کا تقاضا کرتی ہے۔ ظاہر ہے جب کوئی پہلی دنیا ہوگی اس کے بعد ہی دوسری اور تیسری دنیا کا نمبر آئے گا۔ سو اس اصطلاح کے ایجاد کرنے والے یورپ اور امریکہ کے ممالک کی طرف سے خود اس کی تشریح کردی گئی ہے۔ اس لیے اس کے سلسلے میں کسی قیاس اور تکا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عصر حاضر کے ذہن سازوں نے اصطلاح کو وضع کر کے علمی دنیا کے مارکٹ میں اس کو اتار دیا ہے۔ باقی دنیا کا کام ہے کہ وہ اس کی پیروی کرے اور اس کی مسلسل تکرار اور اعادہ سے اس کو مسلمات کے دائرے میں شامل کرادے۔ جیسا کہ دہشت گردی (Terrorism) اور بنیاد پرستی (Fundamentalism) جیسی اصطلاحات کا معاملہ ہے کہ اب وہ معاصر دنیا کی مسلمہ اصطلاحات ہیں جن کے مالہ و ماعلیہ پر کچھ بہت زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ زبان اور قلم سے جو بات بھی نکلے وہ اپنا تجزیہ چاہتی ہے۔ اور جب تک تجزیے کی خراد پر اس کا کھرا ہونا ثابت نہ ہو جائے، صرف پروپگنڈے کے زور سے اس کا اعتماد

اور استناد قائم نہیں ہوتا۔ یہی کچھ حال زیر گفتگو اصطلاح 'تیسری دنیا' کا بھی ہے۔

## معاشی اور مادی بنیادوں پر تقسیم

معاصر دنیا کو یہ جو تین دنیاؤں میں تقسیم کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں پہلی اور دوسری دنیا کے بعد تیسری دنیا وجود میں آئی ہے۔ تہذیب انسانی کے آج کے معماروں کی طرف سے دنیا کی یہ تقسیم خالص مادی اور معاشی بنیاد پر کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے لحاظ سے دنیا کے وہ ممالک جو معاشی خوش حالی اور مادی اور سائنٹیفک ترقی میں بلندی کے ایک خاص درجے پر پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ پہلی دنیا کے ممالک ہیں جن میں یک قطبی دنیا کے واحد سپر پاور امریکہ عظمیٰ کے علاوہ برطانیہ، جرمنی، فرانس، اسپین، سوئزرلینڈ جاپان اور کوریا جیسے ممالک شامل ہیں۔ دوسری دنیا میں روس اور چین جیسے دوسرے ممالک ہیں جو معاشی خوش حالی اور مادی اور سائنٹیفک ترقی میں ان ملکوں سے قدرے پیچھے ہیں۔ انہی میں مشرقی یورپ کے اکثر ممالک ہنگری، پولینڈ، چکوسلواکیہ، آسٹریا وغیرہ کے علاوہ سوویت یونین سے آزاد ہوئے وسطی ایشیاء کے ممالک قزاقستان، ازبکستان، تاجکستان، یوکرین اور لتھوانیا وغیرہ شامل ہیں۔ اسی فہرست میں مشرقی وسطیٰ کے عرب ممالک شام، لبنان، سعودی عرب، بحرین، یمن اور دبئی اور کویت وغیرہ کے عرب ممالک ہیں، جن کا معاشی خوش حالی میں کسی قدر نام لیا بھی جائے تو مادی اور سائنٹیفک ترقی میں یہ پہلی دنیا کے مقابلے میں کہیں کھڑے نہیں ہوتے ہیں۔ عراق، ایران اور مصر جیسے عرب اور اسلامی ممالک بھی اسی دوسری دنیا کے زمرہ میں آتے ہیں۔

تیسری دنیا میں ہندوستان سرفہرست ہے۔ اور اسی کے زمرے میں جنوبی ایشیاء کے اس کے پڑوسی ممالک پاکستان اور بنگلہ دیش نیز برما، نیپال، سری لنکا کے علاوہ ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ جنوبی ایشیاء کے سبھی ممالک اور تقریباً پورا افریقہ اسی زمرہ میں آتا ہے۔ اس زمرے کے ہندوستان اور پاکستان دونوں نیوکلیر پاور ہیں خاص طور پر ہندوستان جو اپنے بے پناہ معاشی امکانات، نفری قوت اور سائنٹیفک ترقی کے اعتبار سے بڑی اونچی جگہ پر

کھڑا ہے، لیکن ایک ارب سے اوپر کی اپنی بہت بڑی آبادی کے سبب اس کے وسائل اس کی آبادی کا ساتھ نہیں دے پاتے اور آزادی کے بعد اس کی غیر معمولی ترقی کے باوجود اس کی غریب ملک کی شناخت بڑی حد تک قائم ہے۔ یہی بات اس کے دوسرے پڑوسی پاکستان کے سلسلے میں صادق آتی ہے۔ سب سے خراب حال افریقہ کے ممالک کا ہے جو اپنے بہت سارے وسائل اور ذخائر کے باوجود غربت وافلاس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور درجہ کے فرق سے پورا براعظم افریقہ اپنی یہی شناخت رکھتا ہے اور اسی کے حوالہ سے اس کی پہچان کی جاتی ہے۔ جب کہ پہلی دنیا کا حال ہے کہ اس نے اپنی شناخت کو مزید نمایاں اور مستحکم کرتے ہوئے اپنی معاشی ترقی کو مزید تیز رفتار کرنے کے لیے گروپ سات (G7) اور گروپ آٹھ (G8) کے الگ بلاک بنا رکھے ہیں۔[1] یہ گویا پہلی دنیا کے بھی نمبر ا ممالک ہیں جو باقی دنیا کے لیے ایک مثال اور منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوپر پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ بالکل بے لچک نہیں ہے، چناں چہ چین اور روس جیسے دوسری دنیا کے ممالک کو پہلی دنیا میں شامل سمجھا جاسکتا اور تیسری دنیا کے ملیشیا اور انڈونیشیا کو دوسری دنیا میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بہرحال موٹے طور پر معاصر دنیا کی پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی یہی تقسیم ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر تحریر، تقریر اور گفتگو میں ہر جگہ ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔

## اسلام اور قرآن کا نقطۂ نظر

لیکن اسلام اور 'قرآن' کے لیے دنیا کی یہ تقسیم قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح کسی فرد کے معزز اور محترم ہونے کے لیے اس کا ایمان اور عمل بنیاد ہے۔ ممالک اور دنیا اور علاقوں اور خطوں کی تقسیم میں بھی ادنیٰ اور اعلیٰ کی شناخت کے لیے وہ اسی ایمان اور عمل کو بنیاد اور معیار تسلیم کرسکتا ہے۔ پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی یہ تقسیم اگر مادی وسائل اور سائنٹیفک اور صنعتی ترقی کی صراحت کے ساتھ ہو تو کوئی حرج نہیں کہ یہ امر واقعہ کا بیان ہوگا۔ اور جو دنیا کی جس ترقی کے لحاظ سے آگے اور پیچھے ہوگا

اس کو اس کے اسی مقام پر رکھا جائے گا۔ جس طرح کہ اسی طرح کے پس منظر میں ترقی یافتہ (Developed) اور ترقی پذیر (Developing) ممالک کی دوسری اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں حرج نہیں ہے۔ لیکن پہلی، دوسری کے ساتھ تیسری دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر چہ یہ تقسیم بھی ہے خالص معاشی اور مادی بنیاد پر۔ لیکن اس کا بیان اور اظہار جس طرح سے کیا جاتا ہے اس میں پہلی دنیا کے ساتھ معاشی اور مادی ترقی اور برتری کے پہلو بہ پہلو ذہنی اور نفسیاتی برتری اور بالا دستی کو اسی طرح شامل سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ تیسری دنیا کے تذکرے میں اس کے برعکس معاشی اور مادی پسماندگی کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی پستی اور پسماندگی کو بھی اسی طرح شامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ چناں چہ 'پہلی دنیا' کے کسی ملک سے وابستگی کا مطلب ہی ہے کہ آدمی کا سر فخر سے اونچا رہے اور دوسروں کے مقابلے میں اس کو اپنا قد بلند دکھائی دے۔ جب کہ 'تیسری دنیا' کے کسی ملک سے وابستگی کا مطلب ہے کہ صنعتی پسماندگی اور معاشی بدحالی کے ساتھ اسی طرح وہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر بھی بدحال اور پریشان حال ہے۔ اللہ کی آخری کتاب کو بلندی اور پستی کا یہ معیار تسلیم نہیں۔ اور فرد کی طرح کسی معاشرے، قوم، خطے، علاقے اور ملک کے سلسلے میں بھی یہی بات اسی طرح صادق آتی ہے۔ مختلف قوموں اور قبیلوں میں بٹی ہوئی یہ دنیا معیار زندگی اور وسائل حیات کے لحاظ سے مختلف درجے پر ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی فضیلت اور برتری کا درجہ اس کی دینداری اور اس کے خوف خدا کی بنیاد پر ہی متعین ہوسکتا ہے۔ فرد اور قوم کی طرح کوئی علاقہ اور ملک اور ان کے ممالک کا مجموعہ بھی اسی صورت میں فضیلت اور برتری کا حامل ہوسکتا ہے جب کہ اس کے افراد خوف خدا کی دولت سے مالا مال ہوں اور زندگی میں ان کا ایک ایک قدم اس کی مرضی اور مشیت کے مطابق اٹھتا ہو۔ اسی کی بنیاد پر کسی اجتماعیت میں اول، دوم، سوم اور چہارم درجہ کے افراد کا تعین کیا جائے گا، جسے آگے بڑھ کر اسی طرح اقوام اور ممالک تک وسیع کیا جا سکے گا۔

يَـٰٓأَيُّهَـا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَـعَلْـنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَـعَارَفُوْا ط إِنَّ أَكْـرَمَـكُـمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ٥
(حجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے (آدم وحوا) سے پیدا کیا ہے۔ اور اس کے بعد تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو۔ البتہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ بلا شبہ اللہ بڑا جاننے والا آگاہی رکھنے والا ہے۔

## افراد واقوام کے نظائر

یہ جو کچھ اس موقع پر مجملاً کہا گیا ہے، افراد اور اقوام کے حوالہ سے کتاب اللہ میں جا بجا اس کی تفصیل ہے۔ جس کے کچھ نمونوں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

قرآن نے اپنی دعوتی تاریخ میں حضرت نوحؑ کی قوم، اسی طرح عادؑ وثمودؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی قوم اور قوم شعیبؑ اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخاطب قوم فرعون کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ ان تمام اقوام کے سلسلے میں قرآن نے بار بار اور جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ معاشی وسائل، مادی ترقی اور افرادی قوت کے لحاظ سے یہ قومیں بڑے اونچے مرتبے پر فائز تھیں۔ جب کہ ان کو دعوت دینے والے پیغمبر اور ان کے کم تعداد متبعین ہر طرح سے کمزور اور نا قابل ذکر حیثیت کے حامل تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے اپنے زمانہ کی یہ ترقی یافتہ قومیں اپنے پیغمبروں کے انکار کے باعث اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہ کرنے کے باعث اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود یہ صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں اور تاریخ میں ان کا نام صرف عبرت کے لیے باقی رہ گیا۔ اس کے برعکس پیغمبر اور ان کے پیروکار اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق قرار پائے اور عذاب سے محفوظ رہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے اپنے زمانہ کے یہ کم

وسائل اور ترقی یافتہ لوگ اونچے رہے۔ اور منکرین حق جو ہر طرح کے مادی وسائل سے مالا مال تھے وہ اللہ کی نظر میں نیچے ٹھہرے، اور دنیا میں اس طرح زیر کیے گئے کہ قیامت تک کے لیے نمونہ عبرت بن گئے۔

اسی طرح افراد میں فرعون کے علاوہ اس کے وزیر ہامان اور قارون کا تذکرہ ہے۔ جن کی طاقت اور جن کی دولت کا کوئی تھاہ نہ تھا۔ لیکن اقوام بالا کی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کے زبردست عذاب کی زد میں آئے اور حضرت موسیٰ اور ان کی کمزور اور خستہ حال قوم کے مقابلے میں ہمیشہ کے لے نفرت اور حقارت کی علامت بن گئے۔ اسی فہرست میں 'نمرود' کا بھی نام ہے جو جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مخاطب اور ان کی زد پر تھا۔ قرآن میں اگرچہ اس کے نام کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن مفسرین کا اتفاق ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی اپنے زمانہ کے جس سرکش اور باغی سے بحث ہوئی تھی اور جس کی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ حجت کے سامنے زبان بند ہوگئی تھی۔ وہ یہی ''نمرود'' تھا۔[۲] اس شخص کی طاقت اور دولت کا بھی کوئی حد وحساب نہ تھا اور اپنی پوری قوم کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ اس کے حکم سے جب پیغمبر وقت کو آگ کے آلاؤ میں ڈالا گیا تو وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس کے اس جابرانہ فیصلے کے خلاف زبان کھول سکتا تھا۔ اس شخص کا تذکرہ قرآن کے دوسرے مقامات پر ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس کے علاوہ اوپر جن اقوام اور افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سب کا یکجا ذکر سورہ عنکبوت میں ہے۔

اس موقع پر آیت: ۱۴ سے ۳۷ تک حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی قوموں کا تذکرہ ہے۔ جو اپنے اپنے زمانہ کی ہر لحاظ سے انتہائی ترقی یافتہ قومیں تھیں۔ لیکن شرک وکفر کی گمراہی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک رب کی بندگی اور اطاعت کے بجائے نفس وشیطان کی بندگی میں لگی ہوئی تھیں۔ ان پیغمبروں نے ان کو گمراہی کے اس راستے سے ہٹا کر توحید اور خدا پرستی کے راستے پر لگانا چاہا لیکن انھوں نے ان کی ایک نہ سنی اور شرک وبت پرستی اور اپنی معروف سماجی اور معاشی برائیوں میں بدستور لت پت رہیں۔ نتیجے میں ان کے اوپر اللہ کا عذاب آیا

اور یہ صفحۂ ہستی سے معدوم کردی گئیں۔ تاریخی طور پر قرآن میں عام طور پر قوم نوحؑ کے بعد عاد اور ثمود کا تذکرہ آتا ہے جن کی غیر معمولی طاقت اور قوت اور شان وشوکت کا قرآن میں جگہ جگہ ذکر ہے۔ لیکن اس موقع پر ان کی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے ان کا تذکرہ سب سے آخر میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَعَادًا وَّثَمُوْدَ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَّسٰكِنِهِمْ وقفہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (عنکبوت:۳۸) | اور عاد اور ثمود اور ان کے رہنے کی جگہوں کو دیکھنے سے تمہارے سامنے ان کا انجام واضح ہے۔ اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ بنائے اور اس طرح ان کو (سیدھے) راستے سے روکے رکھا۔ حالاں کہ وہ بڑے زیرک لوگ تھے۔ |

یہاں قرآن نے ان کے متعلق ایک لفظ 'مستبصرین' کے ذریعہ وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو آج کی ترقی یافتہ اقوام دوسرے لفظوں میں پہلی اور دوسری دنیا اور جی ۷ اور جی ۸ کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے انتہائی زیرک، ہوشیار، دنیا کی بڑی سمجھ رکھنے والے اور اس کے معاملات کو پرکھنے والے۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ (م۱۲۳۰ھ) نے ایک لفظ 'ہوشیار' [۳] سے اس کا ترجمہ کرکے ان تمام مفاہیم کو اس میں سمیٹ دیا ہے۔ اسی موقع پر اس کی تشریح بھی اسی طرح قیمتی ہے:

اور تھے ہوشیار۔ یعنی دنیا کے کام میں ہوشیار تھے اور اپنے نزدیک عقل مند تھے۔ پر شیطان کے بہکاوے سے نہ بچ سکے۔[۴]

اس سے پہلے صاحب کشاف علامہ جار اللہ زمخشری (م۵۳۸ھ) کی بھی اس کی تفسیر اسی سے ملتی جلتی ہے:

| | |
|---|---|
| (وکانوا مستبصرین) عقلاء متمکنین من النظر والافتکار ولکنهم لم یفعلوا [۵] | (اور وہ زیرک تھے) یعنی کہ عقل والے جو اپنی فکر ونظر کا جو بہترین استعمال کرسکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکے۔ |

اس کے بعد قارون، فرعون اور ہامان اور اوپر سے نیچے تک مذکورہ اقوام وافراد

کے انجام کا تذکرہ ہے:

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ﷺ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ. فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ فَمِنْهُمْ مَنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَنْ اَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

(عنکبوت: ۳۹-۴۰)

اور قارون اور فرعون اور ہامان، اور حضرت موسیٰ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے زمین میں گھمنڈ کا رویہ اختیار کیا۔ حالانکہ وہ بچ کر نکل جانے والے نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کے بدلے ہم نے دھر دبوچا، تو ان میں سے کوئی رہا جس پر ہم نے پتھر برسانے والی ہوا بھیجی، اور کوئی رہا جو چنگھاڑ کی زد میں آیا۔ اور کوئی رہا جس کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کوئی رہا جس کو ہم نے پانی میں ڈبا دیا۔ اور یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ وہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرنے والے تھے۔

اس موقع پر جو زمین میں دھنسائے جانے کا ذکر ہے یہ قارون اور اس کے پیرو کاروں سے متعلق ہے جیسا کہ سورۂ قصص ۶ میں اس کی صراحت ہے۔ بحر قلزم میں غرق فرعون اور اس کی قوم کو کیا گیا جس کا قرآن میں بار بار ذکر ہے۔ اس سے پہلے قوم نوحؑ اپنے زمانہ کے تاریخی طوفان میں غرق آب ہوئی۔ اس کا تذکرہ بھی قرآن میں جگہ جگہ ہے۔ پتھر برسانے والی ہوا (حاصب) سے قوم لوط ہلاک کی گئی جس کی صراحت قرآن میں دوسرے مقام پر ہے ۷ اسی طرح چنگھاڑ (صیحہ) سے قوم ثمود ہلاک کی گئی اس کا ذکر بھی قرآن میں ایک سے زائد بار ہے۔ ۸ دوسرے موقع پر قوم شعیبؑ اور قوم لوطؑ کے بھی (صیحہ) کے اس عذاب سے ہلاک کیے جانے کا ذکر ہے۔ ۹

## ان افراد واقوام کی تفصیل

اوپر جن افراد اور اقوام کا تذکرہ ہے، قرآن میں جگہ جگہ ان کے سلسلے میں تفصیل

ہے کہ یہ اپنے زمانہ کے معاشی اور مادی ہر پہلو سے انتہائی ترقی یافتہ لوگ تھے۔ ان افراد اور اقوام کا ذکر قرآن کی مخاطب عرب قوم کے سامنے اس مقصد سے کیا گیا ہے کہ آج تم اپنے پیغمبر محمد ﷺ اور ان کے پیروکاروں کے مقابلے مال و دولت اور افرادی قوت میں اپنے کو ان سے بہت فائق سمجھتے ہو، لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ پچھلے زمانہ کے جن افراد و اقوام نے اپنے پیغمبروں کا انکار کیا تھا اور ان کے مقابلے پر آگئے تھے۔ وہ دنیوی ترقی کے معاملے میں تم سے بہت آگے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں تم کسی شمار میں نہیں آتے ہو۔ لیکن جب وہ حق کے انکار پر ڈٹے رہے تو مختلف صورتوں میں ان کے اوپر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ سو یہی کچھ معاملہ اب تمہارے ساتھ ہونے والا ہے جو آخری پیغمبر ﷺ اور ان کی لائی ہوئی کتاب کے انکار پر مصر ہو البتہ آپ ﷺ کی مخاطب عرب قوم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ کسی آسمانی عذاب کے بجائے پیروان محمد ﷺ کے ہاتھوں ہلاک ہو۔ جیسا کہ تاریخ کی شہادت ہے کہ ان منکرین محمد کا آج دنیا میں کوئی نام لینے والا نہیں ہے۔ اس پس منظر میں آیات ذیل کا مطالعہ کیجیے۔ پہلے اقوام کو لیتے ہیں۔ افراد کو بعد میں زیر بحث لائیں گے۔ ان اقوام و افراد کے سلسلے میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن کے مخاطب ان کے احول سے بخوبی واقف تھے۔ زیر بحث افراد کا ان کے یہاں برابر چرچا رہتا تھا۔ اور ہلاک شدہ قوموں کے کھنڈرات ان کے آس پاس تھے۔ اور اپنے تجارتی اسفار میں ان کا ان آثار سے برابر گزرنا ہوتا تھا۔ سورہ انعام میں عمومی طور پر ان اقوام کے تذکرہ میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ | کیا مکہ کے لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے زمین میں وہ طاقت اور قوت دے رکھی تھی جو طاقت اور قوت کہ ہم نے تم کو نہیں دی۔ اور ہم ان کے اوپر بہترین بارش برساتے رہے اور دریا بنائے جو ان |

بِـذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَأ نَا مِنْ بَعْدِ هِمْ قَرْناً آخَرِيْنَ(الانعام:٦).

کے نیچے سے بہتے (لیکن وہ ہماری ان نعمتوں کی قدر پہچان کر راستے پر نہیں آئے) تو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہم نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور ان کے بعد دوسری قوم کو میدان میں لے آئے۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ ماضی کی یہ قومیں بڑی طاقت اور قوت والی تھیں اور اللہ نے ان کی معیشت کی بہتری کا پورا سامان کر رکھا تھا۔ ان کے یہاں بھر پور بارش وقت پر اور ضرورت کے مطابق ہوتی جس سے ان کی زراعت بہتر ہوتی۔ اس کے ساتھ ان کے لیے زیر زمین پانی کی فراوانی تھی جس سے سال کے بقیہ دنوں میں ان کے لیے اپنے باغات کی سینچائی کا بہترین انتظام رہتا۔ لیکن جب یہ ان نعمتوں میں پڑ کر اپنی اصل حیثیت کو بھلا بیٹھیں اور اللہ کی منکر ہو گئیں۔ تو اس کی طرف سے یہ تباہ و برباد کر دی گئیں۔

سورہ مریم میں ان کی ترقی اور دوسرے پیرائے میں بیان ہوئی ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَـا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثاً وَّرِئْياً (مریم: ۷۴)

اور عرب کے ان کافروں اور مشرکوں سے پہلے ہم بہت ساری قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا چکے ہیں جن کا مال و دولت اور ظاہری شان و شوکت میں ان سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

اس موقع پر ان کی ترقی کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'اثـاث' یعنی کہ مال و متاع [۱۰] اور اسباب دنیا [۱۱] دوسرا لفظ 'رئیـا' یعنی کہ منظر اور نمود [۱۲] ان دو الفاظ میں قرآن نے ان تمام اقوام کی پوری ترقی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان قوموں کے یہاں دنیا کے مال و اسباب بہتر سے بہتر شکل میں موجود تھے اور اپنی ظاہری چمک دمک کے لحاظ سے یہ ایسی خوش منظر تھیں کہ نگاہ پڑ جائے تو ان سے ہٹنے کا نام نہ لے۔ آج یورپ، امریکہ اور جاپان جیسے ملکوں کی دنیوی ترقی کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جا سکے۔

قرآن کے ان دو الفاظ پر اس پر کچھ بھی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے موقع پر ان ہلاک شدہ بستیوں کے سلسلے میں معیشت (Economy) کی صراحت ہے کہ اپنی بہترین معیشت پر ان کو گھمنڈ تھا اور یہ پھولے نہیں سماتی تھیں۔ جب کہ آج اسی معاشی ترقی کی بنیاد پر اقوام عالم کی پہلی دوسری اور تیسری دنیا میں تقسیم کی گئی ہے۔ زیرنظر تحریر سے اسی فاسد زاویۂ نظر کی تصحیح مقصود ہے۔ اب آیت کریمہ پڑھیے:

وَکَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا فَتِلْکَ مَسٰکِنُھُمْ لَمْ تُسْکَنْ مِنْ بَعْدِھِمْ اِلَّا قَلِیْلاً وَکُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِیْنَ (قصص:۵۸)

اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو نیست ونابود کر دیا جن کو اپنی خوش حالی کا بڑا گھمنڈ تھا۔ تو یہ ان کے کھنڈرات ہیں جو ان کے بعد بہت کم ہی آباد رہ سکے۔ اور ہم ہی (ان کے) وارث ٹھہرے۔

اسی سورہ میں آگے قارون کے قصے کے ذیل میں فرمایا:

اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَھْلَکَ مِنْ قَبْلِہٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْہُ قُوَّۃً وَّاَکْثَرُ جَمْعاً وَلَا یُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِھِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (قصص:۷۸)

کیا اُس کو پتہ نہیں کہ اللہ نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو نیست ونابود کر دیا جو اس سے زیادہ طاقت ور اور بڑی جمعیت والی تھیں، اور اپنے کرتوتوں کے بارے میں گنہ گاروں سے دریافت نہیں کیا جائے گا (کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے)

اس موقع پر اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی کہ ماضی کی ان قوموں کی نفری اور آج کی اصطلاح میں فوجی اور عسکری قوت بھی غیر معمولی تھی۔ سو آج یورپ اور امریکہ کو اپنی معیشت (Economy) کے ساتھ جس دوسری چیز پر سب سے بڑھ کر ناز ہے وہ یہی ان کی فوجی اور عسکری تفوق اور برتری ہے۔

سورہ روم میں یہ مضمون مزید کھول دیا گیا ہے جہاں ان اقوام کی بڑھی ہوئی طاقت اور قوت کے ساتھ ان کی طرف سے اپنے زمانہ میں زمین کو آباد کرنے اور اس کو گل و گل زار بنا دینے کا اضافہ ہے:

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا اَکْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (روم: ۹)

کیا ان لوگوں کا زمین میں چلنا پھرنا نہیں ہوا کہ وہ دیکھ سکیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔ وہ لوگ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان لوگوں نے زمین کو زیادہ جوتا اور اس کو آباد کر رکھا تھا جتنا کہ انھوں نے اس کو آباد کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے۔ تو وہ اللہ نہیں تھا جس نے کہ ان کے اوپر ظلم کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے (اور اپنا انجام خراب کرنے والے) تھے۔

دوسرے موقع پر ان اقوام کی معاشی اور مادی ترقی کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ قریش کے لوگ جو عرب میں مکہ کی مرکزی تجارتی شاہراہ میں اقامت پذیر ہیں، اور جن کو اپنی مذہبی حیثیت کا پورے جزیرۂ عرب میں فائدہ ملتا ہے اور اس کی بدولت سماجی عزت واحترام کے ساتھ ان کو بہت سارے معاشی اور مالی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں، جس کا قرآن میں جا بجا بیان ہے اور آخری پارے کی سورہ قریش تو اسی مضمون کے بیان کے لیے وقف ہے، اپنے ان تمام تر فوائد (Advantages) اور اس سے حاصل ہونے والی معاشی اور مادی ترقی کے باوجود قرآن کا کہنا ہے کہ پچھلے زمانہ کی ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں یہ کہیں نہیں کھڑے ہوتے ہیں اور دسویں مقام پر بھی نہیں آتے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے رسولوں کا انکار کیا تو یہ اللہ کی پکڑ سے نہ بچ سکیں:

وَکَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰهُمْ فَکَذَّبُوْا رُسُلِیْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (سبا: ۴۵)

اور جو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی جھٹلانے کی راہ اپنائی، حالاں کہ یہ لوگ جو ہم نے ان لوگوں کو دے رکھا تھا اس کے دسویں کو بھی نہیں پہنچتے تو انھوں نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تو (ان کے لیے اس کی) میری سزا کیسی رہی۔

یہی مضمون آیات ذیل کا ہے:

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَکَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ اِنَّهٗ کَانَ عَلِیْماً قَدِیْراً ٥

(فاطر: ۴۴)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جو یہ دیکھ سکیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ ان سے زیادہ طاقت ور تھے۔ اور ایسا نہیں کہ زمین و آسمان میں کوئی ایسی چیز ہو جو اللہ کو ہرا دے۔ بلا شبہ وہ بڑے علم والا، بڑی قدرت والا ہے۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّآثَاراً فِی الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَمَا کَانَ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ. ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانَتْ تَاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ

(مومن: ۲۱-۲۲)

کیا ان لوگوں کا زمین میں چلنا پھرنا نہیں ہوا جو وہ یہ دیکھ سکیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔ وہ لوگ ان سے زیادہ طاقت ور اور زمین میں ان کی نشانیاں ان سے زیادہ تھیں۔ تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے بدلے پکڑا اور اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کا بچانے والا نہ رہا ایسا اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آتے رہے پھر بھی وہ اپنے انکار پر ڈٹے رہے۔ تو اللہ نے ان کو پکڑ لیا بلاشبہ وہ بڑی قوت والا، سخت سزا دینے والا ہے۔

اسی سورہ کی آخری آیات میں یہ مضمون مزید وضاحت سے آیا ہے۔ جس میں آخری نبی ﷺ سے پہلے دنیا میں کفر و اسلام کی جنگ کا ایک طرح سے نقشہ کھینچ دیا ہے۔ نیز یہ کہ اس میں کون نیچے اور کون اوپر اور کس کا اللہ کی نظر میں کیا درجہ ہے:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّآثَاراً فِى الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ فِىْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ٥

(مومن: ۸۲-۸۵)

کیا ان لوگوں کا زمین میں چلنا پھرنا نہیں ہوا جو وہ یہ دیکھ سکیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔ وہ تعداد میں ان سے زیادہ اور زیادہ طاقت ور اور زمین میں بڑی نشانیوں والے تھے۔ تو جو کچھ انھوں نے کمائی کر رکھی تھی وہ ان کے کچھ کام نہ آئی۔ تو جب ان کے رسول ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے، تو ان کے پاس جو علم (Knowlege) تھا وہ اس پر پھولے نہیں سمائے۔ نتیجے میں ان کو اس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ تو جب ہمارا عذاب ان کے بالکل سامنے آ گیا تو کہنے لگے کہ اب ہم ایک اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم اس کے ساتھ ساجھی ٹھہراتے تھے ان کا انکار کرتے ہیں۔ تو جب ہمارا عذاب ان کے بالکل سامنے آ گیا تو ان کا یہ ایمان لانا ان کے کسی کام نہ رہا۔ یہ اللہ کا طریقہ رہا ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہا ہے۔ اور ایسے موقع پر انکار کرنے والوں کو سوائے ٹوٹے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اس سلسلۂ آیات میں ماضی کی ان اقوام کی شان وشوکت اور ان کی معاشی اور مادی ترقی کے بیان میں ان کی علمی اور سائنٹفک برتری اور تفوق کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں پر ان کے علم سے مراد مادی اور سائنسی علوم ہیں۔ جس کی بدولت

زمین کے چپے چپے پر ان کے آثار موجود تھے۔ آج یورپ اور امریکہ کی یہی مادی اور سائنسی ترقی ہے جس کی وجہ سے یہ پوری دنیا کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ اور باقی دنیا کو دوسرے اور تیسرے درجے میں رکھ کر اپنے لیے 'پہلی دنیا' ہونے کے دعویدار ہیں۔ دنیا میں جو قوم مالدار اور صاحب اقتدار ہوتی ہے زمین پر قدم قدم پر اس کے نشانات 'آثار' دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی میں یہ نشانات 'آثار' جس طرح کے ہوتے تھے اس کا ایک نقشہ قرآن نے سورہ حج میں کھینچا ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ○ (حج: ۴۵)

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے نیست و نابود کر دیا جو ظلم کے راستے پر چلنے والی تھیں۔ تو یہ اپنی چھتوں سمیت اوندھی پڑی ہیں۔ اور کنویں ہیں جو ویران ہیں اور مضبوط محلات ہیں (جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے)۔

آج کے دور میں ترقی کے ان نشانات 'آثار' نے بڑے بڑے کارخانے، ڈیم، بجلی گھر، فوجی اڈوں اور تحقیق کے مراکز نے لے رکھی ہے۔ دنیا میں جو ملک جتنا مالدار اور طاقت ور ہوتا ہے اس کے یہ آثار بھی اتنے ہی بڑے اور نمایاں ہوتے ہیں۔ آج دنیا کا سب سے طاقت ور ملک امریکہ ہے۔ سو اندرون ملک اپنے آثار کے علاوہ بحر ہند سے لے کر کیوبا کے گوانتا نامو تک دنیا کے چپے چپے پر اس کے آثار پھیلے ہوئے ہیں۔

آخر میں اس سلسلے کی دو مختصر آیات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں اس مضمون کو بڑی جامعیت کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ○ (محمد: ۱۳)

اور کتنی ہی بستیاں رہی ہیں جو تمہاری اس بستی سے زیادہ طاقت ور تھیں جس نے کہ تم کو نکال دیا۔ ہم نے ان لوگوں کو تباہ کر دیا تو کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ رہا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشاً فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ. (ق:۳٦)

اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا جن کی پکڑ ان سے زیادہ سخت تھی۔ تو انھوں نے اپنے پورے علاقے کو چھان مارا کہ کہیں پناہ مل جائے (لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے)۔

## متعلق قوموں کی مادی اور دنیوی ترقی کی مزید تفصیل

اوپر ان اقوام کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بڑی حد تک ان کی طاقت اور شان وشوکت کے بیان کے لیے کافی ہے۔ لیکن قرآن میں جابجا ان اقوام کے احوال کی تفصیل ہے جس میں ان کی ترقی اور خوش حالی کا بیان کیا گیا ہے۔ اس موقع پر اختصار کے ساتھ اس کا احاطہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان اقوام میں عاد وثمود اور قوم شعیبؑ کی ترقی کا قرآن میں خاص طور پر ذکر ہے۔ دیگر اقوام کے سلسلے میں بھی اس کے واضح اشارے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے پیغمبر اور اس کے پیروکاروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور، مال دار اور شان وشوکت کی حامل تھیں۔ پہلے عاد وثمود اور قوم شعیبؑ کو لیتے ہیں۔

## عاد وثمود اور قوم شعیبؑ

قرآن کا یہ موضوع نہیں ہے اور اس کے سلسلے میں اس نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لیے ان کے زمانے (Period) کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن آدم ثانی حضرت نوحؑ کے بعد کی ان دونوں قوموں 'عاد وثمود' کی شان وشوکت اور ترقی کی بابت قرآن نے بہت کچھ کہا ہے۔ عاد کے بارے میں قرآن نے ایک بات یہ کہی ہے کہ 'یہ لوگ بڑی قوی ہیکل اور بڑے ڈیل ڈول والے تھے۔

...وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً. (اعراف:۶۹) ...اور اللہ نے تم کو بڑے ڈیل ڈول والا بنایا۔

تفسیروں میں اس موقع پر یہاں تک لکھا ہے کہ ان کا لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور ناٹا آدمی ساٹھ ہاتھ کا ہوا کرتا تھا۔[۱۳] تفسیری روایت ہونے کے ناطے اس کو سو فی صد

درست نہ بھی مانا جائے تب بھی اس قوم کی جسمانی طاقت اور قوت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ اس قوم کو قلت تغذیہ (Malnutrition) وغیرہ کا کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے کہ آدمی دبلا اور کمزور ہو جاتا ہے۔ آج کی پہلی دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ وہاں کے لوگ خوب چوڑے چکلے ہوتے ہیں۔ غذا کی فراوانی سے موٹاپا (Obesity) بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ جس میں آج پہلی دنیا کا پہلا ممبر امریکہ عظمیٰ سرفہرست ہے۔ یہی معاملہ درجہ بدرجہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے ساتھ ہے۔ بلند و بالا اور شان دار عمارتیں ہمیشہ قوموں کی طاقت اور عظمت کا نشان رہی ہیں۔ یہ خصوصیت ثمود کی تھی جو میدانی علاقوں میں شان دار محلات تعمیر کرتی اور پہاڑوں کو تراش کر نمونے کے مکانات تعمیر کرتی تھی:

...... وَبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًاۚ (اعراف: ۷۴)

اور اللہ نے تم کو زمین کا وسیع و عریض رقبہ عطا کیا۔ تم اس کے میدانی علاقے میں محلات تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر عالی شان مکانات تیار کرتے ہو۔

دوسرے موقع پر اسی طرح کی خصوصیت قوم عاد کی بھی بیان کی گئی ہے۔ اس اضافے کے ساتھ کہ ان کی پکڑ بھی بہت سخت تھی۔ یہ جب کسی قوم کو مارنے یا قتل کرنے پر آتے۔ تو ان کا رویہ بڑا بے رحمانہ ہوتا اور ان کے عذاب سے نجات پانا آسان نہ ہوتا۔[۱۴] یہ لوگ اونچی جگہوں اور اونچے ٹیلوں پر لمبے لمبے منارے (Towers) محض کھیل اور نام و نمود کے مقصد سے تعمیر کرتے تھے۔ اسی طرح اپنے رہنے کے لیے بڑی پر تکلف عمارتیں بنواتے جس میں آخری حد تک کاریگری کا نمونہ دکھایا جاتا تھا اس پورے مضمون کے لیے کتاب اللہ کے الفاظ ہیں:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔ ٥ (شعراء: ۱۲۸ - ۱۳۰)

کیا ایسا نہیں ہے کہ تم ہر اونچی جگہ پر محض تفریح کے لیے کوئی نہ کوئی نشانی کھڑی کرتے ہو۔ اور انتہائی پر تکلف عمارتیں بنواتے ہو جیسے کہ تم کو مرنا ہی نہیں ہے۔ اور جب تم پکڑتے ہو تو ظلم کی انتہا کرتے ہوئے چھوڑنے کا نام نہیں لیتے ہو۔

آخری آیت کریمہ میں گویا آج کے امریکہ کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جو عراق اور افغانستان میں گھسا ہے تو وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ اسی موقع پر قوم ثمود کی اوپر کی عمارت سازی کے سلسلے میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ اکثر و بیشتر بے مقصد اور محض تفریح و نمائش کے لیے ہوتی تھی۔ اس اضافہ کے ساتھ کہ یہ لوگ بڑے چین سے رہتے تھے اور ان کے گرد و پیش سے معاشی خوش حالی پھوٹی پڑتی تھی:

اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ٥ (شعرا: ۱۴۶-۱۴۹)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جو یہاں ہو تو اسی طرح چین سے پڑے رہو گے۔ باغات اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور نخلستان میں جس کے خوشے پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اتراہٹ میں ڈوب کر تم پہاڑوں کو تراش کر مکانات تعمیر کرتے ہو۔

اوپر جو 'عاد' کا ذکر ہے اسی کا ایک قبیلہ 'ارم' تھا۔ جس نے تاریخ کا مشہور 'باغ ارم' تعمیر کرایا تھا۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس کے بلند و بالا اور شاندار اور بیشمار کھمبوں کی اس زمانے میں دوسری مثال نہ تھی۔ اسی موقع پر ثمود کا بھی تذکرہ ہے:

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوْا الصَّخْرَ بِالْوَادِ٥ (فجر: ۶۔۹)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کھمبوں والے ارم کے عاد کے ساتھ کیا کیا۔ جن کے مانند ملکوں میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہی حال ثمود کا ہوا جو وادیوں [15] میں چٹانوں کو تراش کر مکانات تعمیر کرتے تھے۔ [16]

عاد اور ثمود کی طاقت اور شوکت کا تذکرہ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہے۔ [17] جس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک شعیبؑ کی قوم کا سوال ہے تو یہ ایک خوش حال تجارت پیشہ قوم تھی۔ البتہ ان کے اندر خرابی یہ پیدا ہوگئی تھی کہ یہ ناپ تول میں کمی کی بیماری میں گرفتار تھے۔ اور اس سے کسی طرح باز آنے کے لئے تیار نہ

تھے۔ چناں چہ قوم کے نام اپنی دعوت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں تقریباً ہر جگہ ایک اللہ کی بندگی کے بعد اس برائی سے باز آنے کی تاکید کی ہے۔۱۸ لیکن وہ اپنے مالی معاملات میں اعتدالیوں سے بچنے کے لیے کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔۱۹ اسی طرح ان لوگوں کا اپنے علاقے میں سماجی اور سیاسی تسلط اور دبدبہ بھی غیر معمولی تھا۔ جس کے نتیجے میں آج کے سپر پاور امریکہ کی طرح مختلف ناکوں پر بیٹھ کر یہ لوگوں کے کپڑے اتروا لیتے اور ان سے زبردستی راہ داری وصول کرتے تھے۔ اور حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے والوں کو قتل کی دھمکیاں دے کر ان کو ان کا ساتھ دینے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن چوں کہ ان کی نفری قوت غیر معمولی تھی اس لیے کوئی ان سے اٹکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔۲۰ یہی بات دوسرے موقع پر قوم ثمود کے سلسلے میں بھی کہی گئی ہے کہ ان کے یہاں جرائم پیشہ افراد کی مختلف ٹولیاں تھیں جن سے بھلائی کا تو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ البتہ فساد اور بگاڑ کے ہر کام کے لیے وہ مستعد تھیں۔۲۱ جسے آج کی زبان میں چوری، ڈکیتی، قتل و غارت گری، اغوا اور پھروتی وغیرہ سبھی کچھ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔۲۲ دوسری جگہ ہے کہ آج کے امریکہ اور یورپ کی طرح وہ لوگوں کے درمیان قرضوں کا جال پھیلا کر اس کے ذریعہ ان کا طرح طرح سے استحصال کرتے تھے۔۲۳ یہاں تک کہ ایک ہی رات میں ان کے لیے اپنے پیغمبر حضرت صالحؑ اور ان کے پورے خانوادے کا پتہ صاف کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جیسا کہ قرآن میں اسی موقع پر اس کی صراحت ہے۔۲۴

## دیگر انبیاء اور ان کی اقوام

ان کے علاوہ قرآن میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، اور حضرت موسیٰ و ہارون وغیرہ کی دعوتی جدو جہد کی جو تفصیل ہے، اس میں جا بجا اس کا اشارہ ہے کہ یہ حضرات انبیاء اور ان کے پیرو کار معاشی، مادی اور نفری ہر لحاظ سے اپنی مخاطب دعوتی قوم کے مقابلے میں کمزور اور بے حیثیت تھے۔ اس میں حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ تو صاف طور پر آں جناب کے پیرو کاروں کو 'ارذل' اور 'اراذل' سے تعبیر کرتے تھے۔ جسے آج کی

اصطلاح میں ''ذلت'' اور ''پسماندہ'' کا مترادف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اوراپنے مقابلے میں ان کو کسی شمار میں نہیں رکھتے تھے:

| | |
|---|---|
| ...... وَمَانَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلاَّ الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَریٰ لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ ...... (ھود:۲۷) | ......ہم تو تم کو یہی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیروکار وہی لوگ ہیں جو پہلی نظر میں ہمارے درمیان سب سے پست ہیں اور ہم کو اپنے اوپر تمہاری بڑائی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ |

دوسرے موقع پر بھی ان کی طرف سے پیروان نوحؑ کے لیے اسی اصطلاح کا استعمال ہوا ہے:

| | |
|---|---|
| قَالُوْآ اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ○ (شعراء: ۱۱۱) | انھوں نے کہا کہ کیا ہم تم پر ایمان لائیں، جب کہ تمہارے پیروکار انتہائی پست لوگ ہیں۔ |

جہاں تک نمرود اور اس کے جتھے کی طاقت اور قوت اور اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ کی کمزوری اور بے بسی کا سوال ہے، اس کے بیان کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ بت شکنی کے جرم میں جب وہ آں جناب کو آگ کے الاؤ میں ڈالنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے فیصلے کے خلاف کسی کی دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی ہے۔ ۲۵ دوسرے موقع پر حضرت ابراہیمؑ سے مباحثہ میں اپنے دعوے کے حق میں وہ ایک بے گناہ کی گردن اڑا دیتا ہے۔ ۲۶ لیکن اس کے اس اقدام کے بارے میں کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ کی بھی اپنی قوم کے مقابلہ میں بے بسی کچھ کم نہیں ہے۔ جو لواطت کے مرض میں گرفتار ان کی قوم کی ہلاکت کے لیے خوبصورت جوانوں کی صورت میں آنے والے فرشتوں کو ان کی نظر بد سے بچانے کے معاملے میں اپنے کو بالکل اسہائے پاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ○ (ھود:۸۰) | انھوں نے کہا کہ کاش کہ تمہارے مقابلے کے لیے میرے پاس طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا جس کی میں مدد لے سکتا۔ |

دوسرے موقع پر یہی لوگ حضرت لوطؑ اور ان کے پیروکاروں کو اپنی بستی سے نکل جانے کی دھمکی دیتے ہیں۲۷؎ اس سے بھی ان کی شوکت اور دبدبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرعون اور اس کی قبطی قوم کے مقابلے میں حضرت موسیٰ وہارون اور ان کی اسرائیلی قوم کی بے وقعتی اور بے حیثیتی کے بیان کے لیے اپنی قوم کے سلسلے میں حضرت موسیٰ کا یہ اعتراف ہی کافی ہے کہ فرعون نے ان لوگوں کو باقاعدہ اپنا غلام بنا رکھا تھا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ٥ (شعراء: ۲۲)

اور اس احسان کا بدلہ تم مجھ سے یوں چکانا چاہتے ہو کہ تم بنی اسرائیل کے لوگوں کو غلام بنائے رکھو۔

دوسرے موقع پر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف سے خود اس کا تذکرہ ہے:

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ٥ (مومنون: ۴۷)

تو ان کا کہنا تھا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لائیں دریں حالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کے بندھن میں بندھی ہو۔

اس غلامی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو لگاتار قتل کیا جاتا رہے، البتہ بیگار کے لیے لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کی دعوتی سرگزشت کے بیان میں قرآن میں تقریباً ہر جگہ اس کا تذکرہ ہے۔۲۸؎

## افراد کا بیان

یہ قوموں کا ذکر تھا۔ افراد کے بیان سے بھی اسی حقیقت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ افراد کے بیان میں نمرود کا ذکر اوپر آچکا، فرعون کے بارے میں بھی اگرچہ کچھ بات آچکی ہے۔ لیکن اوپر کی قرآن شریف کی بیان کردہ فہرست میں اس کا خاص طور پر ذکر ہے:

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۚ (عنکبوت: ۳۹) اور قارون اور فرعون اور ہامان۔

موجودہ دور کی پہلی دنیا کے فرعونوں کی یوں بھی اس سے کافی مشابہت ہے۔

اس لیے اس فہرست میں اس کا دوبارہ ذکر غیر انسب نہیں ہے۔ اوپر قرآن کے بیان میں اگرچہ اس کا ذکر بیچ میں ہے۔ لیکن اپنے درجے اور رتبے کے لحاظ سے وہ قارون اور ہامان دونوں سے اوپر ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اس کی طاقت اور شوکت کے نئے پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یوں بھی آج کے دور میں خاص کر پہلی دنیا کے فرعونوں کا دور دورہ ہے۔ اس لیے ان کے پیش رو فرعون اول کا پہلے ذکر ہونا چاہیے۔ قرآن میں اس فرعون کا اس کی طرف بھیجے گئے پیغمبر حضرت موسیٰؑ سے جو مباحثہ اور مکالمہ ہوا ہے اور جو اس کتاب میں مختلف مقامات پر درج ہے، اس میں جگہ جگہ اس کے وہ اجزاء نشان زد کیے جاسکتے ہیں جس سے فرعون کی دولت اور اس کی طاقت اور اقتدار کا نشہ چھلکا پڑتا ہے۔۲۹ اور اپنے مقابلے میں وہ جناب موسیٰؑ کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی نظر سورہ زخرف کی آیات ذیل پر پڑتی ہے جس میں فرعون کی فرعونیت اور اس کی نظر میں حضرت موسیٰؑ کی بے وقعتی دونوں کا یکجا بیان ہے:

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ. (زخرف: ۵۱-۵۲)

اور فرعون نے اعلان کر کے اپنی قوم کو جمع کیا۔ (پھر ان کے سامنے) گویا ہوا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا ایسا نہیں ہے کہ میں مصر کے ملک کا مالک ہوں اور اس کے یہ دریا میرے نیچے بہتے ہیں۔ (جن پر کسی اور کا اختیار نہیں) یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اب اس شخص (موسیٰؑ) کے مقابلے میں میرے اچھے ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے جو بالکل بے حیثیت ہے اور اپنی بات بھی کھل کر نہیں کہہ سکتا۔

معاصر دنیا میں، جیسا کہ گزرا، پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی تقسیم خالص معاشی اور مادی ترقی کی بنیاد پر ہے دوسرے موقع پر فرعون کی مالداری اور اس کی دنیوی شان و شوکت کا اعتراف خود حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ہے جہاں وہ اس کو بددعا کرتے ہوئے

بارگاہ ایزدی میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں:

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ. (یونس: ۸۸)

اور موسیٰ عرض پرداز ہوئے کہ پروردگار! آپ نے فرعون اور اس کے ہم نشینوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی سج دھج اور مال و منال دے رکھا ہے۔ پروردگار عالم! اس کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگوں کو تیرے راستے سے بھٹکاتے ہیں۔ اے پروردگار! ان کے مال و اسباب کو غارت کردے اور ان کے دلوں پر مہر کردے۔ جس کے بعد جب تک کہ یہ دردناک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ان کو ایمان لانے کی توفیق نہ ہو۔

جب بادشاہ کا یہ دبدبہ اور اس کا یہ طمطراق ہو تو اس کے کسی وزیر باتدبیر کی طاقت اور شوکت کا اندازہ اپنے آپ کیا جا سکتا ہے یہی کچھ معاملہ فرعون کے وزیر 'ہامان' کا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وزیروں اور درباریوں میں 'ہامان' کا خاص درجہ ہے۔ وہ اس کا معتمد خصوصی اور اس کا مشیر خاص ہے۔ سورۂ مومن میں حضرت موسیٰ سے اپنے طویل مکالمہ میں جس میں آل فرعون کے مرد مومن کی شمولیت سے ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اور بلا شبہ اس سورہ کا یہ حصہ دعوتی نقطۂ نظر سے قرآن کے منتخب مقامات میں سے ہے۔ اس مکالمہ میں فرعون ایک موقع پر جب موسیٰ کے خدا کا پتہ لگانے کے لیے ایک فلک نما عمارت بنوانے کی خواہش کرتا ہے تو اس کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب اس کے اس معتمد خاص 'ہامان' پر پڑتی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِىْ صَرْحًا لَّعَلِّىْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۝ (مومن: ۳۶-۳۷)

اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان! میرے لیے ایک محل تعمیر کراؤ جس سے کہ میں بلندیوں تک پہنچ سکوں۔ آسمانوں کی بلندیوں تک تا کہ میں جھانک کر موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اس کو پرلے درجے کا جھوٹا سمجھتا ہوں۔

یقیناً شہ کے مصاحب کو حق ہے کہ وہ اترائے اور اپنی طاقت اور دولت پر ناز کرے، سو بادشاہ کے کسی وزیر کا اگر یہ حق ہے تو اس حق کا سب سے بڑا حق دار دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ 'فرعون' کا وزیر 'ہامان' ہی ہو سکتا ہے۔ اس فہرست میں تیسرا نام 'قارون' کا ہے جو آج بھی دنیا میں مال اور دولت کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا تفصیلی تذکرہ سورہ قصص میں ہے۔ اس کے مطابق قارون کا تعلق تھا تو بنی اسرائیل یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے لیکن دنیا پرستی میں گرفتار ہو کر وہ فرعون کی ٹولی سے جا ملا۔ اور اس کے ذریعہ بنی اسرائیل پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے جا رہے تھے اس میں وہ ان کا دست و بازو بن گیا۔ اور اس کی بدولت اس نے اپنے پاس خزانے اور دولت کا بڑا انبار جمع کیا۔ یہاں تک کہ اس کے خزانوں اور تہہ خانوں کی کنجیاں اتنی بھاری اور بڑی تعداد میں تھیں کہ پہلوانوں کی پوری پوری ٹولیاں مل کر ہی ان کو اٹھانے میں کامیاب ہو پاتی تھیں:

| | |
|---|---|
| وَاٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ (قصص: ٧٦) | اور ہم نے اس کو وہ خزانے دے رکھے تھے کہ اس کی کنجیوں کو طاقت ور انسانوں کی پوری ایک جماعت بھی بڑی مشکل سے اٹھا پاتی تھی۔ ۳۰ |

آگے ہے بنی اسرائیل کے نیک لوگوں نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنی دولت پر نازاں نہ ہو۔ بلکہ اس کے ذریعہ آخرت کو سنوارنے کی کوشش کرے، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور فتنہ فساد سے اپنے کو دور رکھے۔ لیکن اس کو نشہ تھا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنی لیاقت اور صلاحیت کے بل پر حاصل کیا ہے۔ اس پر قرآن کا یہ تبصرہ آج کے دور کے قارونوں کے لیے لائق توجہ ہے:

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا یُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (قصص: ٧٨) | کیا اس کو پتہ نہیں ہے کہ اللہ نے اس سے پہلی کتنی ہی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا ہے جو اس سے بہت زیادہ طاقت ور اور بڑی جتھے والی تھیں۔ اور اپنے کرتوتوں کے بارے میں مجرموں سے دریافت نہیں کیا جائے گا (کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کا فیصلہ ہو) |

آگے اسی سلسلے میں ہے کہ ایک دن وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی دولت کی نمائش کرنے کے لیے پورے تام جھام کے ساتھ نکلا جس کو دیکھ کر کوتاہ بینوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور وہ اپنے لیے ویسے ہی مال و دولت کی تمنا کرنے لگے۔ لیکن جو صاحب نظر تھے انھوں نے آخرت کے بدلے ہی کو اپنے لیے قابل ترجیح سمجھا۔ اب اللہ کی طرف سے قارون کی مہلت عمل ختم ہو چکی تھی چناں چہ وہ اپنے بھرے پرے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا اور کسی کی مدد اس کے کام نہ آسکی۔ اب اس سے پہلے جن لوگوں کے طرف سے اس کے جیسے مال دولت کی آرزو کی گئی تھی، ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ وہ کہنے لگے اللہ کا بڑا کرم ہوا، ورنہ اپنے جرم کی پاداش میں ہم بھی اسی طرح زمین میں دھنسا دیے جاتے۔ اس کے بعد پورے واقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرہ ہے۔ جس سے سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی نظر میں کون پہلے اور کون پیچھے ہے۔ اور اسی کی روشنی میں صحیح معنوں میں آج کے حالات میں پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کا تعین کیا جا سکتا ہے:

| | |
|---|---|
| تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَايُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ ٥ (قصص: ۸۳) | اور آخرت کے اصلی گھر کا حق دار تو ہم انہی لوگوں کو قرار دیں گے جو زمین میں سرکشی اور فتنہ فساد نہیں چاہتے۔ اور یہ انجام کار (اللہ سے) ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ |

سورہ عنکبوت کی طرح جس کا ذکر اوپر گزرا سورۂ مومن میں بھی آج کے لحاظ سے پہلی دنیا کے ان تینوں ممبروں کا تذکرہ ایک ساتھ ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ٥ (مومن: ۲۳-۲۴) | اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور ایک خاص کھلی دلیل کے ساتھ فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا۔ تو ان کا ٹکا سا جواب تھا کہ یہ جادوگر اور پرلے درجے کا جھوٹا ہے۔ |

جو معاملہ اس زمانہ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ ان سرکشوں کا تھا، ایسا ہی کچھ رویہ مکہ کے کفار و مشرکین کا آخری پیغمبر محمد ﷺ کے ساتھ تھا۔ آپ ﷺ بھی چوں کہ کوئی

رئیس اور مالدار نہ تھے اس لیے آپ ﷺ کی پیغمبری ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ چناں چہ ان کا کہنا تھا کہ اگر قرآن کو اترنا ہی تھا تو اسے مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی کے پاس اترنا تھا:

| | |
|---|---|
| وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ. (زخرف:۳۱) | اور ان کا کہنا تھا کہ کیوں نہ یہ قرآن (مکہ اور طائف کی) دو بستیوں میں کسی بڑے آدمی کے پاس اتارا گیا۔ |

اس کے بعد اس پر قرآن کا جو تبصرہ ہے اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے نزدیک بلندی اور پستی کا کیا پیمانہ ہے۔ اور اللہ نے دنیا میں مال و دولت کے لحاظ سے کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے رکھا ہے تو اس کی حکمت کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی نظر میں بڑائی اور عظمت کا اصل معیار کیا ہے۔ جس کے لحاظ سے آج کی اصطلاح کے مطابق پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کا تعین کیا جاسکتا ہے:

| | |
|---|---|
| اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ٥ (زخرف: ۳۲) | کیا تیرے رب کی رحمت کی تقسیم کا ذمہ ان کو مل گیا ہے۔ اس کے بجائے یہ ہم ہیں جس نے دنیا کی زندگی میں وسائل رزق کو ان کے درمیان بانٹ رکھا ہے۔ اور لوگوں کو نیچے اوپر اس لیے کر رکھا ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔ اور (اے نبیؐ) تیرے رب کی رحمت اس سے بہت اچھی ہے جو کہ لوگ بٹور کر رکھ رہے ہیں۔ |

## بلندی اور پستی کا اصل معیار:

قرآن میں اس کے علاوہ دوسرے اشارات بھی ملتے ہیں جس سے اس کے بلندی اور پستی اور اونچے اور نیچے ہونے کے اصل معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک موقع پر

بادشاہت کے مقابلے میں نبوت کو مقدم رکھا گیا ہے۔سورۂ مائدہ میں حضرت موسیٰ کی طرف سے اپنی قوم بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات کے بیان میں ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسیٰ لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْبِیَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰكُمْ مَا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ (مائدہ: ۲۰)

اور غور کے قابل ہے جب موسی نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسانات کو یاد کرو جبکہ اس نے تمہارے درمیان نبی بھی بنائے اور اس نے تم کو بادشاہت سے بھی نوازا۔ اور (اس طرح) اس نے تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں دیا۔

اس آیت کریمہ میں نبوت کو بادشاہت کے اوپر رکھا گیا ہے۔ بلا شبہ قوم بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ سے پہلے حضرت یوسفؑ اور ان کے بعد حضرت داوٗدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبر پیدا ہوئے جو ایک ہی وقت میں نبوت و بادشاہت دونوں کے منصب پر فائز رہے۔لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔ عام یہی ہے کہ وہاں نبوت کی دولت الگ اور بادشاہت کی دولت الگ ہو۔آیت کریمہ کی تعمیم اس کا پتہ دیتی ہے کہ حضرت موسیٰ سے پہلے اور بعد ان کے یہاں ان دونوں کی کثرت اور فراوانی رہی۔یعنی کہ انبیاء وہ رہے جن کا بادشاہت سے کوئی تعلق نہ تھا اور بادشاہ وہ رہے جو نبوت کے منصب سے عاری تھے لیکن اس موقع پر قرآن کا نبوت کو بادشاہت سے مقدم رکھنا اس کے حق میں صریح ہے کہ دنیوی جاہ وعزت اور دولت و اقتدار کے مقابلے میں علم ومعرفت اور ربانی رشد و ہدایت کی قیمت اس کی نظر میں زیادہ ہے۔ دوسرے نظائر سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی التجاء پر ان کے زمانہ کے نبی ۱۳ کی دعا کے نتیجے میں جب ان کے اوپر 'طالوت' کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو اس پر ان لوگوں کو اعتراض ہوا کہ یہ بادشاہت کے حق دار کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ ان کی مالی حیثیت مستحکم نہیں ہے:

| | |
|---|---|
| وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ (بقرة: ۲۴۷) | اور ان سے ان کے نبیؐ نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ ہمارے اوپر بادشاہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان سے زیادہ تو بادشاہ بننے کے ہم حق دار ہیں دوسری کمیوں کے علاوہ ان کو مال کی فراوانی حاصل نہیں ہے۔ |

اس کے جواب میں پیغمبر وقت کا کہنا تھا کہ اللہ نے ان کو علمی اور جسمانی صلاحیت میں تمہارے اوپر فوقیت دی ہے اور حکومت اور سربراہی کے لیے مال و دولت کے مقابلے میں ان اوصاف کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے:

| | |
|---|---|
| قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؕ (بقرة: ۲۴۷) | پیغمبر بولے کہ اللہ نے ان کو تمہارے اوپر منتخب کیا ہے اور ان کو بڑھی ہوئی علمی اور جسمانی قوت عطا کی ہے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے اقتدار سے نوازتا ہے۔ اور اللہ کشادگی والا، بڑے علم والا ہے۔ |

تیسری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ جن کو ان کے مشہور قصے میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحب زادیوں میں سے ایک نے ان کی جسمانی قوت اور امانت داری کی بنیاد پر ان کو اپنے ہاں ملازم رکھے جانے کا مشورہ دیا:

| | |
|---|---|
| قَالَتْ اِحْدٰهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِىُّ الْاَمِيْنُ ؕ (قصص: ۲۶) | ان دونوں میں سے ایک بولی کہ ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجیے۔ آپ کے لیے اس سے اچھا ملازم اور کون ہو سکتا ہے جو طاقت ور بھی ہو اور امانت دار بھی۔ |

آیت کریمہ کی معروف تفسیر کے مطابق جس کی تصدیق اس سلسلۂ بیان کے اشارات سے ہوتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں بہنوں کے ریوڑ کو تھکے بغیر

کنویں سے پانی نکال کر سیراب کر دیا اور ان غیر شادی شدہ لڑکیوں سے معاملہ کرتے ہوئے قدم قدم پر اپنی نیک نفسی اور پاکدامنی کا مظاہرہ کیا، اپنے اسی تجربے کی بنیاد پر انھوں نے اپنے باپ کے سامنے ان کی جسمانی قوت اور اخلاق کی پاکیزگی اور ایمانداری کی گواہی دی۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ معاملات دنیا میں اسلام اور قرآن کا کسی کو آگے اور پیچھے رکھنے کا کیا پیمانہ ہے۔ صرف مال و دولت اور وسائل حیات کی فراوانی کو وہ کسی کے اوپر اور نیچے ہونے کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ دوسرے موقع پر شادی کے معاملے میں آزاد مشرک عورت کے مقابلے مسلمان باندی، اسی طرح آزاد مشرک مرد کے مقابلے مسلمان غلام کو ترجیح دی گئی ہے۔[۳۲] اس سے بھی اسلام اور قرآن کی اسی پسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ افراد کی طرح اقوام کے معاملے میں بھی اسلام اور قرآن کا یہی معیار ہے۔ معنوی خوبیوں سے محروم ہو کر محض دولت کی فراوانی اور سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی بنیاد پر کچھ قوموں اور ملکوں کا اپنے کو 'پہلی دنیا' اور باقی کو 'دوسری' اور 'تیسری دنیا' قرار دینا، اسلام اور قرآن کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

## پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی صحیح ترتیب

اس تفصیل کی روشنی میں پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی صحیح ترتیب وہ نہیں ہے جس کا آج یورپ کی ترقی یافتہ اقوام نے پروپگنڈہ کے زور پر باقی دنیا کو قائل کر لیا ہے۔ یعنی کہ مادی خوش حالی اور سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے لحاظ سے یورپ، امریکہ اور ایشیاء کے جو ممالک سب سے آگے ہیں ان کا تعلق پہلی دنیا سے ہے۔ اس ترقی کے لحاظ سے دنیا کے جن ملکوں کا نمبر ان کے بعد ہے وہ دوسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جو اس معاملے میں ان دونوں سے پیچھے ہیں وہ تیسری دنیا کے نمائندے ہیں۔ جس میں ہمارے ملک ہندوستان سمیت ایشیاء اور افریقہ کے بڑے ممالک شامل ہیں۔ اس کے بجائے صحیح معنوں میں اگر دنیا کی پہلی، دوسری اور تیسری دنیا میں تقسیم ہونی ہے تو یہ تقسیم ایمان، عقیدے اور اخلاق کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ ربانی ہدایت اور صحیح نظام زندگی کی بدولت دنیا کا جو ملک یا

ملکوں کا مجموعہ صحیح عقیدے اور اخلاق عالیہ کی دولت سے جس درجے میں مالا مال ہو وہ پہلی دنیا اور جو اس معاملے میں ان سے درجہ بدرجہ قریب ہوں وہ اسی ترتیب دوسری اور تیسری دنیا میں رکھے جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی دوسری بہت ساری کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود عقیدے اور اخلاق کی جو دولت عالم عرب اور عالم اسلام کو میسر ہے، دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس میں ان کا شریک وسہیم نہیں۔ اس سرزمین میں بغیر نکاح کے کسی عورت کو قانونی جواز کے ساتھ بیوی بنائے رکھنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کا تو خواب میں بھی تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کسی مسلمان ملک کی پارلیامنٹ سے ہم جنس پرستی اور ہم جنسوں کی شادی کے جواز کا قانون پاس ہوسکے۔ جب کہ آج کی پہلی دنیا کے یہ معروف مظاہر ہیں۔ امریکہ میں غیر شادی شدہ بیویوں کا رواج روز افزوں ہے۔[۴۳] دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں اوسطا ایک مرد کا ایک وقت آٹھ عورتوں سے ناجائز تعلق ہوتا ہے۔[۴۴] اسی پر سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کی دوسری بے اعتدالیوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ صرف سیاسی سطح پر جنگ عظیم اول سے لے کر آج عراق اور افغانستان میں یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے ذریعہ سے جو کچھ کیا جارہا ہے اس کے پیش نظر ان کا اپنے آپ مٹھو بننا اور خود کو 'پہلی دنیا' قرار دے لینا کچھ بہت زیادہ زیب نہیں دیتا۔

اس پس منظر میں اپنی صحیح ترتیب میں پہلی دنیا عالم عرب اور عالم اسلام ہے۔ یعنی کہ دنیا کا وہ خطہ جس میں کہ مکہ اور مدینہ واقع ہے۔ مکہ وہ شہر جس میں اللہ کا وہ گھر ہے جو قیامت تک کے لیے دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رشد وہدایت کا مرکز ہے۔[۴۵] اس سرزمین کے دوسرے شہر مدینہ میں اللہ کے آخری رسول ﷺ کی ابدی آرام گاہ ہے جن پر اور جن کے اوپر نازل ہونے والی اللہ کی آخری کتاب پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص اپنے کو دوزخ کے عذاب سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مکہ اور مدینہ کے ان دونوں مقدس شہروں سے متصل وہ پھیلا ہوا عالم عرب اور اسلام ہے جس کے چپے چپے پر آپ ﷺ کے اصحابؓ اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی قبریں اور ان کی قائم کردہ وہ یادگاریں ہیں، جن سے بہتر اور جن سے اچھی انسانی جماعت اس سے پہلے روئے زمین پر پیدا ہوئی

نہ آئندہ ہو سکے گی، جیسا کہ اس سے متعلق اللہ کے آخری رسول ﷺ کا واضح فرمان ہے۔۳۶ پھر اس عالم اسلام کا قلب عرب کی وہ سرزمین ہے جس کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے کہ: شیطان قیامت تک کے لیے اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ عرب کی سرزمین میں اس کی بندگی کی جا سکے گی۔۳۷ اپنی بعض عملی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود یہ سرزمین قیامت تک کے لیے صحیح عقیدے اور عمل صالح کا مرکز ہے۔ اور آخری وقت تک اس سے رشد وہدایت کی کرن پھوٹتی رہے گی اور یہاں سے اس کے لازوال سرچشمے جاری رہیں گے۔۳۸

قرآن اور اسلام کے اوپر کے قائم کردہ معیار کے مطابق دوسری دنیا ہندوستان اور اس جیسے مخلوط آبادی والے دوسرے ممالک ہیں جہاں کفر وشرک کی گڑبڑی اور خرابی کے ساتھ اسلام اور اس کی نام لیوا امت بہت قابل لحاظ تعداد میں موجود ہے۔ اس کی روشنی سے کفر وشرک کا اندھیرا چھٹتا رہتا اور الحاد اور انکار خدا پر مسلسل ضرب پڑتی رہتی ہے۔ ان کے کونے کونے میں پانچ وقت کی اذان سے روئے زمین پر خدائے واحد کی بندگی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور ان کے اوپر بسنے والی امت دنیا میں خیر کی داعی اور بدی اور بے حیائی کے راستے کی رکاوٹ ہے۔

تیسری دنیا یورپ، امریکہ اور افریقہ کے وہ ممالک ہیں جہاں مسلمان امت تعداد میں کم اور نا قابل لحاظ حالت میں ہے۔ جس کی وجہ سے کفر وشرک اور بدی اور بے حیائی کے ان ممالک میں اس کی روشنی بھی اسی کے لحاظ سے کم بکھر پاتی ہے۔ اسی میں جنوب ایشیاء کے جاپان جیسے ممالک بھی شامل ہیں جو مادی ترقی کے لحاظ سے آج کی پہلی دنیا میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن اسلام اور مسلمانوں کی دولت سے محرومی کے سبب سے ہمارے حساب سے وہ تیسری دنیا میں شامل قرار پاتے ہیں۔

انصاف پسند اسکالرس، محققین اور خطباء سے امید کی جاتی ہے کہ اوپر کی ہماری پیش کردہ پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کی ترتیب پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ اور اس کی روشنی میں اپنے علمی اور عملی رویے کو متعین کرنے کا حوصلہ پیدا کریں گے۔ اور اس سے بڑی اصل

بات یہ ہے کہ اس کے آئینے میں وہ دنیا کی زندگی میں اصل سچائی اور خدا کی عطا کردہ صحیح رہنمائی کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح مسلمان اہل علم، ادیبوں، صحافیوں اور خطیبوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تقریر وتحریر میں آج کی پامال 'پہلی' دوسری اور تیسری دنیا کی اصطلاح کے استعمال سے گریز کریں۔ اور تحریر وتقریر میں ان دنیاؤں کے اس تصور کو ابھاریں جس کی اس سے اوپر تفصیل کی گئی ہے۔ تاکہ باقی دنیا کو غفلت سے تنبہ ہوتا رہے اور وہ اس عارضی دنیا کی وقتی چمک دمک سے اوپر اٹھ کر آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کو اپنا مطمح نظر اور اس کی تیاری میں اپنے کو مستعد کر لے۔

اپنی آخری کتاب میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کا صاف کہنا ہے:

لَايَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ٥ (حشر: ۲۰)

دوزخی اور جنتی دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کامیاب تو بس وہی ہیں جو کہ جنتی ہیں۔

نیز یہ کہ:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ٥ (ص:۲۸)

ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد مچانے والوں کے برابر کر دیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم پرہیزگاروں اور بدکاروں کو برابر کر دیں۔

سو دنیا کے جس خطے اور علاقے میں یہ جنتی اور متقی بڑی تعداد میں ہوں گے وہ اسی لحاظ سے دوسروں سے اچھا اور اونچا ہوگا۔ اور جہاں اہل دوزخ اور فاسقوں اور فاجروں کی جتنی کثرت ہوگی وہ اسی کے مطابق نیچے اور پست ہوں گے۔ آج کی پہلی دنیا کا مادی ترقی کے نشہ میں چور ہو کر اپنے کو مہذب دنیا (Civilized World) کا خطاب دے لینا۔[۳۹] اور بعض مسلمان ملکوں کو بدمعاش ممالک (Rogue Countries) سے تعبیر کرنا،[۴۰] ایک دھوکہ ہے۔ قیامت کا پردہ اٹھنے پر ان کی یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت ان کا چیتنا کچھ فائدہ مند نہ ہوگا۔ کیا ہی بہتر ہو کہ وہ اس سے پہلے اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ اور باقی دنیا کو بھی ہوش مندی کی توفیق حاصل ہو۔ وما علینا الا البلاغ.

# حواشی ومراجع

۱ گروپ ۸ (G8) کے یہ ممالک ہیں: امریکہ، کناڈا، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور بریطانیہ۔ ان ممالک کے سربراہوں کا ایک چوٹی اجلاس اس وقت برطانیہ کی میزبانی میں اسکاٹ لینڈ میں ہورہا ہے۔ اردو روزنامہ سہارا دہلی ۷/جولائی ۲۰۰۵ء خبر بعنوان 'جی ۸ کے سربراہوں کا چوٹی اجلاس شروع' جس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے ہندوستانی وزیراعظم منموہن سنگھ کی بھی شرکت ہے۔

۲ ایک حوالہ کے لیے، تفسیر الجلالین: ۵۶، طبع جدید دار المعرفۃ، بیروت ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، طبع اولیٰ۔

۳ موضح القرآن/۶۶۴، طبع قدیم تاج کمپنی لاہور، کراچی، بدون سنہ۔

۴ موضح القرآن، حوالہ سابق۔

۵ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳/۲۰۶، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، طبعہ اخیرہ ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء، تحقیق روایات: محمد صادق قمحاوی۔

۶ آیات: ۸۱-۸۲۔

۷ قمر: ۳۴۔

۸ ہود: ۶۷، قمر: ۳۱۔

۹ ہود: ۹۴، حجر: ۷۳۔

۱۰ تفسیر الجلالین/۴۰۴، محولہ بالا۔

۱۱ موضح القرآن/۵۱۴، طبع مذکور، البتہ یہاں ترجمہ میں صرف 'اسباب' ہے۔ دنیا کا اضافہ ہم نے کیا ہے۔

۱۲ منظر کی تشریح صاحب جلالین کی اور 'نمود' کا ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ہے۔ حوالہ سابق۔

۱۳ ایک حوالہ کے لیے تفسیر الجلالین/۲۰۳، طبع مذکور۔

۱۴ صاحب جلالین نے 'مصانع' کی تفسیر یہ کی ہے کہ پانی ذخیرہ کرنے کے لیے زیر زمین حوض اور ٹنکیاں تعمیر کرتے ہو: (وتتخذون مصانع) للماء تحت الارض۔ تفسیر الجلالین/ ۴۸۸۔

۱۵ عربی تفسیروں میں عام طور پر اس کے معنی 'وادی القریٰ' بیان کیے گئے ہیں۔ تفسیر الجلالین/ ۸۰۶، روح المعانی: ۳۰/۱۲۴۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ (مصر) تصحیح وتعلیق، سید محمود شکری آلوسی، بغدادی، دوسرے موقع پر اس کی صراحت ہے کہ 'وادی' کی یہ تفسیر مفسر مقاتل کی ہے: مفاتح الغیب المشتہر بالتفسیر الکبیر: ۸/۳۹۶، مطبع عامرہ شرفیہ (مصر) طبعہ اولیٰ ۱۳۰۸ھ۔ دوسرے موقع پر یہی بات ابن اسحاق کے حوالہ سے کہی گئی ہے۔ تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۵۰۸، مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ۔ البتہ یہ قابل ذکر ہے کہ ان کے پیش رو مفسر طبری م ۳۱۰ھ کے ہاں 'وادی القریٰ' کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس حصے کی ان کے یہاں جو تفسیر ہے اس کو عموم کے معنی میں زیادہ سمجھا جاسکتا۔ یعنی کہ 'واد' کو وادیوں کے معنی میں لیا جاسکتا ہے۔ **جابوا الصخر بالواد ضربوا اليوت والمساكن فى الصخر فى الجبال حتى جعلوها مساكن**: جامع البیان: ۳۰/ ۹۸، طبع قدیم مطبع میمنہ، مصر۔ یعنی کہ انھوں نے پہاڑوں میں پتھروں کو تراش کر اپنے رہنے کے لیے مکانات اور گھر تیار کیے۔ لیکن یہ استثناء ہے۔ عام تفسیر 'وادی القریٰ' ظاہر کی ہے۔ اور اس کی پیروی ہمارے اردو تراجم و تفاسیر میں کی گئی ہے جہاں ہر جگہ اس کا ترجمہ اور تفسیر وادی یا وادی القریٰ سے کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے: جو وادی القریٰ میں (پہاڑ کے) پتھروں کو تراشا کرتے تھے (اور مکانات بنایا کرتے تھے)۔ اشرف الشان اختصار شدہ ترجمہ وتفسیر از بیان القرآن/ ۱۹/۷، مدینہ بک ڈپو اردو بازار دہلی۔ مثل لاہور تاج کمپنی۔ جب کہ شیخ حضرت شیخ الہند کے یہاں اس کا ترجمہ 'وادی' اور اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے: 'وادی القریٰ' ان کے مقام کا نام ہے جہاں پہاڑ کے پتھروں کو تراش کر نہایت محفوظ اور مضبوط مکان بناتے تھے۔ ترجمہ شیخ الہند مع تفسیر

عثمانی/۴۷۷، مدینہ پریس، بجنور۔ دیگر اردو تراجم وتفاسیر میں بھی اسی کا اعادہ ہے۔ ہم نے اس کے بجائے وادی کو عام رکھا ہے۔ اور اس کا ترجمہ بجائے واحد کے جمع سے کیا ہے۔ اوپر عماد اور بلاد اور آگے اوتاد اور بلاد کا جو وزن ہے اس کی ضرورت سے اس کی پوری گنجائش ہے کہ جمع کے بجائے لفظ کو واحد لایا جائے۔ لیکن وہ 'ھـــو' واحد کے بجائے جمع کے معنیٰ میں۔ ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ عربی کی دیگر معروف تفاسیر خازن اور بغوی میں بھی 'واد' کی یہی تفسیر 'وادی القریٰ' سے کی گئی ہے: ۲۰۳/۶۔ جس سے ہم کو اختلاف ہے۔ تفسیر خازن کا اصل نام لباب التأویل فی عمائی التنزیل ہے۔ جو محی السنۃ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم الفہد ادی الصوفی کی تفسیر ہے۔ جو خازن کے نام سے معروف ہے۔ مصنف اس کی تالیف سے ۱۰ر رمضان المبارک ۷۲۵ھ بروز بدھ فارغ ہوئے۔ اسی طرح تفسیر بغوی جو محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی م ۵۱۶ھ کی تفسیر ہے اس کا اصل نام 'معالم التنزیل فی التفسیر ہے۔ یہ خازن کے حاشیہ پر ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ مطبوعہ مکتبہ التقدم العلمی، مصر۔ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ۔

۱۶ مشہور روایت کے مطابق انھوں نے اپنی قلمرو میں ایک ہزار سات سو شہر آباد کیے تھے اور ان سب کی تعمیر پتھروں کو تراش کی ہوئی تھی۔ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱۵۱/۴، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، طبعہ اخیرہ ۱۳۶۲ھ، ۱۹۷۲ء۔ مفاتیح الغیب: ۸/ ۳۹۶، محولہ بالا۔ تفسر روح المعانی: ۱۲۴/۳، البتہ اس تعداد کی صحت پر یہاں شک ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یہی ہماری ترجیح ہے۔ والعلم عند اللہ۔

۱۷ ہود: ۵۲، حجر: ۸۲، حم السجدہ: ۱۵، احقاف: ۲۶۔

۱۸ اعراف: ۸۵۔

۱۹ ہود: ۸۷

۲۰ تفسیر الجلالین/ ۲۰۵، تحت آیت کریمہ: اعراف: ۸۶۔

۲۱ قرآن کی صراحت سے یہ کل نو ٹولیاں تھیں۔ نمل: ۴۸۔

۲۲ اس موقع پر قرآن کے مجمل بیان کی یہ ہماری تفسیر ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۳ تفسیر الجلالین/ ۵۰۰۔ البتہ اس موقع پر یہ اتنا صاف نہیں ہے۔ بحمد اللہ ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

۲۴ نمل: ۴۹

۲۵ انبیاء: ۶۸-۷۰، صافات: ۹۷-۹۸۔ عنکبوت: ۲۴۔ ان تینوں ہی مواقع پر اس کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے حوالہ سے ہے۔ لیکن ملک کے بادشاہ اور حکمراں کی مرضی کے بغیر اس کے حدود سلطنت میں ایسا کوئی بڑا اقدام نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے بالواسطہ اس واقعہ کو اس کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا ہے۔

۲۶ بقرہ: ۲۵۸، اس آیت کریمہ کے ذیل میں تفسیر میں ہر جگہ اس کی صراحت ہے۔

۲۷ اعراف: ۸۲، نمل: ۵۶۔

۲۸ بقرہ: ۴۹۔ اعراف: ۱۲۷، ۱۴۱۔ ابراہیم: ۶۔ قصص: ۴

۲۹ قرآن میں دوسرے موقع پر بھی اس کی مال داری کا ایسا ہی بیان ہے: وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ۙ اور فرعون میخوں والا۔ جس کی ایک تفسیر کے مطابق اس کے لشکر کے گھوڑوں کو باندھنے کے لیے سونے کی میخیں استعمال کی جاتی تھیں۔ موضح القرآن/ ۹۹۵، محولہ بالا۔ دوسری تفسیر کے مطابق اس سے مراد چار میخیں ہیں جن میں وہ جس کو سزا دینا چاہتا اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر بندھوادیا کرتا تھا۔ تفسیر الجلالین/ ۸۰۶، طبع بالا۔ اس سے اس کے غیر معمولی اقتدار اور دبدبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں تفسیروں کے مطابق چونکہ اس کی اس کے ساتھ شہرت تھی اس لیے اس کو 'میخوں والا' ذِی الْاَوْتَادِ کے لقب سے یاد کیا گیا۔

۳۰ اس کے بارے میں یہ جو مشہور ہے کہ یہ کنجیاں خچروں پر لاد کر لائی جاتی تھیں تو قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ یہاں جو لفظ 'عصبۃ' استعمال ہوا ہے وہ انسانوں کی جماعت کے لیے ہی بولا جاسکتا ہے جانوروں کے لیے نہیں۔ سورۂ یوسف میں برادران یوسف نے اس کا استعمال اپنے لیے کیا ہے: قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ

اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝ (۱۴)۔

۳۱ جیسا کہ معروف ہے یہ پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام تھے۔ایک حوالہ کے لیے:تفسیر الجلالین/۶۳۔

۳۲ بقرہ:۲۲۱۔آیت کریمہ کے الفاظ ہیں:وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۝

۳۳ اس سلسلے کے ایک تازہ حوالہ کے لیے روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی ۲۰/جولائی ۲۰۰۵ء خبر زیر عنوان: امریکہ میں شادی کے بغیر ساتھ رہنے کی روایت عروج پر۔

۳۴ Q.T.U چینل پر ڈاکٹر ذاکر نائک کے ایک پروگرام سے براہ راست۔

۳۵ سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ:۹۶:اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۝

۳۶ ایک حوالہ کے لیے:ابوجعفر الطحاوی م۳۲۱ھ:مشکل الآ ثار۳/۱۷۷۔دائرۃ المعارف النظامیہ،حیدرآباد الدکن،۱۳۳۳ھ،طبعہ اولیٰ۔حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ ہیں:**خیر امتی قرنی ، ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم الخ۔**

۳۷ **ان الشیطان قد یئس ان یعبد فی جزیرۃ العرب**،مسند احمد:۴/۱۲۶،میمنہ، مصر۔روایت حضرت عبادہ بن صامتؓ اور ابودرداءؓ۔دوسری جگہ حضرت جابرؓ کی روایت سے اس کے لیے آپؐ کے الفاظ ہیں:**ان الشیطان قد ایس أن یعبده المصلون فی جزیرۃ العرب**۔صحیح مسلم،کتاب صفات المنافقین وحکامهم،**باب تحریش الشیطان وبعثه سرایاه لفتنة الناس وان مع کل انسان قرینا**۔مشمولہ موسوعۃ الحدیث الشریف۔الکتب الستۃ۔دارالسلام للنشر والتوزیع،الریاض۔المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔

۳۸ مدینہ کے سلسلے میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: اللہ کے آخری رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ قرب قیامت کے وقت ایمان مدینہ میں اسی طرح پناہ لے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پناہ لیتا ہے: **ان الایمان لیأزر الی المدینة کما تأزر الحیة الی جحرها** ۔صحیح البخاری جلد۲۔ کتاب فضائل المدینۃ، **باب الایمان یازر الی المدینة۔طبعه جدیده، المطبعة السلفیه و مکتبتها، القاهرة طبعه اولیٰ** ۱۴۰۳ھ، آپ ﷺ کی دیگر احادیث میں اس کی بھی صراحت ہے کہ اُس وقت دجال بھی مدینہ میں گھس نہیں پائے گا۔صحیح بخاری، کتاب مذکور، **باب لا یدخل الدجال المدینة** ۔صحیح مسلم جلد۴۔ **کتاب الفتن و اشراط الساعة، باب صفة الرجال وتحریم المدینة علیه وقتله المومن و احیائه** ۔مطبعہ عامرہ، مصر۔آپ ﷺ کی دوسری حدیث میں مدینہ کے ساتھ مکہ کو بھی شامل قرار دیا گیا ہے ۔صحیح بخاری، حوالہ سابق۔عرب کی اسی سرزمین میں شام وفلسطین کے علاقے ہیں، جس کے غیر معمولی فضائل احادیث میں بیان کیے گئے ہیں۔اس کی تفصیل اپنے مقام پر دیکھی جاسکتی ہے۔

۳۹ ۷/جولائی ۲۰۰۵ء (۷/۷) کے لندن پر تازہ حملوں کے بعد برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی ٹیلی ویژن تقریر براہ راست۔امریکہ اور برطانیہ کے سربراہان مملکت کی طرف سے اس اصطلاح کا استعمال اس سے پہلے بھی کیا جاتا رہا ہے۔

۴۰ اس کی ایک مثال میں عرب مسلمان ملک لیبیا۔یورپ اور امریکہ کی نقل میں لیبیا کے متعلق اپنے ملک کے معروف دفاعی تجزیہ کار جناب اُدے بھاسکر صاحب (باریش) کو بھی ایک موقع پر ٹیلی ویژن گفتگو میں اس اصطلاح کا استعمال کرتے سنا۔کبھی کبھی اس فہرست میں پڑوسی ملک پاکستان کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔

☆

# دہشت گردی اور قرآن کریم

عبید اللہ فہد فلاحی

## لندن کے خودکش دھماکے

۷جولائی ۲۰۰۵ء کو لندن کی زیر زمین ٹرینوں اور بسوں میں یکے بعد دیگرے سات خودکش دھماکوں اور ان کی ہولناک تباہی نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس المناک سانحہ میں پچاس سے زائد افراد کی جانیں تلف ہوئیں اور سینکڑوں افراد زخمی ہوئے۔ برطانوی پولیس، خفیہ جاسوسی کے ادارے اور سیاست داں سب حیران اور مضطرب ہیں اور ان کی اس حیرانی، تشویش اور اضطراب انگیز کیفیت میں پوری دنیا شریک ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں جاری جی-۸ ممالک کے سربراہوں نے اجلاس میں بیک آواز برطانیہ سے ہمدردی اور خیر سگالی کا اظہار کیا اور قومی مصیبت کی اس گھڑی میں یک جہتی و اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے دہشت گری کے خلاف جاری جنگ میں شدت، وسعت اور تیزی لانے کا عہد کیا۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے اجلاس کی صدارت چھوڑ کر لندن کا رخ کیا اور صورت حال کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر اپنے خطاب میں ''اسے دہشت گردی کی کاروائی'' قرار دیا جس کا مقصد ''جی-۸ کے اجلاس کو سبوتاژ کرنا تھا''۔ انھوں نے کہا دہشت گرد ''ہماری اقدار اور طرز زندگی'' (Our values and way of life) کو نیست و نابود نہیں کر سکتے۔ اور وہ جو رویہ بھی اپنائیں یہ ہمارا عزم ہے کہ ہم اس ملک میں اور پوری دنیا کی مہذب و متمدن اقوام میں جن چیزوں کو عزیز رکھتے ہیں انھیں وہ تہہ و بالا نہیں کر سکتے''۔ سربراہی اجلاس کے حوالہ سے انھوں نے کہا کہ اس اجلاس کا ہر سربراہ دہشت گردی کی کارروائیوں کا کچھ تجربہ رکھتا ہے اور سارے رہنما اس

دہشت گردی کو شکست دینے کی مہم میں ہمارے ساتھ شریک ہیں"۔ اسکاٹ لینڈ کے اجلاس میں شریک سارے رہنماؤں نے اسے "تمام دنیا کی متمدن اقوام پر حملہ" سے تعبیر کیا۔ صدر امریکہ جارج واکر بش نے دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کو تیز تر کرنے کا اعلان کیا۔[۱]

جرمن چانسلر ہارڈ شروڈر نے ان دھماکوں کو (perifidious attacks) فریب کن اور باغیانہ قرار دیتے ہوئے تمام ممکن وسائل وذرائع اختیار کرکے اسے ختم کرنے پر زور دیا جب کہ فرانس کے صدر نے اپیل کی کہ "دنیا کی بڑی اقوام تشدد کے خلاف جنگ کرنے کے لیے کمر بستہ ہوجائیں"۔ مشترکہ اعلامیہ پر آٹھ ممالک کے سربراہوں کے علاوہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان، یوروپین کمیشن کے صدر جوس مینویل بروس، اور میکسکو، ہندوستان، چین جنوبی افریقہ اور برازیل کے رہنماؤں نے بھی دستخط کیے۔ اعلامیہ کا زور اس پر تھا کہ قصوروار افراد کی زندگیوں کا کوئی احترام نہیں ہوگا۔ ہم اپنے اس فیصلہ اور عزم صمیم میں پوری طرح متحد ہیں کہ اس دہشت گردی کا خاتمہ کرکے رہیں گے۔ یہ کسی ایک قوم پر حملہ نہیں ہے بلکہ ہر قوم اور دنیا کے تمام متمدن افراد اس کی زد میں ہیں"۔[۲]

تشدد کی اس "بہیمانہ کاروائی" (Barbaric attack)[۳] کی مذمت عالم اسلام کے علماء، مقتدر سربراہان اور اسلامی تحریکوں کے رہنماؤں نے یکساں طور پر کی۔ خود برطانیہ کے بااثر دانشوروں اور علماء پر مشتمل ایک بڑے طبقہ نے اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلوں پر اس سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور اسے "قطعی مجرمانہ اور یکسر غیر اسلامی" Utterly crimnal and absolutely un-Islamic قرار دیا۔[۴] اس کا مثبت ردعمل یہ ہوا کہ خود برطانوی وزیر اعظم کو "مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کی تالیف" کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے مسلم قوم کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے مہم چھیڑنے کی دعوت دی:

> A battle to win the hearts and minds of
> Muslims in the compaign against terrorism.

# شترمرغ کی پالیسی

ایک ظالم فرد کس طرح حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے اس کا مشاہدہ بلیئر کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ''تشدد کی یہ واردات عراق پر برطانوی امریکی یلغار کا ردعمل نہیں ہے'' جیسا کہ سارے مبصرین اور سیاسی تجزیہ کار سمجھتے ہیں۔ ''عراق میں برطانوی فوجوں کی مداخلت اگر اس کی وجہ ہوتی تو ایک منتخب عراقی حکومت وجود میں آنے کے بعد اس کا سلسلہ باقی کیوں رہتا؟ اگر مسلمان سے یہ حملہ منسلک ہوتا تو وہ باہم کشت وخون کیوں کرتے؟'' آج تشدد کے خلاف جنگ کرنے کا مطلب ہے جنونی اور انتہا پسند افراد کے خلاف نبرد آزمائی، یہ دلوں اور دماغوں اور نظریات کی جنگ ہے جو اسلام کے اندر اور باہر دونوں سطحوں پر برپا ہے...... ایک ایسی جنگ، جو دہشت گردی کے اسالیب اور منہاجیات کے خلاف ہی نہیں بلکہ ان کے افکار کے خلاف بھی ہے...... میری نظر میں اسے شکست تبھی دی جاسکتی ہے جب اس کے اسباب اور علامتوں کا بھی سد باب کیا جائے...... ہمیں اس کی جڑوں کو سمجھنا ہوگا۔ برطانیہ کے اندر ہمیں مسلم قوم سے تعاون حاصل کرکے دہشت گردوں سے نمٹنا ہوگا۔ پوری دنیا میں ہمیں اس کا چیلنج قبول کرنا ہوگا''۔[۵]

ٹونی بلیئر اور امریکہ کی سکریٹری آف اسٹیٹ کونڈو لیزا رائس مستقل یہ بیانات دے رہے ہیں کہ موجودہ پرتشدد کاروائی کا عراقی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ مسلسل یہ دلیل دیتے آرہے ہیں کہ مشرقی افریقہ میں امریکی سفارت خانہ میں ۱۹۹۸ء کا بم دھماکہ اور ستمبر گیارہ کے خوش کش اقدامات تو ۲۰۰۳ کے عراق جنگ سے بہت پہلے کے متشددانہ حادثے ہیں مگر کوئی نامہ نگار یا نیوز چینل رپورٹر یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرتا کہ ۱۹۹۰ء میں کویت پر امریکی فوجوں کے نزول کو کس خانہ میں رکھا جائے گا؟ اور اقوام متحدہ نے اس کو سند جواز عطا کرکے کس عنصر کی حوصلہ افزائی کی تھی اور مدتوں سعودی عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور ان کے تسلط کا اثر کس چیز پر پڑا ہوگا اور اس کے خلاف کس طرح کے جذبات پرورش پائے ہوں گے اور ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری سے کس طرح

کے افکار و تاثرات اور محرکات کا مظاہرہ عمل میں آیا ہوگا؟

آج ان مغربی سربراہوں کو اپنی تہذیب وثقافت خطرہ میں نظر آ رہی ہے اور اس کے خلاف نفرت اور جنون کو وہ تشدد اور دہشت پسندی کا اصل محرک قرار دے رہے ہیں مگر جیسا کہ عراق میں اقوام متحدہ مشن کے سابق ترجمان سالم لون کہتے ہیں، کسی کو اس موقع پر ۵ لاکھ سے زائد ان معصوم عراقی بچوں کی تصویریں نظر نہ آئیں جو برطانیہ وامریکہ کی پابندیوں کے باعث موت کے منہ میں چلے گئے اور اس قتل عام کو درست اور مناسب قرار دیا گیا۔ اس وقت امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ میڈلین البرائٹ نے ۱۹۹۶ء میں CBS کو انٹرویو دیتے ہوئے۔[٦]

برطانیہ میں حکومت کے عہدیداروں، برسر اقتدار جماعت کے پرجوش کارکنوں اور انتظامیہ و پولیس کے عملہ کے علاوہ بعض مبصرین اور نامہ نگار حقائق کی نقاب کشائی کرتے نظر آتے ہیں۔ بی بی سی کے سیاسی ایڈیٹر آندریو مار اور حفاظتی امور کے مراسلہ نگار فرینک گارڈنر، جو پچھلے سال سعودی عرب میں القاعدہ کے ایک حملہ کے نتیجہ میں معذور ہوگئے، نے ریڈیو پر ایک مباحثہ پیش کیا۔ اس میں سوال کیا گیا کہ "کیا اسلام پسند متشدد مغرب کے تئیں اتنے مخالف اور جارح ہیں کہ برطانیہ کی راجدھانی میں معصوم انسانوں کی جان لینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں"؟ اس کے جواب میں گارڈنر نے برجستہ کہا "نہیں، بالکل نہیں۔ وہ جارحیت پسند اس لیے ہیں کہ مغربی حکومتوں کی پالیسیاں جارحیت پر مبنی ہیں خاص طور سے مسلم خطوں میں اور بطور خاص افغانستان اور عراق میں مغربی فوجوں کی موجودگی سے وہ نالاں ہیں" برطانیہ میں لیبر پارٹی کے رکن پارلیمان ٹونی رائٹ نے لندن بم دھماکوں کے عراق سے لاتعلق قرار دینے کے نظریہ کو "بدعقلی نہیں بلکہ خطرناک بدعقلی" (Not only nonsense, but dangerous nonsense) سے تعبیر کیا۔ ایک مضمون نگار Seumas Milne نے کھلے لفظوں میں اس محرک کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

"بہرحال ہم پوری قطعیت سے نہیں کہہ سکتے کہ جمعرات کو ہمارے

خودکش بمبار جوانوں کے ذریعہ انجام دیے گئے واقعہ کے اصل محرکات وعوامل میں توازن کس طرح پیدا ہوسکتا ہے، مگر ایک بات ہم حتمی طور سے کہتے ہیں کہ عراق میں بش اور بلیئر کے ذریعہ کھیلی گئی ہولی۔ اور عراق تو ہر دن ۷ جولائی کا سماں پیش کرتا ہے۔ اس تازہ حادثہ کا کم از کم ایک اہم سبب ضرور ہے۔

لندن بمباروں نے شہریوں پر جو حملہ کیا ہے وہ سیاسی یا اخلاقی ہر سطح پر ناقابل دفاع ہے مگر وزیر اعظم۔ جنھیں برطانوی خفیہ پولیس نے جنگ میں شمولیت کے ممکنہ خطرات سے پوری طرح باخبر کیا تھا۔ بھی پوری طرح ذمہ دار ہیں کہ ایک خارجی طاقت کی چاکری کر کے انھوں نے اپنے عوام کی زندگیاں شعوری طور سے خطرہ میں ڈال دیں۔ فوجی مہم جوئی اور ''شرانگیز نظریہ'' کے استیصال کی تحریک، جس کا حکومت نے بروز بدھ اعلان کیا ہے، اس درد کا درماں فراہم نہیں کرسکتی''۔ ے

## رابن کوک کا تجزیہ

برطانیہ کے ایک اور تجزیہ کار، رکن پارلیمان اور سابق برطانوی خارجہ سکریٹری رابن کوک کا مدبرانہ جائزہ اس پورے حادثہ اور اس کے مضمرات پر حاوی ہے۔ انھوں نے بلیئر کی فوری تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آج دہشت گردوں نے ہمارے معاشرہ کی جس ثقافت اور جن اقدار پر یلغار کی ہے ان میں ایک قدر برطانیہ کا تکثیری مزاج اور مختلف تہذیبوں، نسلوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا یکساں احترام کرنا بھی ہے ایک روز پہلے برطانوی عوام نے اولمپک کھیلوں کی اگلی میزبانی کے حصول پر جو جشن منایا تھا اس کا ایک اہم جزو تہذیبی تنوع کی ہماری پہچان بھی ہے۔ اس ملک کی اقلیتوں کے ذہن ودماغ میں شکوک اور بدگمانی کی جڑیں گہری ہوجائیں یہی تو جمعرات کے خودکش

بمباروں کو عزیز ہے۔ آج ان عناصر کو شکست دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اس زہریلے عقیدہ کا خاتمہ کیا جائے کہ مختلف عقائد اور نسلوں کے افراد بقائے باہم پر عمل نہیں کر سکتے۔

رابن کوک نے اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا ہے کہ آئندہ چند دنوں میں ''پر تشدد اسلام'' پر مضامین کا ایک انبار لگ جائے گا اور ملکی اور بین الاقوامی پریس میں اسلام اور مسلمانوں کی سیاہ تصویر پیش کی جائے گی مگر انہی ایام میں ہم سربی مظالم کی دسویں یادگار تقریب بھی منا رہے ہوں گے جس کا مطلب ہے کہ مغرب کی طاقت ور اقوام آٹھ ہزار مسلمانوں کے قتل عام کو روک نہ سکیں اور یہ حادثہ فاجعہ یوروپ کے خطہ میں واقعہ ہوا۔ اسامہ بن لادن اسلام کی اس قدر سچی نمائندگی نہیں کرتا جس قدر جنرل ملاڈی، جس نے سربی فوجوں کی کمان سنبھالی اور مسلمانوں کا کشت وخون کیا، نے عیسائیت کی نمائندگی کی۔ بہر حال یہ بات قرآن میں مذکور ہے کہ مختلف اقوام اس لیے پیدا نہیں کی گئیں کہ باہم حسد و رقابت کا اظہار کریں بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنا اور تعارف حاصل کرنا اس تنوع کا اصل مقصد ہے۔

رابن کوک ملک کے ارباب حل وعقد کو باور کراتے ہیں کہ جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں گے کہ تشدد اور دہشت گردی کا مقابلہ جنگ اور ہتھیاروں کے استعمال سے ممکن ہے، ہمیں ناکامی ملتی رہے گی۔ مغرب اس دوبدو جنگ پر جتنا زور دے گا اتنا ہی مسلم دنیا میں معتدل اور متوازن آوازیں کمزور پڑتی جائیں گی اور تعاون وتفاہم کی راہ مسدود ہوتی جائے گی۔ فاضل تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ اگر ہم عالمی سیاسی حصہ داری میں مسلمانوں کی نمائندگی کو تقویت اور استحکام نہیں دے سکتے تو مسلم ممالک کو حاشیہ پر رکھنے کی سیاست کی ہمت افزائی بھی نہیں کر سکتے۔

وہ عالمی دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے بنیادی طور پر دو اقدامات کی تجویز رکھتے ہیں:

۱۔ دہشت گرد عناصر کو حمایت، سیاسی واخلاقی تائید مال وافرادی وسائل کی فراہمی سے روکا جائے اور اس کے لیے تمام سیاسی وقانونی

اور ابلاغی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلم ممالک کے ساتھ مشترک امور پر زیادہ توجہ دی جائے۔

۲۔ اس مظہر کا اصل محرک غربت وافلاس، احساس محرومی وشکست خوردگی، نوجوانوں میں قانونی وسیاسی اداروں کی افادیت پر پیدا ہونے والے سوالات اور معاشی سہولیات کے تئیں ان کی پست حوصلگی اور ناکامی کا احساس ہے۔ غربت کے خلاف عالمی جنگ برپا کر کے انھیں اس احساس سے نکالا جاسکتا ہے۔ اور ان کے اندر زندگی اور امید کی کرن بیدار کی جاسکتی ہے۔۸

## نزلہ برعضوِ ضعیف

۷ جولائی کے اس الم ناک سانحہ کے ملزمین میں مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق کم از کم تین افراد وہ تھے جنھوں نے سال گزشتہ پاکستان کے بعض مدارس کا سفر کیا تھا اس لیے امریکہ کی طرح برطانیہ نے بھی یہ پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ مدارس میں تشدد اور دہشت گردی کی تعلیم ہوتی ہے اس لیے ان پر کڑی نظر رکھی جائے اور ان سے ہر طرح کی بے تعلقی برتنے کی مہم چلائی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ کولن پاویل اور ڈونالڈ رمسفیلڈ کے درمیان امریکہ کی خارجہ پالیسی کے معاملات میں اتفاق رائے کم ہی ہوتا تھا۔ مگر دونوں اس امر پر متفق تھے کہ پاکستان کے دینی مدارس ایک مستقل خطرہ ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں رمسفیلڈ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہم روزانہ جس قدر دہشت گردوں کے خلاف دار وگیر، قید وبند اور قتل وخون کی کاروائی کرتے ہیں کیا مدارس اس سے زیادہ ان کی تربیت نہیں کرتے اور اس سے زیادہ فارغ التحصیل نہیں کرتے''؟ اس کے ایک سال بعد پاویل نے مدارس کو ''بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کے لیے تربیت گاہ'' (Breeding ground for fundamentalist and terrorists) ہونے کا سرورق اعلان کیا۔۹

بعینہ یہی پالیسی برطانیہ کے ذرائع ابلاغ نے اختیار کی۔ اخبار سنڈے ٹیلی

گراف نے مدرسہ کا ترجمہ Terrorist training school کے طور پر کیا جب کہ ڈیلی مرر کی منگل اشاعت نے دو صفحات پر مشتمل دعوے پیش کیے کہ یقینی طور پر تین خودکش بمبار پاکستان Terror schools (مدارسِ دہشت گردی) کے تربیت یافتہ تھے۔

ایک انگریز مصنف ولیم ڈارمپل نے ان اندیشوں اور افواہوں کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق ہے کہ القاعدہ کا جونیٹ ورک ہے اور اس کی جس طرح کی فنی و عسکری تیاریاں ہیں ان سے مدارس کا دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آتا۔ ''بلاشبہ پاکستان کے بعض مدارس ایسے ہیں جن کا منہج مذہبی کتب کی تعبیر وتشریح کے سلسلہ میں بنیاد پرستانہ ہے اور بہت سے مدارس اسلامی فکر کی نہایت قدیم اور انتہا پسندانہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مدارس کا اسلام پسند انقلابیوں سے براہ راست رابطہ ہو اور بسا اوقات تشدد کی تعلیم وترغیب بھی شامل ہوجاتی ہو۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ پاکستان میں ۱۵ فی صد مدارس پر تشدد جہاد کی تعلیم دیتے ہیں اور بعض فوجی تربیت بھی فراہم کرتے ہیں۔[۱۰]

''تاہم اب یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ مدارس کے فارغ التحصیل علماء کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو القاعدہ کے کام آسکے۔ مدارس کے بیشتر طلبہ دیہاتی مذہبی زندگی گزارنے والے، غربت اور معاشی بدحالی کا شکار ہوتے ہیں وہ کسی فنی عسکریت کے اہل کم ہوتے ہیں البتہ جو طلبہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سیاسی شعور ہوتا ہے اور وہ عالمی سلفی جہاد کے سپاہی ہوتے ہیں وہ پوری دنیا میں القاعدہ کی مہموں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ان عسکری مہموں میں حصہ لینے والے سیکولر، سائنسی اور فنی وپیشہ وارانہ مضامین پڑھنے والے طلبہ ہوتے ہیں اور ان کا خال خال تعلق کسی مدرسہ سے ثابت ہوتا ہے''۔

''بحیثیت مجموعی مدرسہ کے طلبہ پیشہ وارانہ مہارت کے حامل نہیں ہوتے نہ ان تصوراتی منصوبہ بندیوں کی ان میں قابلیت ہوتی ہے جن کا ہم پچھلے چند سالوں سے القاعدہ کے حوالہ سے تجربہ کررہے ہیں۔ ان طلبہ کا مرکزی نکتہ مغرب کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ سلفی جہادی گروپ کا یہ طرۂ امتیاز ہے۔ بلکہ وہ اپنے ملک میں اسلامی اخلاق اور اسلامی رویہ کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں''۔

''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں برطانوی بمباروں کے موضوع پر کتنی غیر سنجیدگی اور پیشہ وارانہ قابلیت سے ماورا کس درجہ نااہلی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ بار بار ہم سے کہا جارہا ہے کہ اس المناک حادثہ کی جڑیں غربت اور قرآنی تعلیم کے مدارس سے جڑی ہوئی ہیں، ہمیں سبق دیا جارہا ہے کہ اس حادثہ کے ذمہ دار افراد شرانگیز جنون میں مبتلا ہیں جن سے کوئی گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے اور جن کا واحد مقصد گزشتہ ہفتہ کے Question Times پر دیے گئے فرینک فیلڈ کے بیان کے مطابق ''ہمارا یکسر صفایا کردینا ہے'' (aim to wipe us out)۔ افغانستان اور عراق کے مسائل سے کسی قسم کے تعلق کا بالکلیہ انکار کیا جارہا ہے''۔

''امر واقعہ یہ ہے کہ القاعدہ کے مہم جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ان کے مقاصد واضح طور پر سیاسی ہیں۔ اسامہ بن لادن اپنے مختلف بیانات میں اس کا اعادہ کرچکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں جب امریکیوں کے خلاف علانیہ جنگ کا اعلان کیا تھا تو صاف کہا تھا کہ مشرق وسطی میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کے خلاف لڑ رہے ہیں اور خاص طور سے سعودی عرب میں آل سعود کی امریکی حمایت اور مملکت اسرائیل کی پشت پناہی پر انھیں سخت اعتراض ہے انھوں نے صراحت کی تھی کہ اسلام اور ''صہیونی صلیبیوں'' (Zionist Crusaders) کے درمیان جاری تہذیبی تصادم کو ختم کرنا ان کا مقصد ہے اور یہ کہ وہ امریکی تائید و حمایت کا خاتمہ کرکے مسلم دنیا کو انقلابی بنانا اور مغرب کی نقال مسلم حکومتوں کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں''۔

ولیم ڈارمپل اس طرز فکر و عمل کو غیر سنجیدہ قرار دیتے ہیں ان کے تجزیہ کے مطابق ''جارج واکر بش نے اسامہ بن لادن ...... کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ سیکولر بعث پارٹی، عراق پر حملہ، ابوغریب جیل کے مظالم، فلوجہ کا قتل عام اور اس طرح کے دوسرے واقعات کے سہارے برطانیہ کی وفادارانہ تائید و حمایت حاصل کرکے امریکہ نے عراق کو جہادیوں کے لئے کھیل کے میدان میں تبدیل کردیا ہے اور اسلامی دنیاں اور خود مغرب کی مسلم معتدل و متوازن فکر کو مفلوج کردیا ہے۔ بلاشبہ ہمیں ان خوفناک مظالم کی مذمت کرنی

چاہیے جن کا ارتکاب ان لوگوں نے کیا ہے مگر مذمت کافی نہیں ہے۔ جب تک ہم ان جہادیوں کو نہیں سمجھیں گے، ان کے بیانات کا مطالعہ نہیں کریں گے اور ان عوامل کا دیانت دارانہ تجزیہ نہیں کریں گے جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے کو اس کام کے لیے وقف کیا ہے تب تک ہم انہیں شکست نہیں دے سکیں گے نہ ان مسائل کی تہ تک پہونچ سکیں گے جن کی گمبھیرتا نے ان افراد کی پرورش کی ہے''۔!!

## ماڈلین بنٹنگ کی مغالطہ آمیزی

ایک اور انگریزی تجزیہ نگار ماڈلین بنٹنگ نے برطانیہ کے مسلمان علاقوں کا دورہ کیا۔ ان کے ائمہ مساجد، مذہبی رہنماؤں اور بااثر متوسط طبقہ کے عام لوگوں سے گفتگو کی۔ ان کے خیال میں برطانوی معاشرہ میں دو سوالات گردش کررہے ہیں:

ا۔ مسلم معاشرہ کو اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ ان کے بچوں میں متشددانہ ذہنیت کیوں پیدا ہوتی ہے۔ آخر وہ کس طرح دہشت گرد بن جاتے ہیں اور پولیس اس کو اس کی ہوا تک نہیں لگ پاتی؟ مسلمان خود ان امور کی اطلاع کیوں نہیں بہم پہنچاتے؟

۲۔ کیا مزید ایسے افراد ابھی باقی ہیں؟

تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ مسلم معاشرہ پر جو ذمہ داری ڈالی جارہی ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ ایک برطانوی مسلمان نے ان سے احتجاج کیا کہ اگر ان خودکش بمباروں کی ماؤں کو ان کی حرکتوں کی اطلاع نہیں تھی تو عام آدمی کو اس کی بھنک کیسے لگ سکتی ہے؟ ایک دوسرے مسلمان نے بڑی تلخی سے کہا کہ ''اب اتنا کافی نہیں ہے کہ ہم ان دہشت گردوں کی مذمت کررہے ہیں۔ اب ہمیں ان کا صفایا کرنا ہوگا''۔

تجزیہ نگار کے مطابق خود مسلم معاشرہ اپنا احتساب کررہا ہے۔ ایک امام مسجد نے ان سے کہا کہ ''مسلم معاشرہ اپنے نوجوانوں کی تربیت کرنے اور ان کی مستقبل کی صورت گری کرنے میں کیوں ناکام ہے؟ آج مسجدیں مذہبی رہنمائی فراہم کیوں نہیں کرپاتیں؟ ہمیں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا چاہیے''۔

ماڈلین بنٹنگ نے آگے چل کر اسلام کی تعلیمات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نوجوان دہشت گردی پر مبنی تربیت اور فکری ارتقا کی تشکیل میں قرآن کی جہادی تعلیمات کا بھی دخل ہے۔ یہ وہ مرکزی نکتہ ہے جس پر تمام مفکرین ومبصرینِ مغرب خواہ وہ صلیبی ذہنیت رکھنے والے مستشرقین ہوں یا معتدل اور کسی حد تک منصفانہ سوچ کے حامل تجزیہ کار اور قلم کار ہوں۔ متفق ہیں اس تصور اسلام کو فاضل تجزیہ نگار نے ''گمراہ کن دینیات اسلام'' (Shoddy Islamic Theology) کا نام دیا ہے۔ وہ کسی مسلمان کی جانب سے یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ:

> ''اسلام میں کیا خاص بات مضمر ہے کہ وہ انسانوں کو خودکش بنادیتا ہے؟ بہت سے لوگ مسئلہ عراق پر واقعی ناراض ہیں مگر اس کے بدلے وہ اپنی جانیں گنوانے پر آمادہ نہیں؟ یہاں کوئی گم شدہ کڑی ضرور ہے! آخر کیا چیز ایک نوخیز لڑکے کو خودکشی پر ابھارتی ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کی سوچ یہ ہو جائے کہ زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ ذخیرہ اندوزی کر لی جائے۔ اور یہی اسلامی دینیات کا موضوع ہے۔ اس سوچ کو بدلنا ہوگا۔ خاص طور سے قرآن میں تشدد کے حوالوں کو ان کے سیاق وسباق کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ اس عالمی گاؤں میں اس کی تشریح نو کرنی ہوگی اور یہ فریضہ ہمارے اسلامی اسکالرز انجام دے چکے ہیں۔ نئی فکر کی قطعی طور پر سخت ضرورت ہے''۔[۱۲]

## اسلامی تاریخ میں تشدد کی جڑیں؟

تشدد اور قرآن کریم کے حوالہ سے یہاں برطانیہ میں مقیم پاکستانی دانش ور ضیاء الدین سردار کا حوالہ دینا بھی مناسب ہے۔ وہ اسلامی سائنس کے مسائل وموضوعات پر معروف مصنف ہیں، ان کا اپنا خاص انداز فکر ہے۔ نیو اسٹیٹسمین کے ایک شمارہ میں ان کا

دعویٰ ہے کہ دہشت گردی سے اسلام کا تعلق ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت تشدد سے نفرت کرتی ہے اور یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ''اسلام کا اصل پیغام امن وسلامتی کا پیغام ہے'' تاہم انھیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ:

> ''یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن یا اسلامی شریعت کو بہیمانہ کارروائیوں کے جواز کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ دہشت گرد ایک مخصوص فکر کی پیداوار ہیں جس کی جڑیں اسلامی تاریخ میں گہری ہیں۔ ان کی پرورش ایک اسلامی روایت کے ماحول میں ہوئی ہے جو اپنے طرز تخاطب، فکر اور عمل میں بنیادی طور پر مخالف انسانیت اور تشدد انگیز ہے...... ان ظالمانہ حقیقت کو تسلیم کر کے ہی ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ بھی اسلام کے اندر مسلمانوں کی اپنی لڑائی ہے۔ درحقیقت یہ روحِ اسلام کی بقا کی لڑائی ہے''۔[۱۳]

مسلمانوں کے اندر سے غالباً یہ پہلی آواز ہے جس نے دہشت گردی کی جڑیں اسلامی تاریخ اور مسلم روایت میں ڈھونڈ نکالی ہے۔ ورنہ اسپوزیٹو اس سے پہلے اسی طرح کی نظریہ کاری کرتے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک نئی کتاب Unholy War میں ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ کے پنٹاگن دھماکوں کو مسلم تاریخ میں رائج تصور جہاد سے مربوط کرنے کی نامسعود سعی کی ہے۔ قرآن کا تصور جہاد، محمد ﷺ کے غزوات، شیعہ اور سنی اختلافات اور فرقہ وارانہ فکری ارتقا، شیعہ سنی تصوراتِ جہاد، انقلابی جہاد کے تاریخی مآخذ، ابن تیمیہؒ کے نظریات جہاد، وہابی تحریک حجاز، شیخ حسن البنا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب اور آیت اللہ خمینی، ایرانی انقلاب اور اس کے مضمرات، اسلامی ریاست اور اس کی حکمت عملی، دور جدید میں اسلام کا احیا، فلسطین میں حماس کے اقدامات ونظریات، الجیریا میں اسلامی تبدیلی کے آثار، سعودی عرب میں وہابیت کے خطرے، روس اور وسط ایشیا میں وہابیت کے خطرناک رجحانات وغیرہ موضوعات ومسائل پر فاضل مصنف نے تحقیق کے

تقاضوں کی مکمل رعایت کرتے ہوئے بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ تشدد اور دہشت گردی کی موجودہ واردات نے اسلامی تاریخ کے مذکورہ بالا مراحل سے گزرتے ہوئے اپنا نظریہ تراشا اور اپنا فلسفہ تشکیل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض خلط مبحث ہے۔ ان تمام مفکرین و مصلحین نے جہاد کی قرآنی تشریح کرنے کے ساتھ تشدد، دہشت گردی، زیر زمین کاروائی، خفیہ منصوبہ بندی اور کسی ریاست میں رہتے ہوئے اس کے خلاف عسکری مہم جوئی کی زبردست مخالفت کی ہے۔

بلا شبہ اسلامی تاریخ میں بعض دوسری مثالیں بھی دستیاب ہیں۔ جیسے خوارج کا وجوداور مسلم حکمرانوں کے خلاف ان کا خروج، حسن بن صباح اور حشاشیون کی فتنہ انگیزی، موجودہ مصر میں جماعة التفكير والهجره کی کاروائی، محمد الفرج اوران کی تصنیف الفريضة الغائبة کی نظریہ کاری وغیرہ جن کا بکثرت حوالہ اسپوزیٹو نے دیا ہے مگر وہ خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان نظریات اور جماعتوں کی حیثیت استثنائی ہے یہ مسلم امت کے اصل دھارے سے بہت دور، شذوذ وانحراف سے دوچار اور مسلمانوں کی جانب سے مسترد کردہ ہیں۔[۱۴] جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تو اسے مسلم روایت اور اسلامی تاریخ کا ایک حصہ قرار دینا اور دہشت گردی کی موجودہ واردات کو ان سے مربوط کرنا ایک مغالطہ آمیزی اور سفسطہ کاری کے سوا کیا کہلائے گا۔

## سانحہ نائن الیون

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کا المناک اور ناقابلِ فراموش سانحہ جس نے امریکہ ہی نہیں پوری مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دونوں میناروں کے انہدام کے ساتھ امریکہ کی ابدی بالا دستی کے دعوے کو کھوکھلا ثابت کردیا تھا اور جسے امریکی صدر بش نے اکیسویں صدی کی ''پہلی جنگ'' قرار دیا تھا، اس کے بعد امریکہ اور پوری مغربی دنیا پر ایک ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ امریکہ کی قیادت حیرت وصدمہ، غم وغصہ، تذلیل واستخفاف، جنون انتقام کی کیفیات و واردات سے گزری۔ لندن میں ۷ جولائی کے حادثہ کی طرح

اسے بھی ''تہذیب کے خلاف جنگ'' قرار دیا گیا گویا مغربی دنیا ہی مہذب دنیا ہے اور باقی سب وحشت کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہنری کسنجر نے مشورہ دے ڈالا کہ اصل ہدف اس پورے نظام اور ان تمام ممالک کے خلاف براہ راست کارروائی ہونا چاہیے جہاں اس نظام کے کل پرزے پائے جاتے ہیں اور اس مہم میں اگر دوسرے ممالک، امریکہ کا ساتھ نہ دیں تو اسے تنِ تنہا یہ اقدام کر ڈالنا چاہیے۔[۱۵] ایک خاتون این کملٹر نے تو یہاں تک ہدایت دے دی کہ براہ راست ملوث افراد کا پتہ چلانے کی کیا ضرورت ہے ہمیں ان ممالک پر فوری یلغار کر دینا چاہیے اور ان کے لیڈروں کو قتل کر دینا چاہیے۔[۱۶]

تاہم بعض مبصرین اور اربابِ بصیرت نے امریکی انتظامیہ کو اس حادثہ کے اصل محرکات وعوامل اور اس کے دوررس اثرات کی طرف توجہ دلائی تھی اور عام عربوں اور مسلمانوں کے دلوں میں پرورش پانے والی نفرت اور امریکہ مخالف جذبات کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کی تھی۔ روزنامہ انڈی پنڈنٹ کے سیاسی تبصرہ نگار رابرٹ فسک (Robert Fisk) نے اپنے چشم کشا تبصرے میں لکھا تھا کہ:

> ''یہ اقدام غیر معمولی حوصلہ مندی اور دانش کا مظہر ہوگا کہ امریکہ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دنیا میں اپنے کردار پر، عربوں کی تکالیف پر، امریکی حکومت کی بے حسی اور اپنے موجودہ صدر کی بے عملی پر غور کرے''۔
>
> ''بے شک امریکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ ''عالمی دہشت گردی'' کے خلاف جوابی کارروائی کرے، اسے کون الزام دے سکتا ہے؟ دہشت گردی کے اشتعال انگیز اور بسا اوقات نسل پرستی والے لفظ کے استعمال پر کون ہے جو امریکہ پر انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ایسے لوگ مل جائیں گے جو ہر اس تجویز کو فوراً رد کر دیں گے جس میں عالم گیر پیمانے پر ہونے والی اس دہشت گردی کے عمل کی حقیقی تاریخی وجوہ پر زور دیا گیا ہو۔ لیکن اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم ایسے زبردست

بحران کا شکار ہو جائیں گے جو ہم نے ہٹلر کی موت اور جاپان ی
شکست کے بعد نہیں دیکھا۔ کوریا اور ویتنام کی اہمیت تو اب مقابلتاً
کچھ بھی نہیں رہی"۔۱۷

## اسلامی تحریکوں کا ردعمل

اس وقت دنیا کی اسلامی تحریکوں کے سو سے زیادہ قائدین اور عالم اسلام کے چوٹی کے علماء و مفکرین نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء ہی کو اس قتل ناحق کی مذمت کی۔ اس کے بعد ۱۸ ستمبر کو ایک اور بیان کے ذریعہ اسلام اور امت مسلمہ کے موقف کو دوٹوک انداز میں بیان کیا۔ یہ موقف پوری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کا ترجمان ہے۔ اس بیان کے الفاظ اس طرح ہیں:

۱۔ ہم نیو یارک اور واشنگٹن میں بزدلانہ دہشت گرد حملوں کی مذمت کرتے ہیں جن کا نشانہ بننے والے تمام ممالک سے اور دنیا کے بڑے مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ اسلام انسانی جان کے تقدس کا علم بردار ہے۔ قرآن کے مطابق ایک بے گناہ کو ہلاک کرنا ساری انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان اس جارحیت کے نتیجے میں جانی نقصان پر غم زدہ ہیں کہ یہ امریکہ اور پوری دنیا کا مشترکہ نقصان ہے۔

۳۔ ہم یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام حصوں میں دہشت گردی کا نشانہ بننے والے ایسے ہی ہمدردی اور تشویش کے مستحق ہیں۔ جو لوگ انسانوں کی مساوات کے علم بردار ہیں، انھیں دنیا کے تمام حصوں میں دہشت گردی کی مذمت کرنا چاہیے۔ اور اس کے خلاف لڑنا چاہیے۔

۴۔ ہم اس اصول کے علم بردار ہیں کہ انسانوں کے خلاف دہشت گردی کے جو بھی ذمہ دار ہیں۔ افراد، گروپ یا حکومتیں، ان کو کٹہرے میں لانا چاہیے اور کسی ہمدردی یا امتیاز کے بغیر اس جرم کی سزا دینا چاہیے۔

۵۔ہم سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مشتبہ افراد کو کسی غیر جانب دار عدالتی طریقے سے ان کا جرم ثابت کیے بغیر، یک طرفہ طور پر سزا دینے کی کوشش بھی دہشت گردی ہی قرار پائے گی، جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی نہ اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔

۶۔عدل وانصاف اور فطری وبین الاقوامی قانون کے اصولوں کا یہ کم سے کم تقاضا ہے کہ جرم کا غیر جانب دارانہ بنیادوں پر تعین اور واضح ثبوت ہو۔اس لیے ہم دنیا کی تمام حکومتوں سے، خصوصاً امریکہ حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ صرف شبہے کی بنیاد پر طاقت کا یک طرفہ من مانا استعمال نہ کریں۔اور مدعی، وکیل، جج اور جلاد سب کچھ خود ہی بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل، عرب، مسلمان اور یوروپی ممالک کے لیڈروں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو بے جا خوں ریزی اور تشدد میں اضافہ سے بچائیں جس سے اقوام عالم اور ریاستوں میں مزید جھگڑے اور تنازعات پیدا ہوں گے۔

۷۔دہشت گردی کا مقابلہ صرف ایسے ہی ذرائع سے کیا جاسکتا ہے جو منصفانہ اور عادلانہ ہوں، اور دنیا میں امن وسکون کا باعث بننے والے ہوں۔ہمیں ایسے اقدامات میں فریق یا خاموش تماشائی نہیں بننا چاہیے جن سے انتقام، رعونت اور بین الاقوامی دیوالیہ پن کی بوآتی ہو۔

۸۔آیئے، سب لوگ انصاف کے لیے کھڑے ہوجائیں اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے کار پردازوں کو قانون کے مطابق سزا دینے کے لیے اجتماعی کوشش کریں، اور دنیا میں دہشت گردی کی جڑ میں پائی جانے والی ناانصافیوں، استحصالوں اور بالادستی کی پالیسوں کو ختم کرنے کے لیے کوشش کریں۔[۱۸]

## آیات قتال سے استدلال

ان تمام خودکش یلغاروں، بہیمانہ اقدامات اور انسانیت مخالف مہم جوئیوں کے

پس پردہ مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق قرآن کی آیاتِ قتال سے استدلال کیا گیا ہے۔ اسپوزیٹو اس طرح کی چند آیات نقل کرتے ہیں:

فَإِذَا إِنْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوْا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التوبة:۵)

(پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔)

قاتلوا الذين لايؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يحرمون ماحرم الله ورسوله ولا يدينون دين الحق من الذين أوتوا لكتاب حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون. (التوبة: ۲۹)

جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔)[۱۹]

علماء وفقہاء اسلام نے غیر معمولی زور اس مسئلہ کو حل کرنے میں صرف کیا ہے کہ آیت میں مذکور ''صغار'' کا اطلاق کن صورتوں میں ہوتا ہے، انھوں نے اس سوال سے تعرض نہیں کیا کہ 'صغار' کا اطلاق کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے قرین عقل تعبیر یہ اختیار کی گئی ہے کہ ذمیوں کے صغار کا مطلب ان میں سے بعض کے اسلامی قانون کی پابندی کر لینے سے اور بعض کے جزیہ ادا کر دینے سے پورا ہو جاتا ہے۔[۲۰] لیکن اس تاویل کا بھی پہلا جز وروح قرآنی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام ایک صالح اور عادلانہ نظام کے قیام کا علم بردار ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ علماء

نے زیر نظر معاملہ میں اسلام کو اہل جزیہ کے لیے رحمت یا اصلاح حال کے پیغام کی حیثیت سے نہیں بلکہ وسیلۂ تذلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور یہ قرآن کے عمومی منشا کے خلاف ہے۔

یہ آیت جس سیاق کلام میں وارد ہوئی ہے اس میں نزول قرآن کے وقت موجود اہلِ ایمان کو اس کشمکش کے بارے میں مخاطب بنایا گیا ہے، جو جارحیت پسند مشرکین کے ساتھ ان اہل کتاب پر بھی حاوی تھی جو مشرکین ہی کی خصوصیات اپنائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار تھے۔ سلسلہ کلام کے لیے درج ذیل کی آیات کا مطالعہ کیجیے:

یریدون أن یطفئوا نور الله بأفواههم ویابی الله إلا أن یتم نوره ولو کره الکافرون هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون یاایها الذین آمنوا إن کثیرا من الاحبار والرهبان لیاکلون أموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله (التوبۃ:۳۲-۳۴)

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔)

یہ سلسلہ کلام آگے چل کر یہاں مکمل ہوتا ہے:

وقاتلوا المشرکین کافةً کما یقاتلو نکم کافة واعلموا أن الله مع المتقین. (التوبة: ۳۶)

(اور مشرکین سے تم سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔)

## منہجِ فکر کی خامی

ہمارے بیشتر کلاسیکی فقہاء اور علماء نے قرآن کے اس اسلوب و منہج فکر کو جس کا تعلق ایک مخصوص جارح اور برسرِ جنگ دشمن سے تھا، وسعت اور عموم دے کر تمام غیر مسلموں پر اسے منطبق کر دیا اور اسلام کا ایک قاعدہ کلیہ طے کر دیا کہ مشرکوں اور اہلِ کتاب کے ساتھ دو ہی رویے اپنائے جاسکتے ہیں یا تو وہ قانون شریعت کی بالادستی تسلیم کر لیں یا جزیہ دینا منظور کر لیں۔ ان فقہاء نے آیات کے سیاق کلام اور نظم وارتباط کو ملحوظ رکھا نہ شریعت کے عام مقاصد اور قرآن کریم کی بنیادی انسانیت نواز تعلیمات پر توجہ دی۔ اگر ہم علمائے متقدمین کے اس غیر معمولی نتیجہ کو درست مان لیں تو ہمیں مدینہ اور نجران کے یہود و نصاریٰ سے کیے گئے نبوی معاہدوں کی اہمیت و معنویت کو فراموش کرنا پڑے گا۔ درحقیقت جزیہ کی ادائیگی حالت 'صغار' سے علیحدہ ایک امر ہے یہ دونوں الگ الگ دو مختلف معاملات ہیں اور غیر مسلموں سے معاملہ کرنے میں ان کی غرض و غایت جدا جدا تھی۔ 'صغار' کا انطباق تمام غیر مسلموں پر کرنا قرآن کا مقصود نہ تھا۔ یہ ایک مخصوص کیفیت تھی جس کا تعلق کفار قریش اور اس وقت کے یہود و نصاریٰ سے ان کے مختلف عقیدہ و مذہب اختیار کرنے کی بنا پر نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے خلاف ان کی مسلسل معاندانہ روش ان کی پیہم غداری و بغاوت، اور اسلامی ریاست کے خلاف ان کے اعلان جنگ کی بنا پر تھا کہ ان کا یہ رویہ عدل و انصاف اور بنیادی حقوق کی تحفظ کی مخالفت میں تھا جس کی بیخ کنی اس وقت بھی ضروری تھی اور ہر دور میں ضروری رہے گی۔ [۲۱] اسی لیے دورِ جدید کے مفسرین نے ان آیاتِ قتال کو اسی مخصوص تناظر میں دیکھا ہے اور کفار و مشرکین اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں پر اس کا عمومی اطلاق نہیں کیا ہے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) نے آیت زیر بحث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان سے لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ "وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم

ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمان روائی وامامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت تابع و مطیع بن کر رہیں۔ جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں "ہاتھ سے جزیہ دینے" کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں بلکہ وہ اہل ایمان بڑے ہوں جو خلافتِ الٰہی کا فریضہ انجام دے رہے ہوں"۔۲۲ یہ جزیہ "اس آزادی کی قیمت ہے جو انھیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لیے دی جاتی ہے اور اس قیمت کو اس صالح نظام حکومت کے نظم ونسق پر صرف ہونا چاہیے جو انھیں اس آزادی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے"۔۲۳

مولانا امین احسن اصلاحی (م۱۹۹۷ء) سورہ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے ان آیاتِ قتال کو مخصوص مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں (آیت۱۹۲) تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص کفارِ قریش سے ہے۔ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملہ کے لیے محض ایک وقتی نزاع نہ تھی بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لیے تھی...... واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو کفر وشرک کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید واسلام اور امت مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدی کا اصل نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آں حضرت ﷺ کے مقدس مشن کا آخری کام تھا"۔۲۴

مولانا اصلاحی نے یہاں "فتنہ" قرآنی اصطلاح کی جو تشریح کی ہے اس سے بھی آیاتِ قتال کے مخصوص مخاطبین پر روشنی پڑتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ "فتنہ کے معنی یہاں کسی کو

جبر وظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کو Persecution کہتے ہیں، قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً:

| | |
|---|---|
| إن الذين فتنوا المومنين والمومنات ثم لم يتوبوا فلهم عذاب جهنم (بروج:۱۰) | (بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے والوں اور ایمان لانے والیوں کو دین سے پھیرنے کے لیے اذیتیں پہنچائیں ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔) |
| على خوف من فرعون وملائهم أن يفتنهم (یونس:۸۳) | (فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو مصیبت میں مبتلا کردیں۔) |
| ثم إن ربك للذين هاجروا من بعد ما فتنوا (نحل:۱۱۰) | (پھر تیرا رب ان کے لیے جنھوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ طرح طرح کی ایذاؤں میں مبتلا کیے گئے) ۲۵ |

مولانا شبیر احمد عثمانی ۲۶ (م۱۹۴۹ء) اور حافظ صلاح الدین یوسف ۲۷ کے تفسیری حواشی بھی ان آیاتِ قتال کو کفار قریش اور اس وقت کے یہود ونصاریٰ کے لیے مخصوص مانتے ہیں جو دراصل اپنی پیہم سازشوں اور معاندانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسلامی حکومت کے خلاف برسر جنگ تھے۔

دہشت گردی، اسلام اور مسلم تحریکات کے حوالے سے اٹھنے والے تنازعات کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ جن علماء اور مفکرین اسلام کا نام مغربی میڈیا سب سے زیادہ استعمال کر رہا ہے وہ خود تشدد اور طاقت کے اس بے محابا استعمال کے خلاف ہیں۔ مولانا مودودی کا نام اس سیاق میں بڑے اعتماد سے لیا جاسکتا ہے۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں لندن میں سوال وجواب کی مخصوص نشست منعقد ہوئی جس میں مولانا مودودی نے صراحت کی کہ جمہوریت کی بحالی کے لیے ''تحریکِ اسلامی نہ تو کسی تخریب کار گروہ سے تعاون کرے گی اور نہ اسے یہاں کام کرنے دے گی'' اور یہ کہ ''توڑ پھوڑ اور تشدد کے ذریعہ کوئی پائدار اور مستحکم نظام حکومت قائم نہیں کیا جاسکتا۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ کے ان ممالک کی مثالیں

ہمارے سامنے ہیں جہاں اس قسم کی کاروائیوں کے بعد انقلاب لائے گئے اور پھر وہاں انقلاب در انقلاب کا سلسلہ شروع ہوگیا اس لیے نہ ہم خود تشدد کا راستہ اختیار کریں گے نہ دوسروں کو اختیار کرنے دیں گے"۔ ۲۸

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع عام نومبر ۱۹۶۹ء کے موقع پر سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے فرمایا:

> "...... جہاں تک ہتھیار بند ہونے کا تعلق ہے اگر آپ کو لائسنس کا ہتھیار مل سکتا ہو تو ضرور رکھیے اور نشانہ بازی کی مشق بھی کیجیے لیکن غیر قانونی اسلحہ نہ رکھیے۔ مدافعت کے لیے اپنے کو تیار کرنا کوئی اخلاقی، شرعی یا قانونی جرم نہیں ہے بلکہ اس کی اجازت ہے لیکن خفیہ طریقہ سے کوئی مسلح انقلاب کرنا اسلام کے مزاج کے بھی خلاف ہے اور انجام کے لحاظ سے خطرناک بھی"۔ ۲۹

اگست ۱۹۷۲ء میں نوجوانوں ہی کی ایک محفل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "...... میرا مشورہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے، گولیاں کھانی پڑیں، مگر صبر کے ساتھ تحمل کے ساتھ، کھلم کھلا علانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون ضابطے اور اخلاقی حدود کے اندر چلاتے رہیے۔...... آپ سے میری درخواست یہ ہے کہ آپ اپنی اخلاقی ساکھ کو کبھی نقصان نہ پہنچنے دیں اور غیر آئینی طریقوں کے بارے میں سوچنے والوں کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کریں۔ حالات جیسے کچھ بھی ہیں ہمیں ان حالات کو درست کرنا ہے اور غلط طریقوں سے حالات درست نہیں ہوتے بلکہ اور بگڑ جاتے ہیں"۔ ۳۰

دنیا کی تمام بڑی اسلامی تحریکوں نے قانون، جمہوریت، رائے عامہ، آزادی فکر و نظر، تکثیریت اور تنوع و تعدد کے اصولوں اور ان کے تمام تقاضوں کی ہمیشہ رعایت رکھی ہے۔ ہندو پاک کی جماعت اسلامی ہو یا مصر و شام اور سوڈان کی الاخوان المسلمین، ترکی کی

عظیم شخصیت پروفیسر نجم الدین اربکان کی قائم کردہ سیاسی جماعت ہو یا الجزائر میں عباس مدنی کا محاذ، ملیشیا میں PAS کا حلقہ ہو یا تیونیسیا میں راشد الغنوسی کی تحریک، ہر اسلامی جماعت اور اس کے مفکرین نے تشدد اور دہشت گردی، خفیہ وزیر زمین کاروائی، اور پراسرار پروگراموں کی مخالفت کی ہے اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے طویل المیعاد تعمیری اقدامات پر گامزن رہنے کا موقف اختیار کیا ہے۔ انھوں نے سیاسی وتہذیبی ضابطۂ اخلاق کی مکمل پاسداری کی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ اگر مسلمہ اصول و قواعد اور سیاسی ضابطوں کو تسلیم نہ کیا گیا تو جمہوری عمل سبوتاژ ہو جائے گا، ملک کے اندر لاقانونیت اور انتشار کو ہوا ملے گی اور فسطائی عوامل اور آمرانہ رجحانات کو فروغ پانے کا راستہ کھل جائے گا۔ عرب اور مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ انھوں نے جمہوری و آئینی اسلامی تحریکوں کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ان کے خلاف ناپاک پروپگنڈہ مہم چلائی، ان پر جھوٹے الزامات لگا کر دارو گیر اور قید و بند کے جاں گسل مراحل سے انھیں گزارا اور ان تمام جمہوریت کش اقدامات، خلاف دستور سازشوں اور قانون و آئین کی دھجیاں اڑانے والی پالیسیوں میں مغرب برابر شریک رہا۔ اس نے عالم اسلام پر ہمیشہ آمروں اور ظالموں کو مسلط رکھا اور سیاسی اور فوجی ہر سطح پر ان کی پشت پناہی کی اسی سے بیزار ہو کر اور اس غیر جمہوری فضا سے تنگ آ کر بعض جوشیلے نوجوانوں اور ان کے دھڑوں نے دو ایک تشدد آمیز واقعات انجام دے دیے جس کا خمیازہ دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے حالاں کہ ان تمام یک طرفہ ظالمانہ کاروائیوں کے بعد بھی اسلامی تحریکوں نے پرامن جد و جہد ہی کا راستہ اختیار کیے رکھا۔ اس کی تعلیم و تلقین کرتے رہے اور جمہوری و آئینی راستوں پر ڈٹے رہے کہ یہی سیرت نبوی کا سبق ہے۔ ڈاکٹر محمد رضا محرم کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ تشدد کے بحران سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ تمام لوگوں کے لیے جمہوریت قائم کی جائے۔ تمام لوگ جمہوریت کو برتیں اور قائم و برقرار رکھیں اور جمہوریت کے سایہ میں تمام لوگوں کے مقاصد و مفاد حاصل کیے جائیں"۔[۴۱] تحریک اسلامی تشدد کی مخالفت کسی مصلحت کے پیش نظر نہیں کرتی بلکہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ صحیح اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔"[۴۲]

# قرآنی ارہاب کا جدید اطلاق

قرآن کریم کی آیاتِ قتال سے دہشت گردی کے جواز پر استدلال کی کم زوری اوپر گزر چکی ہے۔ جدید عربی زبان میں اس اصطلاح کے لیے ''إرھـاب'' اور دہشت گرد کے لیے ''ارہابی'' کے الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے مگر مختلف معانی میں۔ قرآنی استعمالات کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان سے بھی دہشت گردی کے مروج مفہوم کی تائید نہیں ہوتی۔

''إرھـاب'' کا مادہ 'ر ہ ب' ہے یہ لفظ قرآن کریم میں تین مقامات پر خوف کے معنی میں بطور اسم استعمال ہوا ہے۔ سورہ الحشر میں کفار قریش اور یہودیوں کی ذہنیت، موت سے فرار، بزدلانہ فطرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن مسلمانوں کے رعب و دبدبہ کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ (۱۳) (ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے)

یہ اشارہ ہے دشمنان اسلام، کفار اور یہود بنو قینقاع کی طرف جو اپنی کثرت تعداد اور جنگی وسائل کے باوجود اپنی اندرونی کمزوریوں کے سبب مسلمانوں کی مٹھی بھر اور بے سروسامان جماعت سے شکست کھا چکے تھے۔ سورہ القصص آیت ۳۲، اور سورہ الانبیاء آیت ۹۰، میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ بطور فعل تین مقامات پر ثلاثی مجرد کی حیثیت میں ڈرنے اور خوف کھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (الاعراف آیت ۱۵۴، البقرۃ آیت ۴۰، اور سورہ النحل آیت ۵۱) سورہ الاعراف آیت ۱۱۶ میں یہ لفظ باب استفعال سے وارد ہوا ہے جس کے معنی خوف زدہ کرنے کے ہیں۔ فرمایا

فَلَمَّـا اَلْقَوْا سَحَرُوا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْا هُمْ وَجَاءُ وا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (جادوگروں) نے جو اپنے اَنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔)

ان تمام مواقع پر اسم اور فعل دونوں صورتوں میں یہ لفظ حرب وضرب سے ہٹ کر عام معنوں میں آیا ہے البتہ سورہ الأنفال میں اس لفظ کا استعمال عسکری وحربی مفاہیم کے ساتھ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مسلمان سامان جنگ اور فوجی وعسکری قوت سے ہمیشہ مسلح رہیں کہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کاروائی کرسکیں ایسا نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی تیار کرنے میں لگیں اور دشمن اپنا کام کر جائے۔ دیکھیے قرآن کا اسلوب بیان کتنا صریح اور دوٹوک ہے:

وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَاتَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ. (الانفال:٦٠)

(اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کردو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔)

آیت مذکورہ سے پہلے کی آیت میں قرآن نے حکم دیا ہے کہ اگر کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو اور کوئی مخالفانہ کاروائی کرنے سے پہلے فریق ثانی کو صاف صاف بتادو کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا تاکہ فسخِ معاہدہ کا علم اسے بھی ہو جائے اور کوئی غلط فہمی اس باب میں باقی نہ رہے۔ اسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی ﷺ نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا کہ **من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلن عقده حتى ينقضي أمده أو ينبذ اليهم على سواء** (جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہوا سے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔)

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صراحت کی ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک

صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی الاعلان معاہدہ توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کاروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے فسخِ معاہدہ کا نوٹس دیں بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کاروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم بنی خزاعہ کے معاملہ میں نبی ﷺ کے طرزِ عمل سے نکالا ہے۔[۴۳] البتہ اس کے لیے کچھ بنیادی شرطیں بھی انھوں نے طے کر دی ہیں:

۱۔ فریق مخالف کا نقض عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

۲۔ مسلمان اپنے طرزِ عمل سے مخالف فریق کو معاہد سمجھنے کا دھوکہ نہ دیں۔

۳۔ فریب کاری سے کلیۃً اجتناب کیا جائے اور بظاہر صلح بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال نہ کیا جائے۔ مسلمانوں پر یہ اخلاقی ذمہ داری ہر حال میں عائد ہوتی ہے کہ ان کا استعمال طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہو اور کھلم کھلا ہو۔ چوری چھپے جنگی کاروائیوں کی اجازت اسلام نے نہیں دی ہے۔[۴۴]

یہاں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ آیت زیر بحث میں 'إرھــــاب' کا لفظ حربی روایات کے ضمن میں آیا ہے اور دشمن کے خلاف علانیہ جنگ کے مراحل میں تمام تر تیاریوں کی تاکید کی گئی ہے، اس سے بعض حضرات نے رسمی جنگ (Conventional warfare) اور غیر رسمی جنگ کے درمیان تفریق کرتے ہوئے صرف رسمی جنگ کے جواز پر استدلال کیا ہے اور غیر رسمی جنگی طریقوں (Unconventional warfare) کو ناپسندیدہ بتایا ہے جب کہ دور جدید کے بعض احیائی علماء نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے گوریلا کاروائیوں کو جائز ٹھہراتے ہوئے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق مدافعانہ خودکش حملوں کے حق میں بھی استدلال کیا ہے گرچہ ان کا یہ استدلال صرف فلسطینیوں کے حق میں ہے۔[۴۵] جو نصف صدی سے اپنے ملک، مذہب اور روایات کے تحفظ کی خاطر مدافعانہ جنگ لڑ رہے ہیں اور جان و مال کی بے مثال قربانی دے رہے ہیں تاہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی ان تمام آیات کا خطاب مسلم مملکت اور اس کے

سربراہ اعلیٰ سے ہے یا زیادہ سے زیادہ بحیثیت مجموعی مسلم معاشرہ سے ہے۔ انفرادی طور پر مسلمان افراد کو اس کا مخاطب قرار نہیں دیا جاسکتا اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے جنگ کے اصول وضوابط طے کرتے ہوئے صراحت کردی ہے کہ دشمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حق صرف حاکم اعلیٰ یا مقتدر حکومت کو ہے افراد کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

یہاں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس قرآنی اصطلاح کا ترجمہ ''دہشت گردی'' سے کرنا اور پھر اس پر 'دہشت گردی' کے سیاسی وحربی مضمرات کا اطلاق کرنا قرآن کی منشا اور روح سے انحراف کرنا ہے۔ جنگی تیاریوں کے ذریعہ اور حربی فنون کی تعلیم وتربیت کے ساتھ دشمنوں پر اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھنا تاکہ وہ ظلم وجارحیت پر آمادہ نہ ہوں اور قیام عدل وقسط کی راہ میں مزاحم نہ بنیں [۳۶] الگ بات ہے اور بالفعل قوت اور تشدد کا بے محابا استعمال کرنا الگ معاملہ ہے۔ دونوں کے طریقہ کار، حکمت عملی اور مقاصد میں بہت فرق ہے۔ قوت کا استعمال ہمیشہ اسلامی تاریخ میں حدود وضوابط کا پابند رہا ہے اور افراد کو اس کی اجازت کبھی نہیں دی گئی ہے۔ اسی لیے آیت زیر بحث میں اگر 'دہشت گردی' کے بجائے خوف اور دبدبہ کے قیام کا مفہوم متصور کیا جائے تو قرین عقل اور سیاق کلام سے ہم آہنگ ہوگا، گویا مسلم حکومت کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنی حربی ودفاعی تیاریوں کے ذریعہ باطل طاقتوں کے خلاف سیاسی ومعاشی اور جنگی دباؤ بنائے رکھے تاکہ آزادی، بنیادی حقوق کی پاسداری اور عدل وقسط کی آبیاری کی راہ میں کوئی شیطانی قوت رکاوٹ نہ بن سکے۔[۳۷]

## صلیبی ذہن کی عکاسی

اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تشدد اور دہشت گردی کی تعلیم نہ قرآن نے دی ہے نہ مسلم مفکرین اور علماء نے اس کی ہمت افزائی کی ہے پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب نے ''اسلامی دہشت گردی'' کا ہوّا کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔ ذرائع ابلاغ، دانشور اور سیاست داں کیوں ایک بے بنیاد بات کو مسلسل شدومد سے دوہرا رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف بہت کچھ بخار نکالتے رہنے کے باوجود اس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ ان حقیقی اسباب کا پتہ چلایا جائے جن کے نتیجہ میں امریکہ و برطانیہ اور مغربی اقوام کے خلاف نفرت کے طوفان امنڈ رہے ہیں۔ اس کے بجائے اپنی صلیبی ذہنیت کا مظاہرہ کر کے اسلام دنیا، اسلامی تحریکات اور قرآنی تعلیمات کی جانب تمام نفرتوں اور دشنام طرازیوں کا رخ موڑنا اور اسلام کو نفرت انگیز، قاتل و خونخوار مذہب کے روپ میں پیش کرنا اصل مقصد ہے۔ دیکھیے سیموئیل ہن ٹنگٹن کا فتویٰ:

> ''معاصر عالمی سیاست مسلم جنگوں کا دور ہے۔ مسلمان آپس میں لڑتے ہیں اور غیر مسلموں سے بھی، دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ لڑتے ہیں۔ مسلم جنگوں نے بین الاقوامی تنازعات کے سبب سے بڑے مظہر کی حیثیت سے سرد جنگ لے لی ہے۔ ان جنگوں میں دہشت گردی کی جنگیں، گوریلا جنگیں، خانہ جنگیاں اور بین الاقوامی تنازعات شامل ہیں۔ مسلم تشدد کی یہ مثالیں اسلام اور مغرب کے درمیان یا اسلام اور باقی دنیا کے درمیان تہذیبوں کے ایک بڑے تصادم کی شکل اختیار کر سکتی ہیں''۔ [۳۸]

## چہ باید کرد

یہاں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کا ردعمل کیا ہو؟

اگر انھیں اسلام مطلوب ہے تو اپنے ایمان، اپنے نظریہ و دین اور اپنی تہذیب پر صبر و ثبات کے ساتھ قائم رہتے ہوئے مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا اور توفیق الٰہی سے علم و تحقیق، معاشی قوت، عسکری طاقت، ایجاد و اختراع اور ٹکنالوجی کے تمام وسائل پر گرفت مضبوط کرنی ہوگی۔ انھیں حق، انصاف اور اعتدال کی راہ اپنانی ہوگی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے دلیل کی زبان اور حق پرستی کا مسلک اختیار کرنا ہوگا انھیں قرآن کے اس حکم کو ہر حال میں سینے سے لگانا ہوگا کہ:

| | |
|---|---|
| وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸) | (اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو) |
| وَلَايَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ: ۸) | (کسی قوم کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے) |
| وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل: ۷۰) | (ہم نے بنی آدم کو معزز و مکرم بنایا) |

پوری نوع انسانی اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جو نوع انسانی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ انسانی جان کا تحفظ واحترام قرآن کی بنیادی تعلیم ہے اور اس احترام آدمیت میں مسلمان اور غیر مسلم سب برابر کے شریک ہیں۔ اسی لیے مغرب امریکہ و برطانیہ کا رویہ خواہ کچھ ہو ہم دنیا کے تمام مسلمان ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء اور ۷رجولائی ۲۰۰۵ء کے خونچکاں واقعات کی مذمت کرتے ہیں اور ان غیر انسانی و غیر اسلامی حرکتوں اور انسانیت سوز واقعات سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں۔

ہم عوام الناس سے بالخصوص مسلمانوں سے درخواست کریں گے کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ کریں اور ترجمہ وتفسیر کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش براہ راست کریں اس سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوں گی اور نظم وربط اور سیاق کلام کی رعایت رکھنے کی وجہ سے بظاہر مشکل آیات بھی واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ جناب حسن سرور کے الفاظ میں ’’اس کا اہم فائدہ یہ ہوگا کہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے منتخب آیات کے مطالعہ کے روز افزوں رجحان میں کمی آئے گی اور اگر اس طرح غلط طریقہ کار مطالعہ قرآن کے لیے اختیار کیا گیا تو اس کی قلعی کھل جائے گی اور اس بحران سے نمٹنے میں قاری کو بڑی سہولت ہوگی‘‘۔ ۳۹

یہاں اس حقیقت اور قانونِ فطرت کی تذکیر ضروری ہے کہ جرم ضعیفی کی سزا ہر دور میں مرگِ مفاجات ہی کی صورت میں ملتی رہی ہے۔ طاقت۔ مادی و معنوی۔ کی اس سیاست کو امت مسلمہ کو سمجھنا ہی ہوگا کہ عزت، سرفرازی خود انحصاری اور ترقی کی راہ اسی سے کھلتی ہے۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) کے پیغام کا خلاصہ یہی ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ!

اور قرآن کی آیت أعدّوا کا لب لباب بھی یہی ہے۔

## حواشی و مراجع

۱۔ دی ہندو، جولائی ۸، ۲۰۰۵ء ص ۱

۲۔ دی ہندو، جولائی ۸، ۲۰۰۵ء ص ۱۶

۳۔ ٹونی بلیئر نے ان دھماکوں کو انہی الفاظ سے یاد کیا ہے۔

۴۔ The Hindu, July 17, p.13

۵۔ It is Iraq that motivates them, why is the same idiology killing Iraqis by terror in defiance of an elected Iraqi goverment? Why if it is the cause of Muslims that concerns them, do they so many with such callous indifference?..... It is a battle of ideas and hearts and minds both within Islam and otside it..... A battle not just about terrorist methods, but views.... It can not be beaten, in my view, except by confronting its symptoms and causes, head on. We must pull up by the roots. Within Britain we must join up with our Muslim

Community to take on the extremits. Worldwide we should confront it every where it exits."(The Hindu, July 17, p.13)

۶۔ Terror links - Of course there is an Iraq - terror link - and it long predates 9/11. Salim Lon, The Hindu, July, 13, p.11

۷۔ Suemas Milne, Insult to deny Iraq - link to London attacks. The Hindu, July 15, p.11.

۸۔ Robin Cook, Rethink needed on Fighting Terror. The Hindu, July 9, 2005, p.11

۹۔ جناب رمسفلڈ کا سوال اُنہی کے الفاظ میں یہ تھا:

Are we capturing, killing or deterring and dissuading more terrorists every day than the madrasas.... are recruiting, training and deploying against us? (The Hindu, July 21, 2005, p.11)

۱۰۔ فاضل مصنف کا یہ بیان بھی ذرائع ابلاغ کی سحر کاری نظر آتی ہے ورنہ ایسے مدارس کی باقاعدہ نشان دہی کر کے مشرف حکومت نے ان کے خلاف قانونی کاروائی کیوں نہیں کی جب کہ وہ مغربی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانے پر آمادہ ہیں۔

۱۱۔ William Dalrymple, No Madrasa Link to London Attacks,The Hindu, July 21,2005, P11.

۱۲۔ Medileine Bunting, Forget the Heavy Mob. The Hindu, July15, 2005, P11

۱۳۔ Ziauddin Sardar, Islam has every thing to do with

it, New Statesman, Quoted by Hasan Suroor, Lessons for Muslims from London Bombings, The Hindu, July19, 2005, P10.

۱۴۔ Esposito Johnl, Unholy war - Terror in the Name of Islam Oxford, 2005 PP42-43,64

۱۵۔ واشنگٹن پوسٹ، ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۶۔ نیویارک ڈیلی نیوز، ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۱ء Islam, Oxford, 2005,pp42-43

۱۷۔ دیکھیے پروفیسر خورشید احمد، امریکہ: مسلم دنیا کی بے اطمینانی، منشورات لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۴-۱۶۸

۱۸۔ نفس مصدر، ص ۱۴۸-۱۵۰

۱۹۔ اسپوزیٹو حوالہ بالا، ص ۳۵

۲۰۔ دیکھیے ابن قیم، احکام اهل الذمه، ترتیب صبحی الصالح، مطبعۃ جامعۃ دمشق، ۱۹۶۱ء، ج ۱، ص ۱۶-۱۸ نیز الشافعی، کتاب الأم، دار الشعب، قاہرہ، ۱۹۰۳ء، ج ۴، ص ۹۹-۱۰۱

۲۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، عبد الحمید احمد ابو سلیمان، اسلام اور بین الاقوامی تعلقات- منظر اور پس منظر اردو ترجمہ: محمد عبد الحیٔ فلاحی، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۲-۱۱۴

۲۲۔ مولانا سید ابو الاعلی مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۵ء، ج ۲ ص ۱۸۸

۲۳۔ نفس مصدر

۲۴۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، انجمن خدام القرآن لاہور، طبع سوم ۱۹۷۶ء ج ۱، ص ۴۳۲

۲۵۔ نفس مصدر، ص ۴۳۱

۲۶۔ القرآن الکریم وترجمة معانیه وتفسیره الی اللغة الاردویة، اردو ترجمہ: مولانا محمود الحسن، تفسیر: مولانا شبیر احمد عثمانی، شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلکس، مدینہ منورہ، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۳، حاشیہ ۳

۲۷۔ قرآن کریم مع اردو ترجمہ وتفسیر، اردو ترجمہ: مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر: حافظ صلاح الدین یوسف، شاہ فہد قرآن پرنٹنگ کمپلکس، مدینہ منورہ، ۱۴۱۹ھ ص ۵۱۶ حاشیہ ۲۔

۲۸۔ سید ابو الاعلی مودودی، تصریحات، ترتیب: سلیم منصور خالد، مکتبہ ذکری رام پور،

۱۹۸۰ء، ص ۱۳۴-۱۳۵۔

۲۹۔ نفس مصدر، ص ۱۴۹-۱۵۰

۳۰۔ نفس مصدر، ص ۱۹۲

۳۱۔ ڈاکٹر محمد رضا محرم، اسلامی تنظیمیں اور تشدد، اردو ترجمہ، پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ ج ۳، شمارہ ۴، اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۴ء ۹۵-۱۱۲

۳۲۔ ڈاکٹر مصطفیٰ محمد الطحان، راشٹریہ سہارا (اردو) ۱۴ر مارچ ۲۰۰۱ء۔ اس موضوع پر مزید اسلامی رہنمائی کے لیے دیکھیے مفتی محمد مشتاق تجاروی، دہشت گردی اور اسلامی تعلیمات، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، صفحات ۵۶

۳۳۔ سیرت کی تمام کتابوں میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپؐ نے انھیں فسخ معاہدہ کا نوٹس دینے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر حملہ کر دیا۔ تاہم اس قاعدہ استثنا سے جزوی طور پر استفادہ کرنا اور اپنے مفید مطلب پہلو ہی اصرار کرنا درست نہ ہوگا بلکہ پورے اسوہ نبوی کی پیروی لازم ہوگی اور تمام حالات نبویہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

۳۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۱۵۳-۱۵۵

۳۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ یوسف القرضاوی کی شرعی بحث جو عربی ماہنامہ فلسطین المسلمة (لندن) ۱۴/۹ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ/ستمبر ۱۹۹۶ء ص ۵۱-۵۲ میں شائع ہوئی ہے۔ مقالہ کے علمی استدلال اور مفصل منہج فکر کی افادیت کی خاطر پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی نے اس کا اردو میں خلاصہ شائع کر دیا ہے۔ دیکھیے، مقبوضہ فلسطین میں جانبازی کی فدائیانہ کاروائیاں، زندگی نو، دہلی، مارچ ۱۹۹۷ء ص ۱۸-۳۰۔ علامہ موصوف نے یہودیوں کو نقصان پہنچانے کے لیے سرفروشانہ فدائیانہ اقدامات کو جن میں ایک مجاہد شہادت سے سرفراز ہو جاتا ہے اور منصوبہ بندی کے تحت دشمنوں کو واصل جہنم بنانے کے لیے خود بھی جان دے دیتا ہے، جہاد کی عظیم ترین قسموں میں شمار کیا ہے اور آیت قرآن واعدوا (الانفال: ۶۰) کے بموجب مسلمانوں پر عائد شرعی واجبات وفرائض کی تکمیل کا ایک سنہرا ذریعہ قرار دیا ہے اور ایسے بے جگر جوانوں اور

مجاہدوں پر دہشت گردی اور خودکشی کے الزامات لگانے والوں کو سخت مطعون ٹھہرایا ہے۔ علامہ موصوف نے مخالفین کی طرف سے پیش کی جانے والی آیت کریمہ ولاتلقوا بأیدیکم الی التهلکة (البقرة:١٩٥) سے مفصل بحث کرتے ہوئے اس کا صحیح مفہوم متعین کیا ہے کہ ''جہاد سے جی چرانا اور دنیاوی مال ومنال میں پھنس کر شرعی واجبات سے پہلوتہی کرنا دراصل ہلاکت کو دعوت دینا ہے جس سے قرآن نے سختی سے منع کیا ہے''۔ وہ آخر میں اس پوری بحث کا نتیجہ نکالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ جانبازانہ اور شہیدانہ مساعی سوچ سمجھ کر اور ان کے مثبت ومنفی پہلوؤں کا موازنہ کرنے کے بعد انجام دی جائیں تو بہتر ہے بلکہ احسن یہ ہے کہ قابل اعتماد اور ثقہ مسلمانوں کی اجتماعی سوچ بچار کے بعد جب پیش قدمی میں خیر کا عنصر غالب نظر آئے تو نوجوان اللہ پر توکل کرتے ہوئے اقدام کریں''۔ ندوی، مسعود الرحمٰن خاں، حوالہ بالا، ص ٢٩-٣٠

٣٦۔ سید رشید رضا مصری نے آیت زیر بحث کی تشریح کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ إرھاب کی یہ کارروائی قیام امن اور جنگ بندی کو استحکام ودوام عطا کرنے کے لیے ہے نہ کہ جنگ کے حالات پیدا کرنے کے لیے (دلیل علی تفضیل جعله سببا لمنع الحرب علی جعله سببا لایقاد نارھا) تفسیر المنار ١٠/٦٦

٣٧۔ تفصیل کے لیے دیکھیے محی الدین غازی فلاحی، ارہاب ایک شرعی اصطلاح، تحقیقات اسلامی، ج ٢٢، شمارہ ٣، ص ٤٦-٦١

٣٨۔ نیوز ویک ڈاؤس اڈیشن، دسمبر ٢٠٠١ء۔ اس تہذیبی تصادم کے اسلامی تناظر کے لیے دیکھیے، علی عزت بیگوچ، اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کشمکش، اردو ترجمہ، محمد ایوب منیر، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ١٩٩٤ء صفحات ٣٦٧۔

٣٩۔ حسن سرور، دی ہندو، جولائی ١٩، ٢٠٠٥ء کا مقالہ بر صفحہ ١٠،

Lessons for Muslims from London Bombings.

☆

# ہندوستان کے چھ نمائندہ مدارس میں تدریس قرآن
## ایک تجزیاتی مطالعہ

اشہد رفیق ندوی

ہندوستان میں دینی مدارس کا قیام یہاں کے مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ اور شعائر واقدار کے تحفظ کی غرض سے عمل میں آیا ہے، اسی لیے انہیں تحفظ دین کے قلعے کہا جاتا ہے۔ ان مدارس کی تاسیس کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوگئی تھی مگر ان کا عنفوان شباب بیسویں صدی ہے۔

بیسویں صدی میں قرآنی علوم کا ارتقاء زیرِ بحث ہو اور اس ضمن میں مدارس اسلامیہ کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں قرآنی علوم کے حوالہ سے جن خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے بالعموم وہ مدارس یا مدارس کے فیض یافتہ افراد کے ذریعہ ہی انجام پذیر ہوئی ہیں۔

بیسویں صدی تعلیمی انقلاب کی صدی ہے، اس میں تعلیم وتدریس کے میدان میں طرح طرح کے تجربات ہوئے، کئی نئے نظام تعلیم برپا ہوئے اور طریقہ تدریس کے میدان میں بھی متعدد نئے طریقے آزمائے گئے۔ دینی مدارس کا نظام ونصاب بھی اس کا ایک حصہ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موقع پر یہ جائزہ لیا جائے کہ اس تعلیمی انقلاب کے تناظر میں دینی مدارس کے نظام ونصاب میں بالخصوص قرآن مجید کا جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، کیا مرتبہ ومقام متعین ہوتا ہے اور اس کی تدریس کو کس حد تک اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مدرسہ نے اپنے قیام کا مقصد اولین قرآن وسنت

کی گہری تعلیم بتایا ہے اور اپنے تعارفی لٹریچر میں اس کا نہایت بلند آہنگ میں تذکرہ بھی کیا ہے مگر اس سلسلے میں بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ نصاب کی تدوین وتشکیل کے وقت اسے کس حد تک ملحوظ رکھا جاسکا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ حقیقی صورت حال سامنے آئے گی بلکہ مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے میں بھی اس سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

ہندوستان میں دینی مدارس کی تعداد ہزاروں میں ہے، یہاں ان سب کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے فکر ومزاج، مقصد ومنہاج اور مسلک ومشرب کے لحاظ سے چھ مدارس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مدارس چھ الگ الگ نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان نمائندہ مدارس کے تجزیہ سے دیگر مدارس کی صورتِ حال کو بھی کسی قدر محسوس کیا جاسکے گا۔ منتخب مدارس کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) دار العلوم، دیو بند — (۲) ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(۳) مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر — (۴) جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

(۵) جامعہ اشرفیہ، مبارک پور — (۶) جامعہ سلفیہ، بنارس

## تدریس قرآن کا مفہوم:

تجزیہ شروع کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ 'تدریس قرآن' سے کیا مراد ہے؟ کیوں کہ قرآن مجید علوم ومعانی کا بحر ذخار ہے۔ مدرسہ کے محدود نصاب اور مختصر اوقات میں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں، تاہم ایک عالم دین تیار کرنے کے لیے کم از کم جن پہلوؤں سے تدریس ضروری ہے، ان کا تعین ناگزیر ہے۔ قرآن وحدیث کی تصریحات پر غور کیا جائے تو تعلیم قرآن کے ضمن میں تین پہلوؤں سے تعلیم کی بڑی تاکید ملتی ہے۔

(۱) ترتیل — (۲) تحفیظ — (۳) تفہیم

(۱) ترتیل: ترتیل کے ساتھ تلاوت قرآن کا حکم واضح طور پر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے، ورتل القرآن ترتیلا (المزمل: ۴) (اور قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کرو)

اس لیے ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھنے کا سلیقہ سکھانا تعلیم قرآن کا پہلا زینہ ہونا چاہیے، ترتیل وتجوید سے عدم واقفیت کی وجہ سے بعض الفاظ وآیات کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔اس لیے تعلیم قرآن کے ضمن میں ترتیل وتجوید کا اہتمام ناگزیر ہے۔

(۲) تحفیظ: نمازوں میں تلاوت، احکام کے استنباط اور روزمرہ کی زندگی میں عمومی رہنمائی کے لیے عالم دین کو قرآن مجید کے خاطر خواہ اجزاء کا ازبر ہونا عین مطلوب ہے۔ آیات قرآنی **انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون** (الحجر: ۹) (یہ یاددہانی ہم نے ہی اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور **انا علینا جمعه وقرآنه** (القیامہ: ۱۷) (بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا) کا تقاضا بھی یہی ہے، رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بے شمار مواقع پر اس کی ترغیب فرمائی ہے۔ اس لیے بجا طور پر تعلیم قرآن کے ضمن میں کسی قدر تحفیظ قرآن کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

(۳) تفہیم: قرآن مجید کے الفاظ ومعانی سے آگاہی اور قرآنی احکام وتعلیمات کا ادراک بندہ کی بنیادی ضرورت ہے۔ جو لوگ معانی ومطالب کی جانب توجہ نہیں کرتے، ان کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے **افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا** (محمد: ۲۴) (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں) اور رسول اکرم ﷺ نے سب سے بہتر انسان اسے قرار دیا ہے جو قرآن مجید کی تعلیم وتعلم میں مشغول ہو۔

تفہیم قرآن تعلیم قرآن کا سب سے مشکل اور اہم مرحلہ ہے۔ قرآنی مدلولات تک رسائی کے لیے بے شمار معاون وسائل وذرائع سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے، مشکل الفاظ کے حل کے لیے کتب لغات، نحوی وصرفی پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لیے کتب قواعد، احکام ومسائل کی تعیین کے لیے حدیث وفقہ، فنی محاسن کو سمجھنے کے لیے اعجاز القرآن اور باعتبار مجموعی تمام قرآنی مضامین تک رسائی کے لیے کتب تفسیر کی جانب رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تعلیم قرآن کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ تفہیم قرآن کے ضمن میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ قرآن مجید کی تفہیم مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر

کرائی جائے اور اس میں ان تعلیمات کو بالخصوص اجاگر کیا جائے جو معاصر چیلنجز کا جواب فراہم کرتی ہیں۔

آئندہ سطور میں مذکورہ مدارس کے نصاب تعلیم کا اس اعتبار سے تجزیہ کیا جائے گا کہ ان میں قرآن مجید کی تعلیم وتدریس کن پہلوؤں سے ہو رہی ہے اور کس حد تک ہو رہی ہے، اس کے لیے کتنا وقت مخصوص کیا گیا ہے، نیز بیسویں صدی میں تعلیمی نظام میں جو انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں، ان سے یہ کتنا ہم آہنگ ہے اور اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

## نصاب ایک نظر میں:

مدارس کے نصاب تعلیم کی ہیئت اور ان میں تدریس قرآن کے حوالہ سے جو مواد شامل کیا گیا ہے، جس طرح شامل کیا گیا ہے اور اس کے لیے جو وقت مخصوص کیا گیا ہے اس کی پوری صورت حال اس چارٹ سے ایک نظر میں سامنے آجاتی ہے۔

| ادارہ کا نام | مراحل تعلیم | مدت تعلیم | یومیہ گھنٹیاں | پوری تعلیمی مدت کے کل پیریڈ / تعلیمی ایام ۲۰۰ سالانہ | قرآن مجید کے لیے مخصوص یومیہ پیریڈ | پوری مدت میں تعلیم قرآن کا اوسط | مضامین ومواد |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| دارالعلوم دیوبند | درجات عربیہ (فضیلت) | ۸ سال | ۶ | ۹۶۰۰ | عربی اول ۱<br>دوم ۱<br>سوم ۱<br>چہارم ۱<br>پنجم ۱<br>ششم ۲ | ۱۴۰۰<br>۱۴.۵۸٪ | اول: تجوید، دوم: تجوید، سوم: ترجمہ و حل لغات نحو وصرف،<br>چہارم و پنجم: : ترجمہ، ششم: جلالین،<br>ہفتم و ہشتم: خالی<br>فراغت کے بعد جو طلبہ تکمیل تفسیر میں داخلہ لیتے ہیں، ان کا یک سالہ علیحدہ نصاب ہے جس میں تفسیر ابن کثیر اور بیضاوی کے منتخب اجزاء اور اصول تفسیر میں مناہل العرفان کا درس ہوتا ہے۔ حفظ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ |

| | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ندوۃ العلماء لکھنؤ | درجات ثانوی<br>درجات عالیہ<br>درجات علیا<br>مجموعی | ۵ سال<br>۴ سال<br>۲ سال<br>۱۱ سال | ۷ | ۱۵۴۰۰ | ششم: ۱،<br>ہفتم: ۱/۲<br>ہشتم: ۱/۲<br>نہم: ×،<br>دہم: ×،<br>عالیہ اولی: ۱<br>ثانیہ: ۱،<br>ثالثہ: ۳ ۱/۴<br>رابعہ: ۳ ۱/۴ | ۱۳۰۰<br>۸.۴۴٪ | ششم: حدر کی مشق، حفظ ہفتم: تجوید مع ضروری قواعد، ہشتم: تجوید، نہم: ×، دہم: ×، عالیہ اولی: الاعراف، یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، الحجر، النمل، مریم، طٰہٰ، الانبیاء، القصص، العنکبوت، الشعراء، النحل، مستوی التفسیر، جلالین ومدارک، عالیہ ثانیہ: سورۃ الکہف، المومنون، الفرقان، الروم تا الحجرات المراجع: تفسیر ابی السعود، عالیہ ثالثہ: المائدہ، الانعام، الانفال، التوبہ، الاسراء، الحج، سورہ ق تا والناس، مراجع: فتح القدیر والتفسیر المظہری، الفوز الکبیر، عالیہ رابعہ: الفاتحہ تا النساء، مراجع ابن کثیر، الکشاف، روح المعانی، احکام القرآن للرازی و ابن العربی۔ بیضاوی سے ربع جز اول۔ علیا اولی وثانیہ: میں قرآن وتفسیر قرآن صرف وہ طالب علم پڑھتا ہے جس کا مادہ اختصاص تفسیر ہو، اس کے لیے ڈیڑھ پیریڈ روزانہ مخصوص ہیں۔ |
| مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ | فضیلت | ۸ سال | ۸ | ۱۲۸۰۰ | اول: ×،<br>دوم: ×،<br>سوم ×،<br>چہارم: ۱،<br>پنجم: ۲،<br>ششم: ۲<br>ہفتم: ۲،<br>ہشتم: ۲ | ۱۸۰۰<br>۱۴.۰۶٪ | چہارم: الحدید تا والناس، پنجم: السبا تا الواقعہ، ششم: الاسراء تا الاحزاب، ہفتم: الانعام تا النحل نیز مفردات القرآن ہشتم: الفاتحہ تا المائدہ نیز اسالیب القرآن، مدرسۃ الاصلاح کے نصاب میں مرجع کے طور پر کوئی تفسیر Recommend نہیں کی گئی البتہ حضرات اساتذہ کرام سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ متعلقہ مراجع سے رجوع کر کے عالمانہ ومحققانہ درس دیں گے۔ نیز طلبہ عزیز اسی نہج پر تیاری کریں گے۔ تجوید کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں ہے۔ محترم قاری صاحب فارغ اوقات میں مشق کراتے ہیں۔ نصاب میں حفظ قرآن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ |

| | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| جامعۃ الفلاح ،بلریا گنج ،اعظم گڑھ | ثانوی<br>متوسط<br>عالمیت<br>فضیلت | ۳ سال<br>۳ سال<br>۲ سال<br>۳ سال<br>۱۱ سال | ۸ | ۱۷۶۰۰ | ششم<br>ہفتم ،ہشتم<br>عربی اول<br>ودوم ×<br>سوم: ۱<br>چہارم ۱ ۱/۲<br>پنجم ۱ ۱/۲<br>ششم ۱<br>ہفتم ۱ ۱/۲<br>ہشتم ۱ ۱/۲ | ۱۴۰۰<br>۷.۹۵% | سوم : سورۃ الحدید تا والناس مع حفظ سورۃ الصف والجمعہ والمنافقون ،المزمل ،المدثر ، القیامہ ،الدھر ،اصول تفسیر: مقدمہ ابن تیمیہ ،پنجم : مریم تا الاحزاب نیز حفظ مریم، لیس، السجدہ، اصول تفسیر :مقدمہ نظام القرآن للفراہی۔ ششم: یونس تا الکہف مع حفظ سورہ یوسف و ابراھیم ،ہفتم :المائدۃ تا التوبہ ،مع حفظ التوبہ ،ہشتم :الفاتحہ تا النساء مع حفظ الجزء الاول ۔فضیلت میں جن طلبہ کا خصوصی مضمون تفسیر وعلوم القرآن ہوتا ہے وہ تین گھنٹہ یومیہ کے لحاظ سے الگ سے تفسیر وعلوم القرآن پڑھتے ہیں ،اور ان کے لیے تفسیر، اصول تفسیر ،علوم قرآن ،مناہج تفسیر، احکام القرآن، اعجاز القرآن ، غریب القرآن ،تاریخ القرآن وغیرہ مضامین پر ایک جامع نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔ |
| دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ | ثانویہ<br>عالیہ<br>علیا | ۵ سال<br>۴ سال<br>۲ سال<br>۱۱ سال | ۸ | ۱۷۶۰۰ | ثانویہ ×<br>عالیہ اولی<br>۶ ،ثانیہ ۶<br>ثالثہ ۷<br>رابعہ ۶ علیا<br>اولی ۶<br>ثانیہ ۶ | ۱۲۳۲<br>۷.۰۰% | عالیہ اولی : الانعام ، الاعراف ، یونس، ہود، یوسف ،الرعد ،ابراھیم ،الحجر ،النحل ، الاسراء ،الکہف ،الملک تا الناس المرجع: الجلالین و المدارک عالیہ ثانیہ : مریم ، طہ الانبیاء ، المومنون ،الفرقان ،الشعراء، النحل ،القصص ،العنکبوت ،الروم ،لقمان، السجدہ سبا تا الاحقاف ۔ابن کثیر ،ارشاد العقل السلیم ،الفوز الکبیر (اصول تفسیر) عالیہ ثالثہ: الانفال، التوبہ، الحج ،النور، الاحزاب ،القتال ،الفتح ،الحدید تا التحریم مرجع : التفسیرات الاحمدیہ، للشیخ احمد جیون، واحکام القرآن للرازی ، الاتقان للسیوطی ،عالیہ رابعہ: البقرۃ ، آل عمران ،نساء المائدہ، مرجع : ابن کثیر ، احکام القرآن للرازی ،قرطبی، بیضاوی ۔علیا اولی: الکشاف سے بقرۃ ،آل عمران اور المائدہ۔ نیز اعجاز القرآن للباقلانی۔ علیا ثانیہ: تفسیر آیات الاحکام ، بمراجعۃ التفاسیر وکتب الفقہ العالیہ، مبہمات القرآن |

| | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| جامعہ سلفیہ بنارس | متوسطہ<br>ثانویہ<br>عالمیت<br>فضیلت | ۳ سال<br>۲ سال<br>۳ سال<br>۲ سال<br>۱۰ سال | ۷ | ۱۴۰۰۰ | متوسطہ دوم: ۱<br>سوم ۱ ثانویہ اول: ۱<br>ثانویہ دوم ۱<br>: ۱ عالمیت<br>اول: ۱<br>دوم: ۱<br>سوم: ۱<br>فضیلت ۱<br>فضیلت دوم: × | ۱۴۰۰<br>۱۰٪ | متوسطہ دوم : ترتیل پارہ عم اور نصف پارہ کا حفظ سوم: ترجمہ قرآن پارہ ۲۹ و ۳۰ مع حفظ نصف اول ، ثانویہ اول ترجمہ از پارہ ۲۵ تا ۲۸ حفظ جز ۲۹ - دوم ترجمہ پ ۱۹ تا ۲۴ ۔ عالمیت اول تفسیر جلالین الاعراف تا طہ دوم: مختصر ابن کثیر الفاتحہ تا انعام سوم: فتح القدیر جزء ۱۷ تا ۱۹<br>فضیلت اول: تفسیر بیضاوی سورہ البقرہ ،فضیلت دوم × خارجی اوقات میں ترتیل وتحفیظ کا اہتمام ہے۔ |

## نصاب پر ایک مجموعی نظر:

اس چارٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پہلی ہی نظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مدارس کے نصاب ونظام میں باہم کافی تفاوت ہے۔

### مراحل تعلیم:

دیوبند اور اصلاح میں پرائمری کے بعد ایک ہی تعلیمی مرحلہ ہے، ندوہ اور اشرفیہ میں تین مراحل ہیں، جب کہ فلاح اور سلفیہ میں چار مراحل ہیں۔

### مدت تعلیم:

دیوبند میں یومیہ ۶ رگھنٹے تعلیم ہوتی ہے، ندوہ اور سلفیہ میں ۷ رگھنٹے تعلیم ہوتی ہے جب کہ اصلاح ،فلاح اور اشرفیہ میں روزانہ ۸ رگھنٹے تعلیم ہوتی ہے۔

### تعلیمی دورانیہ:

دیوبند اور اصلاح کا تعلیمی دورانیہ ۸ ربرسوں پر مشتمل ہے۔ سلفیہ ۱۰ ربرسوں پر اور ندوہ، فلاح اور اشرفیہ کا ۱۱ ربرسوں پر مشتمل ہے۔

اس طرح دیوبند پورے تعلیمی دورانیہ میں ۹۶۰۰ گھنٹیاں پڑھاتا ہے تو اشرفیہ ۱۷۶۰۰ گھنٹیاں پڑھاتا ہے جو دیوبند سے ۴۵فی صد زیادہ ہے۔ جب کہ دونوں اداروں کی ڈگری کا نام و مرتبہ ایک ہی ہے۔

اسی طرح اگر ان مدارس میں تدریس قرآن کے لیے مخصوص اوقات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ اپنے پورے نظام الاوقات کا اشرفیہ نے 7%، فلاح نے 8%، ندوہ نے 8.44%، سلفیہ نے 10%، اصلاح نے 14% اور دیوبند نے 14.58% وقت تدریس قرآن کے لیے مخصوص کیا ہے۔ گویا تعلیمی مراحل، یومیہ نظام الاوقات اور تدریس قرآن کے لیے مخصوص اوقات کسی کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے جب کہ تعلیمی نظام میں ان باتوں کی بہت اہمیت ہے اور ان ہی چیزوں کو چست و درست کر کے نصاب کو مؤثر و مفید بنایا جا سکتا ہے۔

## تدریس قرآن کے لیے مخصوص مواد:

اوپر یہ وضاحت گزری ہے کہ عالم دین بنانے کے لیے قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کم از کم تین پہلو سے ضروری ہے۔ ترتیل، تحفیظ اور تفہیم، زیر بحث مدارس کے نصاب میں اس پہلو سے بھی حیرتناک تفاوت پایا جاتا ہے۔ سب کا الگ الگ تجزیہ پیش خدمت ہے۔

## ترتیل:

دیوبند نے ابتدائی دو تعلیمی برسوں میں یومیہ ایک گھنٹی ترتیل و تجوید کے لیے مخصوص کی ہے، اس کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی اس کی تعلیم اور امتحان کا نظم ہے۔ اس طرح تعلیم قرآن کے لیے مخصوص اوقات کا 28.5% فی صد حصہ وہ اس پہلو پر صرف کرتا ہے۔ ندوہ نے ثانوی درجات کی دو کلاسوں میں یومیہ ایک گھنٹی تجوید و تحفیظ کے لیے مخصوص کی ہے اور اس میں حدر کی مشق و ضروری قواعد پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح

سے تعلیم قرآن کے مخصوص اوقات کا 15% حصہ ترتیل وتجوید کے لیے مخصوص کیا ہے۔

الاصلاح کے نصاب تعلیم میں تجوید وترتیل کا کوئی ذکر نہیں ہے البتہ تجوید وترتیل کی تعلیم کا نظم ہے مگر اس کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا امتحان ہوتا ہے۔

جامعۃ الفلاح اور جامعہ اشرفیہ کے نصاب تعلیم میں قرآن کے ضمن میں تجوید و ترتیل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

جامعہ سلفیہ میں خارجی اوقات میں ترتیل کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے نمبرات شمار کیے جاتے ہیں۔

تعلیم قرآن کا پہلا زینہ ترتیل وتجوید ہے۔ اس پہلو سے دیوبند نے تعلیم قرآن کے مخصوص اوقات کا 28% حصہ خرچ کر کے طلبہ کے اندر کافی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ندوہ نے 15% فی صد وقت لگا کر واجبی معلومات بہم پہنچانے کی سعی کی ہے۔ اصلاح نے اس کا غیر رسمی نظم کیا ہے۔ سلفیہ میں خارجی اوقات میں نظم ہے، فلاح اور اشرفیہ کے نصاب میں اس کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔

## تحفیظ:

دیوبند کے نصاب میں تحفیظ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

ندوہ ثانوی کے ابتدائی درجات میں تحفیظ کا اہتمام کرتا ہے۔

اصلاح میں دوران عالمیت تحفیظ کا کوئی نظم نہیں ہے۔

فلاح کے نصاب میں اس کا کافی اہتمام ہے۔ تفہیم قرآن کے ساتھ ہر کلاس میں کچھ سورتیں یا اجزاء بھی تحفیظ کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ کے نصاب میں تحفیظ کا تذکرہ نہیں ہے۔

جامعہ سلفیہ کے متوسطہ وثانویہ کے درجات میں ۲۹ویں اور ۳۰ویں پارہ کا حفظ کرایا جاتا ہے۔

اس طرح دیو بند، اصلاح اور اشرفیہ کے نصاب میں تحفیظ کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ندوہ اور سلفیہ نے ثانوی درجات میں اس کے لیے گنجائش نکالی ہے۔ جب کہ جامعۃ الفلاح نے تفہیم قرآن کے ساتھ ساتھ تحفیظ قرآن کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا ہے۔

تفہیم:

تفہیم قرآن کا ہی مرحلہ اصل مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ مختلف نصابوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ تفہیم کے طریقہ اور ذرائع و وسائل کے ضمن میں ہر مدرسہ کا تصور الگ الگ ہے۔

دیو بند:

نحوی وصرفی مشکلات کے حل کے ساتھ پورے قرآن مجید کا ایک مرتبہ ترجمہ کرانے پر اکتفا کرتا ہے، نیز درجہ ششم میں یومیہ ۲ گھنٹیاں مخصوص کر کے جلالین شریف کی تدریس کا اہتمام کرتا ہے۔

اصول تفسیر کے ضمن میں اصول فقہ کے ساتھ الفوز الکبیر بھی پڑھائی جاتی ہے۔

ندوہ:

ندوہ کے عالمیت کے درجات میں پورے قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا اہتمام کیا جاتا ہے ہر کلاس میں ایک، دو یا دو سے زائد معیاری ومعتبر تفسیر کی کتابیں Recommend کی گئی ہیں۔

اصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھائی جاتی ہے۔

تخصص فی الشریعہ میں جن طلبا کا مادہ اختصاص تفسیر ہوتا ہے۔ ان کے لیے ڈیڑھ گھنٹیاں یومیہ تفسیر وعلوم القرآن کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ باقی طلبہ کے لیے دیگر دینی، و ادبی وتاریخی مضامین کا نظم ہے، مگر قرآن مجید کے لیے کوئی وقت فارغ نہیں کیا گیا ہے۔

## الاصلاح:

مدرسۃ الاصلاح کا نظریہ تعلیم ہی جداگانہ ہے۔ اس نے تعلیم قرآن کو اپنے نظام تعلیم کا مرکز ومحور قرار دیا ہے۔ یہاں پورے قرآن کی عالمانہ ومحققانہ تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے نصاب میں کوئی تفسیر مرجع کے طور پر Recommend نہیں کی گئی ہے۔ یہاں استاذ امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق براہ راست متن قرآن پر غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے اور دوران تدبر جس طرح کے مآخذ کی ضرورت ہوتی ہے ان کی جانب رجوع کر کے مشکلات میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ اساتذہ کرام اپنے وسیع وعمیق مطالعے کا نچوڑ درس میں پیش کرتے ہیں اور طلباء کی مآخذ کی جانب رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ امام فراہی کے رسائل مفردات القرآن اور اسالیب القرآن بھی شامل نصاب ہیں۔

## الفلاح:

جامعۃ الفلاح کے نظریہ تعلیم میں الاصلاح کا انعکاس پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی عالمیت وفضیلت کے درجات میں ایک مرتبہ پورا قرآن مجید اسی طرز پر پڑھانے کا اہتمام ہے جیسا کہ مدرسۃ الاصلاح میں ہے۔

اصول تفسیر کے ضمن میں مقدمۃ التفسیر لابن تیمیہ اور مقدمہ نظام القرآن للفراہی شامل نصاب ہے۔ جامعۃ الفلاح نے فضیلت کے نصاب میں تین گھنٹیاں یومیہ خصوصی مضامین کے لیے خاص کی ہیں۔ جن طلبہ کا خصوصی مضمون قرآن وعلوم قرآن ہوتا ہے۔ ان کے لیے تفسیر، اصول تفسیر، علوم القرآن، مناہج تفسیر، احکام القرآن، اعجاز القرآن، غرائب القرآن، تاریخ القرآن جیسے مضامین پر مشتمل ایک جامع ومتوازن نصاب ترتیب دیا گیا ہے جس سے طلبا کو قرآنیات کا خاطر خواہ علم حاصل ہوجاتا ہے۔

## اشرفیہ:

اشرفیہ کے عالمیت کے درجات میں پورا قرآن مجید ترجمہ وتفسیر کے ساتھ

پڑھانے کا اہتمام ہے۔ متن قرآن کے ضمن میں سورۃ الفاتحہ کا ذکر نہیں ہے مگر گمان غالب ہے کہ یہ سورہ بھی شامل نصاب ہوگی۔ مرجع کے طور پر ہر کلاس میں دو یا دو سے زائد معیاری و معتبر تفاسیر Recommend کی گئی ہیں۔

اصول تفسیر میں الفوز الکبیر والاتقان فی علوم القرآن کے منتخب مباحث شامل نصاب ہیں۔ فضیلت کے سال اول میں الکشاف سے البقرہ، آل عمران اور المائدہ نیز باقلانی کی اعجاز القرآن پڑھائی جاتی ہے اور سال دوم میں احکامی آیات کا کتب فقہ کی معیاری کتابوں کے حوالہ سے درس ہوتا ہے۔

سلفیہ:

سلفیہ کے عالمیت وفضیلت کے درجات میں پورا قرآن مجید ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور یہاں ہر کلاس میں ایک تفسیر بطور مرجع Recommend کی گئی ہے۔ اصول تفسیر کے لیے کوئی کتاب یا مواد شامل نہیں ہے۔

تجزیہ:

تفہیم قرآن کے مقصد سے جو مواد جس طرح مدارس کے نصاب میں شامل ہے، اس کا ایک جائزہ پیش کیا گیا۔ واضح طور پر اس میں کئی امور قابل توجہ ہیں ۔ دیو بند تفہیم قرآن کے نام پر صرف ترجمہ قرآن پر اکتفا کرتا ہے اور تفسیر کے نام پر جلالین پڑھا تا ہے۔ قرآنی علوم پر نظر رکھنے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عالم دین بننے کے لیے رواں ترجمہ کر لینا قطعاً کافی نہیں ہے۔ اسی طرح تفسیر جلالین اپنی کیفیت وکمیت کے لحاظ پر تفسیر قرآن کی کسی ضرورت کی تکمیل نہیں کرتی۔

ندوہ ، اشرفیہ اور سلفیہ چند قدیم تفاسیر کی روشنی میں ترجمہ وتفسیر پڑھانے کا اہتمام کرتے ہیں ۔ ان میں بیش تر تفاسیر ضخیم اور قدیم ہیں ۔ حجم کے لحاظ سے ان سے استفادہ مشکل اور قدیم ہونے کی وجہ سے ان سے معاصر تقاضوں کی تکمیل کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ اس کے علاوہ جتنا مختصر وقت تدریس قرآن کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اس میں

ان عظیم القدر مراجع کا خلاصہ پیش کرنا بھی ممکن نہیں، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ نصاب نامکمل رہ جاتا ہوگا۔ یا تفہیم کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو پاتا ہوگا۔

اصلاح اور فلاح پر براہ راست غور وتدبر کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کی افادیت اپنی جگہ پر مگر اس طریقہ تدریس میں مواد کے انتخاب کا تمام تر انحصار استاد کے ذوق ومزاج پر ہے، اگر استاد کے پاس مطالعہ کے لیے کافی فرصت ہو، اسے تحقیق ومطالعہ کا اچھا ذوق ہو اور وہ احساس ذمہ داری سے سرشار ہو تو بلا شبہ تدریس کا حق ادا کرسکتا ہے، بصورت دیگر اس بات کا امکان ہے کہ استاد کسی ایک کتاب پر تکیہ کرلے یا محض اپنے ذوق سے کچھ تشریحات پیش کر کے تدریس قرآن کے فریضہ سے سبکدوش ہو جائے۔

اسی طرح ان تمام نصابات میں ایک قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ اس میں تفسیر، اصول تفسیر اور علوم قرآن کی تدریس کے لیے دیگر معاون علوم پر بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ دیوبند اور ندوہ میں الفوز الکبیر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اشرفیہ میں الفوز الکبیر کے ساتھ الاتقان کے منتخب مباحث بھی پڑھائے جاتے ہیں، اصلاح پر مولانا فراہی کے دو رسائل مفردات القرآن اور اسالیب القرآن پڑھائے جاتے ہیں (جن کا اصول تفسیر سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے) اور جامعۃ الفلاح میں مقدمہ ابن تیمیہ اور مقدمہ نظام القرآن پڑھائے جاتے ہیں۔

ان کتابوں کا اگر الگ الگ تجزیہ کیا جائے تو ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جو تفہیم قرآن کے اصول، آداب اور دیگر ضروری جہات کا احاطہ کرتی ہوں۔ اصول تفسیر و علوم القرآن کی طرف بھرپور توجہ کے بغیر تفہیم قرآن کے محاذ پر کسی خاطر خواہ پیش رفت کی امید نہیں کی جاسکتی۔

اسی طرح ایک بہت زیادہ قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ اس نصاب تدریس میں قرآن مجید کو ایک زندہ جاوید کتاب اور مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پڑھانے کا تصور بہت دھندلا ہے، قرآنی احکام وتعلیمات اور معاصر ضروریات اور چیلنجز کا اطمینان بخش جواب فراہم کرنے کے لیے بظاہر نصابات میں کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی ہے۔ جو مدارس

محض قدیم مراجع پر اکتفا کرتے ہیں ان کے یہاں تو اس کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے۔

## اصلاح احوال کے لیے تجاویز:

دینی مدارس میں کم از کم قرآنی تعلیم کا نظام ونصاب مثالی ہونا چاہیے، اس تجزیہ سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اسے اچھی مثال نہیں کہا جاسکتا، ارباب مدارس و اصحاب علم ودانش کو چاہیے کہ اس صورت حال پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں اور اسے مثالی بنانے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ اصلاح احوال کے لیے چند تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ اسلام اور اسلامی علوم کے سیاق میں قرآن اور تفسیر قرآن کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن اس اساسی اہمیت کا انعکاس ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں پوری طرح نظر نہیں آتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی علوم میں قرآن اور تفسیر قرآن کا جو مقام ومرتبہ ہے اور اس کی تدریس کے جو بنیادی تقاضے ہیں ان کا صحیح طور پر ادراک کیا جائے اور نصاب تعلیم میں اس کا وہ مقام دیا جائے جو اس کا حق ہے۔

۲۔ جس طرح حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں ۲ بار یا ۳ بار پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کو کم از کم دو بار پورا پڑھایا جانا چاہیے۔ ایک بار سرسری طور پر ترجمہ اور ضروری تشریحات کے ساتھ اور دوسری بار عالمانہ ومحققانہ طرز پر جدید وقدیم حوالوں کے ساتھ تدریس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ دوسری بار میں اگر پورے قرآن مجید کے لیے سبقاً سبقاً تدریس کی گنجائش نہ ہو تو منتخب سورتیں یا اجزاء کی اس طرح تعلیم ہو کہ طلبا کے اندر بقیہ مواد خود سے پڑھنے کا سلیقہ وشعور پیدا ہو جائے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں نصاب سازی کے اصول اور طریقہ سے استفادہ کیا جائے۔ اساتذہ اور ماہرین کی جماعت منتخب اجزاء کے محتویات طے کریں اور ان کے لیے موزوں مآخذ کی نشاندہی کریں اور اساتذہ کرام اس کی روشنی میں درس دیں۔

۳۔ تدریس قرآن کے جو ہمہ جہتی تقاضے ہیں، ان کو نظر انداز کرنا نقصان دہ ہے، ترتیل، تحفیظ اور تفہیم کی تدریس میں جو توازن درکار ہے، ان نصاب ہائے تعلیم میں بظاہر

اس کا فقدان نظر آتا ہے۔اس میں توازن لانے کی از حد ضرورت ہے۔

۴۔ قدیم مستند تفاسیر کے حوالہ کے ساتھ معاصر تفاسیر سے استفادہ ناگزیر ہے۔ تاریخی مقامات، تاریخی شخصیات، سائنسی اکتشافات اور جدید تہذیبی چیلنجوں کا جواب معاصر تفاسیر وتحقیقات میں ہی مل سکتا ہے۔

۵۔ اصول تفسیر وعلوم قرآن کی جانب توجہ بہت کم ہے۔ جب کہ تفہیم کا شعور پیدا کرنے کے لیے ان علوم کی تدریس بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ نصاب تعلیم میں اس کے لیے مزید وقت فارغ کرنے کی ضرورت ہے۔اسی طرح نصاب تعلیم میں تاریخ قرآن کا کوئی ذکر نہیں حالاں کہ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ مدارس کے فارغین کو تاریخ قرآن کے بنیادی مباحث سے پوری آگاہی ہو، مستشرقین اور اسلام دشمن محققین کی طرف سے قرآن پر تنقید و اعتراض کا محور بالعموم تاریخ قرآن ہی ہے۔اس لیے تاریخ قرآن سے پوری واقفیت کے بغیر نہ توان اعتراضات کا جواب دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس عظیم الشان خدمت سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے جو حفاظت قرآنی کے سلسلہ میں امت نے انجام دی ہے۔

۶۔ نصاب کی تدوین وتشکیل ایک مستقل علم ہے۔ اس علم کے ماہرین مضمون کی ہیئت ،طلبہ کی نفسیات، زمانہ کی ضروریات اور نصاب کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔اب تک دینی مدارس کے نظام میں اس علم کو مناسب اہمیت نہیں دی جاسکی ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس علم نے تعلیمی نظام میں عظیم انقلاب برپا کردیا ہے اور عہد جدید کے غیر معمولی علمی اکتسابات بہت حد تک اس فن کے مرہون منت ہیں۔

ارباب مدارس کو چاہیے کہ الحکمة ضالة المومن کے تحت اپنے نظام و نصاب کو چست ودرست کرنے کے لیے جہاں سے مفید مشورہ مل سکے، اسے حاصل کرنے میں دریغ نہ کریں۔ اگر یہ مدارس انیسویں اور بیسویں صدی میں مروج نظام ونصاب کو ہی حرز جاں بنائے رہے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ اس نظام ونصاب کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے طلبہ اور علماء اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ امت کے مستقبل کے لیے اس کے نتائج کی سنگینی کا ادراک بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

# دینیات فیکلٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قرآنی خدمات

محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کریم سرچشمہ ایمان اور علوم اسلامیہ کی جان ہے، اسی لیے ہر دور میں دینی علوم کی تدریس میں اسے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فیکلٹی دینیات میں بھی قرآن کی تعلیم وتدریس کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، یونیورسٹی کے قیام کے وقت ہی سے قرآن کریم کی تدریس یہاں کی تدریسی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر شامل رہی ہے، یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں نے روز اول سے قرآن کریم کے درس کے ذریعہ طلباء کے دل ودماغ کو منور کرنے اور معارف قرآنی سے ان کو بہرہ ور کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس اہم کام کے لیے انہوں نے مشہور عالم دین مولانا شبلی نعمانیؒ (م۱۹۱۴ء) کو مامور کیا تھا۔ ایک موقع پر جب مولانا شبلی نعمانی نے اس ذمہ داری سے سبک دوش کیے جانے کی درخواست کی تو سرسید نے اسے منظور نہ کیا اور درس قرآن کی ذمہ داری ان سے بدستور وابستہ رہی۔[1]

علامہ شبلی نعمانی کے بعد درسِ قرآن کی یہ ذمہ داری پہلے ناظمِ دینیات مولانا عبداللہ انصاری (م۱۹۲۵ء) خویش مولانا قاسم نانوتوی بانیِ دار العلوم دیوبند کے سپرد کی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں مولانا عبداللہ انصاری کا بحیثیت ناظم دینیات تقرر ہوا، ان کا محمڈن کالج کی تعلیمی اور دینی فضا کو استوار کرنے میں نمایاں مقام تھا۔ سید افتخار عالم مارہروی نے ان کی علمی وروحانی شخصیت کا تذکرہ کرنے کے ساتھ لکھا ہے:

"ہر جمعہ کے عام وعظ وپند کے علاوہ جناب مولانا صاحب طلباء مدرسۃ العلوم کو اسٹریچی ہال کے عظیم الشان کمرہ میں روزانہ بلاناغہ

مدرسہ کے اوقات سے قبل کلام مجید کی تفسیر پڑھاتے ہیں جہاں کہ تمام اسکول اور کالج کے طلباء پیشتر سے جمع رہتے ہیں، ان مسلمان طالب علموں میں وہ دونوں مشہور فرقے شامل رہتے ہیں جو سنّی اور شیعہ کے نام سے معروف ہیں''۲

۱۹۲۰ء تک مولانا عبداللہ انصاری نے کالج کی دینی و تعلیمی خدمت انجام دی۳۔

مولانا عبداللہ انصاری کے بعد درس قرآن کی ذمہ داری مولانا سلیمان اشرف پھلواری (م۱۹۳۹ء) نے سنبھالی، ان کے درس میں قرآن سے دلچسپی رکھنے والے طلباء اور دیگر حضرات شریک ہوتے، ان کا درسِ قرآن بعد نمازِ عصر ہوتا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوا کرتے تھے''۴

یہ درسِ قرآن اس نصابی تعلیم سے الگ تھا جس کی پابندی طلباء پر لازم تھی۔ محمڈن کالج میں سنّی اور شیعہ طلباء کی مذہبی تعلیم کا نصاب اور انتظام طے کرنے کے لیے دو الگ الگ کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، سنّی طلباء کی مذہبی تعلیم کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کا نام ''مدبران تعلیم مذہب اہل سنّت و جماعت'' تھا جب کہ شیعہ طلباء کی مذہبی تعلیم کے لیے نصاب کمیٹی کا نام ''کمیٹی مدبران تعلیم مذہب شیعہ اثناعشریہ'' تھا۔ شیعہ کمیٹی میں ۱۳ علماء اور سنّی کمیٹی میں ۱۴ علماء شامل کئے گئے تھے، ان دونوں کمیٹیوں کی ذمہ داریوں میں یہ شامل تھا کہ:

''جن طالب علموں نے قرآن مجید نہیں پڑھا ہے ان کو قرآن مجید پڑھوانے اور اس کے لیے خاص فنڈ جمع کرنے کی تدبیر کرنا''۵

کالج کے دستور کی دفعہ ۱۷۰ میں طلباء پر لازم کیا گیا تھا کہ کل مسلمان بورڈروں کو پنجگانہ نماز ادا کرنا اور رمضان میں بجز حالتِ عذرِ معقول کے روزوں کا رکھنا اور جن بورڈروں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوا ہو، ان کو مقررہ گھنٹوں میں قرآن مجید

پڑھنا لازم ہوگا۔[۶]

۱۹۲۰ء میں محمڈن کالج کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا، اس کے بعد سے دینیات گریجویشن کی سطح تک لازمی جزو نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی، بلکہ اب بھی پڑھائی جاتی ہے، اس نصاب دینیات میں قرآن کی تعلیم، قرآن کے تعارف اور قرآن سے متعلق ضروری معلومات کو ہمیشہ شامل رکھا گیا، تاکہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے عام طلباء کی ذہنی تعمیر میں قرآن بنیاد کی اینٹ کی طرح شامل رہے۔

جب دینیات کی تعلیم کے لئے مستقل فیکلٹی وجود میں آ گئی تو خاص دینیات میں گریجویشن (بی ٹی ایچ) اور پوسٹ گریجویشن (ایم ٹی ایچ) کے کورس کھولے گئے، اور ان دونوں کے نصاب تدریس میں قرآن مجید کے ترجمہ، تفسیر اور علوم قرآنی کو کلیدی حیثیت دی گئی اور پہلا پرچہ ترجمہ وتفسیر قرآن ہی کا رکھا گیا۔

قرآن کی سورتوں اور قرآنیات پر تفسیروں اور کتابوں کے انتخاب میں توحسبِ ضرورت وحالت تنوع ہوتا رہا لیکن مرکزی حیثیت سے قرآن کی تعلیم کو مزید بہتر بنانے کی کوشش جاری رہی۔

چنانچہ آج بھی بی ٹی ایچ کی سطح پر قرآن کریم کی ۱۴سورتوں کے ترجمے دونوں سالوں میں طلباء کو پڑھائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی تاریخ القرآن و تدوین قرآن پر ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

ایم ٹی ایچ کے دوسالہ کورس میں قرآن کریم کی سورہ یونس اور بعد کی ۱۳منتخب سورتوں کی تفسیر متداول تفسیروں کی مدد سے پڑھائی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ نظمِ قرآن، اقسام القرآن، قصص القرآن اور حکمۃ القرآن پر تفصیلی مطالعہ کرایا جاتا ہے۔

۱۹۸۵ء تک ایم ٹی ایچ ایک سالہ کورس تھا اس لیے صرف قرآنی سورتوں کی تفسیر پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۸۶ء سے جب یہ دوسالہ کورس بنا تو مذکورہ علوم القرآن کو بھی شاملِ نصاب کیا گیا۔ اس طرح دینیات میں قرآن کریم کی تدریس کو مؤثر بنانے کی تدبیر کی گئی، اس سے طلباء میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرنے اور قرآن کی تفسیر کا معقول منہج

اختیار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دینیات فیکلٹی میں ۱۹۶۰ء کے بعد تدریس کے ساتھ ریسرچ و تحقیق کی سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں اور ان تحقیقی سرگرمیوں میں قرآنی موضوعات پر بحث و تحقیق کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ ریسرچ کے طلباء کے لیے ایسے موضوعات اور عنوانات منتخب کیے گئے جن کا تعلق اسلامی علوم وفنون سے بالعموم اور قرآنی موضوعات سے بالخصوص تھا، فیکلٹی میں اب تک جن قرآنی موضوعات پر ریسرچ کرائی گئی ہے ان کی تعداد تیس ہے اور جن طلباء کو ان کے کام کے مکمل اور قابلِ اطمینان ہونے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے، ان کی تعداد سولہ ہے۔ ذیل میں ان کی فہرست دی جاتی ہے:

| نمبر شمار | عنوان | اسکالر | سنہ داخلہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | قرآنک لائن آف ریزننگ | ام ہانی فخر الزماں | ۱۹۶۸ء |
| ۲ | تفسیر بیان القرآن کا تنقیدی مطالعہ | ریحانہ ضیا | ۱۹۷۳ء |
| ۳ | بھگوت گیتا اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ | امام مرتضیٰ ہاشمی | ۱۹۷۳ء |
| ۴ | قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور ان کی تفسیر مظہری کا مطالعہ | رضوان الدین | ۱۹۷۶ء |
| ۵ | عبرانی انبیاء کے بارے میں بائبل اور قرآن کے بیانات اور ان کا مسلمانوں پر اثر | عبدالخالق | ۱۹۷۹ء |
| ۶ | دوسری اور تیسری صدی میں قرآن کے حالات | جلال الدین | ۱۹۸۳ء |
| ۷ | بایولوجیکل ٹیچنگ آف ہولی قرآن | رضیہ خاتون | ۱۹۸۲ء |
| ۸ | قرآن مجید کا نزول اور عوام کے عقائد | نسیم زہرہ | ۱۹۸۳ء |
| ۹ | شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بحیثیت ایک مفسر قرآن | محمد سعود عالم قاسمی | ۱۹۹۱ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۰ | عقائد، عبادات اور اعمال کی تقسیم قرآن پاک اور سیرت نبوی کی روشنی میں | قیصر جہاں ہاشمی | ۱۹۹۱ء |
| ۱۱ | تفسیر طبری کے ماٰخذ کا تنقیدی مطالعہ | محمد شعیب ندوی | ۱۹۹۰ء |
| ۱۲ | ابی ابن کعب واقوالہ فی التفسیر | محمد راشد | ۱۹۹۱ء |
| ۱۳ | تفسیر بالماثور اور اس کے مفسرین | احسان اللہ فہد | ۱۹۹۶ء |
| ۱۴ | الازواج المطہرات واقوالھن فی التفسیر | شکیل احمد | ۱۹۹۶ء |
| ۱۵ | المقارنۃ بین امثال القرآن والامثال الاخریٰ فی الادب العربی | محمد لقمان حسین | ۱۹۹۶ء |
| ۱۶ | آٹھویں صدی ہجری کے عربی مفسرین | ایوب اکرم | ۱۹۹۷ء |

تدریس اور رہنمائی تحقیق کے ساتھ دینیات فیکلٹی کے اساتذہ نے خود اپنی تصنیف و تالیف کی بھی ایک معقول تعداد فراہم کی ہے۔ ان تصانیف میں قرآنیات کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے چنانچہ جو کتابیں فیکلٹی کے اساتذہ نے قرآنیات سے متعلق رقم کی ہیں ان کا خلاصہ اس طرح ہے۔

۱- مولانا عبد اللطیف رحمانی صدر شعبہ سنّی دینیات نے تاریخ القرآن کے نام سے ایک اہم کتاب رقم کی ہے، جس میں قرآن کریم کے نزول، کتابت، کاتبین جمع وتدوین وغیرہ کی تاریخ معتبر ماٰخذ سے بیان کی ہے۔ یہ کتاب مولانا زید فاروقی نے دہلی سے شائع کی ہے۸۔

۲- مولانا سید علی نقی النقوی (م ۱۹۸۹ء) اپنی علمی لیاقت اور وضع داری میں علماء اہلِ تشیع کے علاوہ اہلِ سنّت کے حلقہ میں بھی معروف تھے۔ وہ شعبہ شیعہ دینیات کے صدر اور فیکلٹی دینیات کے ڈین بھی رہے، انہوں نے تفسیر قرآن کے نام سے اردو زبان میں قرآن پاک کی ایک مکمل، مفصل اور مبسوط تفسیر لکھی ہے، اس میں انہوں نے قرآنی آیات کی توضیح قرآن و احادیث، اقوال ائمہ، لغت اور علوم اسلامیہ کے حوالے سے کی ہے، استدلال و استشہاد کے لیے توریت و انجیل کے حوالے بھی درج کیے ہیں اور شیعہ و سنّی

دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا ہے، روایات نقل کرنے کے ساتھ عقلی اور منطقی استدلال سے بھی کام لیا ہے۔ ہندوستان کے علماء اہلِ تشیع میں غالبًا اس سے بہتر تفسیر نہیں لکھی گئی، یہ تفسیر غلام محمد بٹ، ثمر بک، کشمیری نے ۱۹۸۲ء میں شائع کی تھی۔

مولانا سید علی النقوی نے قرآن کریم کی مفصل تفسیر کے علاوہ مقدمہ تفسیر قرآن بھی لکھا ہے جو الگ سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کے نو ابواب بعنوان تبصرہ ہیں۔ ان میں قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنی، کلامِ الٰہی اور صفات الٰہی، نزولِ قرآن کی تاریخ، اعجاز قرآنی، قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات، جمع و تدوین قرآن، نفی تحریف، قراء سبعہ، فہم قرآن کے مسائل، تفسیر و اصول تفسیر، محکم و متشابہ، تاویل، معجزہ قرآن جیسے موضوعات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب ادارہ معارف القرآن، لکھنؤ سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔

مولانا سید علی نے تحریف قرآن کی حقیقت کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اس میں انہوں نے علماء اہل سنت و اہل تشیع کے معتبر مآخذ و اقوال کے حوالہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ قرآن آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔

۳- مولانا پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (م ۱۹۸۵ء) علماء اور دانشوروں کی صف میں محتاج تعارف نہ تھے، ماہنامہ برہان دہلی کے مرتب، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے عربی کے مدرس اور متعدد یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فیکلٹی دینیات کے ڈین اور صدر شعبہ سنّی دینیات کی حیثیت سے ان کی خدمات معروف ہیں۹۔ ان کی کتابوں میں صدیق اکبر، عثمان ذی النورین وغیرہ کے ساتھ وحی الٰہی اور فہم قرآن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

وحی الٰہی میں انہوں نے تفصیل سے وحی کے تصور، وحی کے ذرائع، وحی کی ضرورت، قطعیت، دینی اور اسلامی علوم میں اس کے مقام کو عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ جب کہ فہم قرآن میں انہوں نے قرآن کریم سے استفادہ کے طریقے، تفسیر کے لیے ناگزیر علوم کی معرفت اور قرآن میں فکر و تدبر کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں کتابیں قرآنیات کے طالب علموں کے لئے گرانقدر تحفہ ہیں۔ ندوۃ المصنفین دہلی

نے ان کو شائع کیا ہے۔

۴- فیکلٹی کے ایک اور استاد قاضی مظہر الدین بلگرامی (م ۱۹۹۴ء) نے جو صدر شعبہ سنّی دینیات اور ڈین بھی رہے، قرآنیات پر عیون العرفان فی علوم القرآن اور کنوز القر آن کے نام سے دو کتابیں رقم کیں۔ پہلی کتاب میں قرآن مجید کے جمع و تدوین، اسباب نزول اور محکم و متشابہ سے متعلق تفصیلی بحث ملتی ہے، یہ کتاب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی کی تقاریظ کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔

دوسری کتاب کنوز القرآن میں قرآن پاک کی آیات کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کر کے ان کا اردو اور انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ برہان دہلی سے ۱۹۶۱ء میں مولانا اکبرآبادی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۵- فیکلٹی کے معروف استاد پروفیسر فضل الرحمان گنوری، سابق صدر شعبہ دینیات و ڈین، نے علامہ جاراللہ زمخشری کی مشہور زمانہ تفسیر ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل'' پر ایک مبسوط کتاب رقم کی جس کا نام ہے ''زمخشری کی الکشاف۔ ایک تحلیلی جائزہ'' یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں فیکلٹی دینیات سے شائع ہوئی تھی۔ الکشاف کے تنقیدی مطالعہ پر اردو میں یہ پہلی مفصل کتاب ہے جس میں مصنف نے زمخشری کے حالات و تصانیف، بالخصوص الکشاف میں معتزلہ کے خیالات، اعجاز القرآن، تفسیری رجحانات، عقلی طرز فکر وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۶- فیکلٹی کے ایک اور معروف استاذ پروفیسر محمد تقی امینی (م ۱۹۹۱ء) سابق صدر شعبہ سنی دینیات و ڈین نے حکمت القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں حکمت کا مفہوم، قرآن میں حکمت کا استعمال، حکمت کے مدارج اور حکمت کے ثمرات و فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

مولانا محمد تقی امینی نے ہدایت القرآن کے نام سے قرآن پاک کی عام فہم تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی، جو ان کے پندرہ روزہ پرچہ احتساب میں اور لاہور سے نکلنے والے

رسالہ ''حکمت قرآن'' میں بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ مولانا تقی امینی نے سورۃ المائدۃ تک یہ تفسیر لکھی تھی کہ ۱۹۹۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور اس طرح یہ مفید سلسلہ منقطع ہوگیا۔

۷- شعبہ سنّی دینیات کے ایک اور استاذ راو عرفان احمد خاں صاحب نے جو بعد میں امریکہ منتقل ہوگئے ''ان سائٹ ان دی ہولی قرآن'' کے نام سے قرآن کریم کی انگریزی میں تفسیر لکھی ہے، سورہ بقرہ کا حصہ راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے، یہ تفسیر انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔

۸- راقم الحروف نے بھی اس فیکلٹی میں تدریسی و انتظامی فرائض انجام دینے کے ساتھ قرآنیات پر حسب ذیل کتابیں رقم کی ہیں۔

(۱) شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کا مطالعہ۔ اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات زندگی اور تصانیف کے تذکرہ کے ساتھ قرآنیات پر ان کی تصانیف کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے فارسی ترجمہ قرآن فتح الرحمان کا مفصل حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہے اور لاہور سے اسلامک اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

(۲) قرآن کی دعوتِ فکر۔ اس کتاب میں قرآن کی دعوتِ فکر، قرآن کریم میں قصص کی معنویت اور قرآن سرچشمہ ہدایت کے عنوان پر تین خطبات ہیں۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔

(۳) منہاج ترجمہ وتفسیر۔ اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کے ساتھ اردو کے ممتاز مترجمین قرآن اور قدیم و جدید مفسرین مثلاً امام ابن تیمیہ، سرسید احمد خان، مولانا فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی تفسیری کاوشوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کتاب منہاج تفسیر کے نام سے شائع ہوئی تھی اور اب منہاج ترجمہ وتفسیر کے نام سے فاران اکیڈمی، اقرأ کالونی، علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) مطالعۂ تفاسیرِ قرآن۔ اس کتاب میں عربی و فارسی اور اردو کی حسب ذیل تفاسیر تفسیر ابن کثیر، تفسیر نظم الدرر، تفسیر بحر مواج، تفسیر معدن الجواہر، تفسیر تجمیل التنزیل،

تفسیر تدبر قرآن اور ترجمان القرآن کا مفصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب دینیات فیکلٹی اے ایم یو سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۵) علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی۔ اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے مدرس قرآن اور معروف ادیب و اسکالر و سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی کا ان کی تحریروں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب فاران اکیڈمی، اقرأ کالونی، علی گڑھ سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۹) فیکلٹی کے ایک اور استاذ ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے قرآنیات کے تعلق سے حسب ذیل کتابیں لکھیں ہیں۔

قرآن اور مستشرقین، برطانوی مطالعہ قرآن، علماء سلف کی قرآن فہمی اور قرآن کا تصور جنگ و امن۔

قرآن کریم کی تدریس و تحقیق کے ساتھ قرآن کریم کی تجوید و قراءت پر بھی اس فیکلٹی نے شروع سے توجہ دی ہے، چنانچہ ایم او کالج میں طلباء کو قرآن کی تعلیم تجوید کے ساتھ دی جاتی تھی۔ تجوید و قراءت کے ممتحن باہر سے بلائے جاتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں جو لوگ ممتحن بن کر آئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا آزاد سبحانی وغیرہ شامل تھے[۱۱]۔

تجوید و قراءت کی تدریس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے بلکہ قدرے وسعت کے ساتھ جاری ہے۔ تجوید و قراءت کی دو سطحوں پر تدریس ہوتی ہے ایک سرٹیفکٹ اِن قراءت اور دوسری ڈپلوما اِن قراءت، ان دونوں کلاسوں میں طلباء کی بڑی تعداد داخلہ لیتی ہے، ان کلاسوں میں دیگر کورسوں کے ساتھ داخلہ مل جاتا ہے۔

تجوید و قراءت کی تدریس کے لئے ملک کے ممتاز قاری حضرات کو مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں قاری ضیاء الدین صاحب اور ان کے بعد قاری نیاز احمد صاحب یہ فریضہ انجام دیتے رہے اور ان کے بعد قاری سعید الاسلام اور قاری عتیق الرحمان صاحبان اس خدمت پر مامور ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف تجوید و قراءت کی تدریس کرتے ہیں بلکہ یونیورسٹی کے جلسوں، کانفرنسوں اور سیمناروں کے افتتاحی اجلاس میں قراءت کے لیے بلائے

جاتے ہیں اور اپنی قراءت سے حاضرین کو مسحور کرتے ہیں۔

فیکلٹی دینیات کے تحت نظامت سنّی دینیات کا محکمہ بھی ہے، جس کا مرکزی کام یونیورسٹی کے ہاسٹل اور احاطہ میں ۲۶ مساجد کا انتظام اور نماز کا اہتمام کرنا ہے۔ یونیورسٹی کی منتظمہ نے ۱۹۷۳ء میں ائمہَ مساجد کے فرائض میں نماز کی امامت کے علاوہ یہ بھی شامل کیا کہ وہ ان بچوں کو جو ناظرہ قرآن پڑھنا نہیں جانتے کو قرآن پڑھائیں اور قرآن پاک کا درس بھی دیا کریں۔ چنانچہ یونیورسٹی کی اہم مساجد میں اس کا اہتمام جاری ہے۔

۱۹۸۳ء میں وائس چانسلر سید حامد صاحب نے جامع مسجد میں حفظِ قرآن کے لیے ایک سرکلر جاری کیا، جس کے تحت نظامت کے تین قاری حضرات حفظ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے الگ سے مامور کیے گئے ہیں۔ حفظِ قرآن کی کلاسیں جامع مسجد میں صبح اور شام کے اوقات میں ہوتی ہیں۔

نظامت سنی دینیات قرآن سے مناسبت کا مجموعی ماحول پیدا کرنے کے لیے مقابلہَ قراءت اور تجوید وقراءت سیمنار کا اہتمام بھی کرتی رہی ہے۔ اس طرح کی ایک کانفرنس ۱۹۹۲ء میں منعقد ہوئی تھی جس کی روداد اور مقالات کی تفصیل مجلّہ دراسات دینیہ ۱۹۹۲ء کے خصوصی شمارہ ''قرآن کریم حرف وصوت'' میں شائع ہو چکی ہے۔

رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن پاک بالاستیعاب سنانے کا اہتمام یونیورسٹی کی ہر مسجد میں ہوتا ہے، بعض بڑی مساجد میں تراویح میں پڑھے گئے قرآن کا اردو ترجمہ اور خلاصہ بھی بیان کیا جاتا ہے تاکہ طلباء میں قرآن سے استفادہ اور تفہیم کا ذوق پیدا ہو۔ تراویح کی ان نمازوں میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

نئے تعلیمی سال سے قرآن مجید کے ترجمہ کی کلاسیں منتخب مساجد میں کھولی جارہی ہیں تاکہ طلبا قرآن کریم کا ترجمہ سیکھ سکیں اور قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ اللہ سے دعا ہے کہ قرآن کریم کے نور سے ہمارے دلوں اور یونیورسٹی کے ہاسٹلوں کو منور کردے۔

# حواشی ومراجع

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ' ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۷۲ء، ص ۱۶۷، نیز ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی، فاران اکیڈمی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۔

۲۔ سید افتخار عالم مارہروی، محمڈن کالج ہسٹری، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۱ء، ص ۱۲۵

۳۔ مولانا عبداللہ انصاریؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک کتاب مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے مرتب کی ہے جو اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز علی گڑھ کے زیر طبع ہے۔

۴۔ سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۲۱۸-۲۲۰، نیز دیکھئے صدر یار جنگ، ص ۲۷۲۔ مولانا سلیمان اشرف کے حالات کے لیے دیکھئے پروفیسر عبدالباری، نقوش وخطوط، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۸-۵۳

۵۔ محمڈن کالج ہسٹری، ص ۱۲۳

۶۔ قواعد وقوانین ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ، مطبع انسٹی ٹیوٹ کالج، علی گڑھ ۱۹۲۰ء، ص ۳۳

۷۔ دیکھئے نصاب تعلیم شعبہ سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۸۷-۱۹۸۶ء

۸۔ مولانا عبداللطیف رحمانی کے حالات وخدمات پر شعبہ سنّی دینیات اے ایم یو میں تحقیقی مقالہ لکھا جارہا ہے۔

۹۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی احوال وآثار، مطبوعہ شعبہ سنّی دینیات اے ایم یو، ۲۰۰۵ء

۱۰۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے: راقم کا مضمون 'مولانا تقی امینی' ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۲ء

۱۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون اے ایم یو میں دینیات کی تعلیم، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اپریل ۱۹۹۱ء

☆

# ادارہ ومجلّہ علوم القرآن اور قرآنی علوم کی اشاعت

ظفرالاسلام اصلاحی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری انسانیت کے لیے ہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دراصل یہی وہ کتاب عظیم ہے جو راہ مستقیم دکھاتی ہے اور اس پر چلنے والوں کو کامیابی کی بشارت دیتی ہے۔ بلا شبہ قرآن کریم کا نزول اللہ رب العزت کا اپنے بندوں پر بہت بڑا انعام و احسان ہے اور یہ کتاب مبین اس کی رحمت بے پایاں کا عظیم ترین مظہر ہے۔قرآن کریم کی متعدد آیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے خاص طور سے یہ بات قابل غور ہے کہ سورۂ رحمان میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے بہت سارے انعامات ذکر فرمائے ہیں ان میں اپنی رحمت کے ظہور کے طور پر سب سے پہلے تعلیم قرآن کا تذکرہ کیا ہے۔ الرحمن علم القرآن (الرحمٰن/۱-۲)، دوسرے اس کتاب کی عظمت اور اس کے باعث خیر ہونے پر یہ حدیث پاک بھی دال ہے: خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ (صحیح بخاری/کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم القرآن)۔ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان اور اس کی انتہائی قیمتی نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسے رہنما بنایا جائے، مختلف ذرائع سے اس کا معنی و مفہوم واضح کیا جائے اور اس کے علوم و معارف سے فیض یابی کو آسان بنایا جائے۔ اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ یہ نیک سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ اسی ضرورت و احساس کے تحت انجمن طلبہ قدیم مدرستہ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) کی علی گڑھ شاخ کی کوششوں سے ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ میں ادارہ علوم القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ یہ ادارہ جس مدرسہ کے فارغین کی کوششوں کا ثمرہ ہے اس کا امتیاز قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے۔ اس مدرسہ کی بنیاد ۱۹۰۸ء میں مولانا محمد شفیعؒ کے

ہاتھوں پڑی اور اسے بیسویں صدی کے نامور اسکالر اور ممتاز سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور اس کی توسیع و ترقی بالخصوص نظام تعلیم و تربیت کی تشکیل میں ان کے قریبی عزیز اور ماہر قرآنیات مولانا حمید الدین فراہی کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ حسن اتفاق کہ ادارہ علوم القرآن جس عظیم الشان یونیورسٹی کے نواح میں قائم ہوا ہے اس کے اولین مرحلہ یعنی ایم اے او کالج سے علامہ شبلی و مولانا فراہی دونوں بحیثیت استاد وابستہ رہے ہیں اور مؤخر الذکر نے اس کالج سے بی اے کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

ادارہ علوم القرآن کے قیام کا اولین عام مقصد یہ تھا کہ مدرستہ الاصلاح کے جو فارغین علی گڑھ میں تعلیم و تعلم یا دوسری کسی مصروفیت کے سلسلہ میں یہاں مقیم رہیں وہ اس ادارہ کے توسط سے مادر علمی سے اکتساب کردہ علم قرآن کو تازگی و وسعت دیتے رہیں، ہر معاملہ میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے سبق کو یاد کرتے رہیں اور زبان و قلم سے یہ سبق دوسروں کو بھی یاد دلاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ادارہ کچھ متعین مقاصد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لیے ادارہ کے بانیان نے اس کے کچھ بنیادی مقاصد متعین کیے اور وہ یہ ہیں:

☆ امت و انسانیت کو درپیش مسائل کا قرآنی حل۔
☆ جدید اسلوب میں قرآنی علوم و افکار کی اشاعت۔
☆ قرآن سے متعلق اہم موضوعات پر علمی و تحقیقی کام۔

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک تفصیلی پروگرام تشکیل دیا گیا اور اس میں خاص طور سے ان سرگرمیوں کو شامل کیا گیا:

☆ قرآنیات پر ایک ریفرنس لائبریری کا قیام
☆ قرآنی علوم و معارف کی اشاعت کے لیے ایک معیاری رسالہ کا اجراء
☆ قرآنیات پر علمی و تحقیقی کتب کی تالیف و اشاعت کا اہتمام
☆ قرآن سے متعلق اہم موضوعات پر خطبات و مذاکرات کا انعقاد
☆ قرآنیات پر مطالعہ و تحقیق کے لیے طلبہ کی تربیت و نگرانی

مذکورہ بالا کاموں میں تصنیفی و اشاعتی سرگرمیوں کو اولیت دی گئی اور بتوفیق الٰہی

اس کا آغاز جولائی ۱۹۸۵ء سے ششماہی علوم القرآن نامی اردو مجلّہ کے اجراء سے ہوا اور یہی ادارہ کا ترجمان قرار پایا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس مجلّہ کی اشاعت بفضلہٖ تعالیٰ بدستور جاری ہے اور اب تک اس کی ۱۸ جلدیں مکمل ہوچکی ہیں۔ ان میں چھ سو صفحات پر مشتمل اس کی خصوصی اشاعت (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر) بھی شامل ہے۔ اس مجلّہ کے مدیر ابتداءِ اجراء سے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی رہے ہیں۔ راقم السطور جنوری - جون ۱۹۸۹ء کے شمارے سے معاون مدیر کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی علوم کی اشاعت میں ادارہ کی اب تک کی خدمات کا سب سے بڑا و قابل قدر حصہ یہی مجلّہ ہے اور فی الحال یہی مجلّہ اس ادارہ کی شناخت ہے۔ علمی حلقوں میں ادارہ علوم القرآن کا جو کچھ تعارف ہوا ہے یا اسے جو مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ اسی مجلّہ کی بدولت ہے۔ اس لیے قرآنی علوم کی اشاعت کے نقطہ نظر سے اس کے مشتملات کا مفصل جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے قبل ادارہ کی دیگر سرگرمیوں کا مختصر ذکر برمحل ہوگا۔

## مطبوعات ادارہ علوم القرآن:

ادارہ علوم القرآن سے اب تک ٦ کتابیں شایع ہوچکی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ حقیقت نماز (مطبوعہ ۱۹۸۵ء/صفحات۔ ٦٠): مولانا امین احسن اصلاحی/تخریج و تحقیق مولانا سلطان احمد اصلاحی
(نماز کے موضوع پر مختصر لیکن نہایت قیمتی واہم کتاب)

۲۔ قرآنی مقالات (۱۹۹۱ء/صفحات۔ ۳۲۰)
(دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح کے ترجمان ''الاصلاح'' کے منتخب مقالات کا مجموعہ جو اصول تفسیر، نظم قرآن، اقسام القرآن، اور دوسرے اہم قرآنی مباحث پر مشتمل ہے)

۳۔ کتابیات فراہی (۱۹۹۱ء/صفحات۔ ۸۰) : مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
(مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی کی/پر مطبوعات (کتب ومضامین وتبصرے) کی جدید اصول کے مطابق تیار کردہ جامع ببلوگرافی)

۴۔ ششماہی علوم القرآن کی خصوصی اشاعت۔ مولانا امین احسن اصلاحی نمبر

(۲۰۰۰ء/صفحات۔۶۰۰): مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
(صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت وعلمی خدمات پر ۲۵ مقالات کا مجموعہ بشمول ذاتی احوال وکوائف پر مولانا اصلاحی سے ایک طویل انٹرویو، ان کے بعض قریبی اعزہ وتلامذہ کے تاثرات ومشاہدات اور ان کی مطبوعہ کتب اور ان پر مضامین کا اشاریہ)

۵۔ اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ (۲۰۰۵ء/صفحات۔۲۵۰): مرتبہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
(ہندو پاک کے ۳۳ معروف اردو رسائل میں شائع شدہ قرآنی مضامین کا موضوعاتی اشاریہ)

۶۔ اشاریہ ششماہی علوم القرآن (۱۹۸۵ء-۲۰۰۳ء) (مطبوعہ ۲۰۰۵ء/صفحات۔۵۴): مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
(مجلہ علوم القرآن کی ۱۸ جلدوں (۱۹۸۵-۲۰۰۳ء) کا جامع موضوعاتی اشاریہ)

## قرآنیات کی ریفرنس لائبریری:

قرآنیات پر کتب ورسائل کی تیاری واشاعت کے علاوہ ادارہ علوم القرآن مختلف زبانوں میں قرآنی علوم وافکار اور ماہرین قرآنیات پر قدیم و جدید کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی طالبان علمِ قرآن کو فراہم کررہا ہے اور اسی مقصد سے ادارہ علوم القرآن کے ساتھ ہی اس کی لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ درحقیقت کسی بھی علمی مرکز وادارہ کے لیے لائبریری وکتب خانہ رگِ جاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارہ علوم القرآن کے خادمین کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ ادارہ کی لائبریری قرآنیات کے ساتھ مختص ہو اور اسے قرآنی علوم سے متعلق کتابوں کا ایک ایسا مخزن بنایا جائے جس میں قرآن سے متعلق کسی بھی موضوع پر مطالعہ وتحقیق کے لیے مختلف زبانوں کی عمدہ معیاری کتابیں مہیا ہوں اور یہ قرآنیات پر ایک حوالہ (REFERENCE) لائبریری کا کام دے۔ شکر خدا کا کہ اس جہت میں کوششیں بارآور ہورہی ہیں۔

اس وقت ادارہ کی لائبریری میں علوم اسلامیہ بالخصوص قرآنیات پر عربی، اردو

(۲۰۰۰ء/صفحات۔۶۰۰): مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
(صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت وعلمی خدمات پر ۲۵ مقالات کا مجموعہ بشمول ذاتی احوال وکوائف پر مولانا اصلاحی سے ایک طویل انٹرویو، ان کے بعض قریبی اعزہ وتلامذہ کے تاثرات ومشاہدات اور ان کی مطبوعہ کتب اور ان پر مضامین کا اشاریہ)

۵۔ اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ (۲۰۰۵ء/صفحات۔۲۵۰): مرتبہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
(ہندو پاک کے ۳۳ معروف اردو رسائل میں شایع شدہ قرآنی مضامین کا موضوعاتی اشاریہ)

۶۔ اشاریہ ششماہی علوم القرآن (۱۹۸۵ء-۲۰۰۳ء) (مطبوعہ ۲۰۰۵ء/صفحات۔۵۴): مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
(مجلّہ علوم القرآن کی ۱۸ جلدوں (۱۹۸۵-۲۰۰۳ء) کا جامع موضوعاتی اشاریہ)

## قرآنیات کی ریفرنس لائبریری:

قرآنیات پر کتب ورسائل کی تیاری واشاعت کے علاوہ ادارہ علوم القرآن مختلف زبانوں میں قرآنی علوم وافکار اور ماہرین قرآنیات پر قدیم و جدید کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی طالبان علمِ قرآن کو فراہم کر رہا ہے اور اسی مقصد سے ادارہ علوم القرآن کے ساتھ ہی اس کی لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ درحقیقت کسی بھی علمی مرکز وادارہ کے لیے لائبریری وکتب خانہ رگِ جاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارہ علوم القرآن کے خادمین کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ ادارہ کی لائبریری قرآنیات کے ساتھ مختص ہو اور اسے قرآنی علوم سے متعلق کتابوں کا ایک ایسا مخزن بنایا جائے جس میں قرآن سے متعلق کسی بھی موضوع پر مطالعہ وتحقیق کے لیے مختلف زبانوں کی عمدہ معیاری کتابیں مہیا ہوں اور یہ قرآنیات پر ایک حوالہ (REFERENCE) لائبریری کا کام دے۔ شکر خدا کا کہ اس جہت میں کوششیں بارآور ہو رہی ہیں۔

اس وقت ادارہ کی لائبریری میں علوم اسلامیہ بالخصوص قرآنیات پر عربی، اردو د

انگریزی کتب ورسائل کا اچھا خاصا ذخیرہ دستیاب ہے۔ عربی وارد و کی بیشتر معروف تفاسیر اوران کے مولفین کی سوانح عمریاں، عربی، اردو و انگریزی میں قدیم و جدید تفاسیر کی کتابیات، دس زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم، قرآنی تراجم کی عالمی ببلوگرافی، قرآنی علوم وافکار وتعلیمات پر سینکڑوں کتب، حدیث پاک کے تمام متداول مجموعے اور سیرت نبویؑ پر بہترین ماخذ دستیاب ہیں۔ قرآنی آیات و الفاظِ حدیث کا اشاریہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو اسلامی انسائیکلو پیڈیا)، مجلہ نقوش کے قرآن ورسول نمبر، دائرہ حمیدیہ کے قدیم ترجمان ''الاصلاح'' کی فائلیں اور مولانا فراہی و مولانا اصلاحی پر پی ایچ ڈی مقالات کی کاپیاں اس لائبریری کے اہم ذخائر کا حصہ ہیں۔ مزید براں لائبریری میں مولانا حمید الدین فراہی و مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اوران پر اہم کتب، تحقیقی مقالات ومضامین کے لیے ایک گوشہ مخصوص ہے۔ لائبریری کے ذخیرہ میں ادارہ کی اپنی کتابوں کے علاوہ بعض اراکین ادارہ کی جانب سے عاریتاً وامانتاً دی گئی کتب بھی شامل ہیں جواس کے قیمتی ذخائر کا حصہ بن کر شائقین علم کو مستفیض کررہی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اردو، عربی وانگریزی کے معیاری رسائل ومجلات بھی اس لائبریری کا ایک قیمتی حصہ ہیں۔ یہ ہندو بیرونی ممالک سے مجلہ علوم القرآن کے تبادلے میں موصول ہوتے ہیں۔

## ششماہی علوم القرآن:

قرآنیات کے ساتھ اختصاص مجلہ علوم القرآن کی انفرادیت ہے۔ اداریہ سے لے کر خبرنامہ تک اس کا ہر کالم قرآن وقرآنی مطالعات کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کے حوالہ سے کسی اہم موضوع پر اداریہ، انسانی زندگی کے کسی پہلو یا مسئلہ سے متعلق قرآنی افکار وتعلیمات کی تشریح وترجمانی، قدیم وجدید مفسرین میں سے کسی کا مفصل تعارف یا ان کی تفسیری خدمات و منہج تفسیر کا تحقیقی مطالعہ، قرآنی کتب پر مفصل تجزیاتی تبصرے، قرآنیات پر اردو، عربی وانگریزی مطبوعات کے اشاریے، قدیم ومعاصر رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ اور قرآن وقرآنیات سے متعلق اہم ودلچسپ خبریں اس مجلہ کے مستقل مشتملات ہوتے ہیں۔ ششماہی علوم القرآن کے مقالات حواشی وحوالوں سے

مزین ہوتے ہیں۔ ہر شمارے میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا اعلیٰ تحقیقی معیار اور جدید علمی انداز برقرار رہے۔ ان سب کے علاوہ بحث و تمحیص اور تنقید و تجزیہ میں مسلکی اور جماعتی عصبیت و تنگ نظری سے اجتناب بھی اس کا ایک نمایاں وصف ہے۔ مجلہ کی ایک اور خصوصیت اس کے مقالات کا انگریزی خلاصہ ہے جو ہر شمارہ کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ یہی انگریزی حصہ انگریزی داں طبقہ بالخصوص مغربی ملکوں کے بہت سے مسلم وغیر مسلم دانشوروں میں مجلّہ اور ادارہ کے تعارف کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ یہ مجلّہ قرآنی علوم کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ششماہی علوم القرآن کو پوری دنیا میں قرآنیات کے ساتھ مخصوص رسائل میں اولیت حاصل ہے۔ اس کا واضح اعتراف اصحاب علم وفضل کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہاں اس ضمن میں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی (اسلام آباد) کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے ''اخبار تحقیق'' کے نام سے خبرنامہ شایع ہوتا ہے۔ تقریباً چار برس قبل اس کے شمارہ نمبر۳ (اپریل-جون ۲۰۰۲ء) میں پوری دنیا میں مختلف زبانوں میں شایع ہونے والے قرآنیات کے ساتھ مخصوص رسائل (ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، رسالۃ القرآن، قم، ایران، المیزان، اسلام آباد، ترجمان وحی، قم، ایران، التجوید فیصل آباد، پاکستان، جرنل آف قرآنک اسٹڈیز، لندن) کا تعارف شایع ہوا تھا ان میں علوم القرآن کا تذکرہ سرفہرست اور دوسروں کی بہ نسبت تفصیلی تھا۔

بیسویں صدی کے آخری حصہ میں جاری شدہ اس مجلّہ نے قرآنی علوم کی اشاعت میں کیا خدمت انجام دی ہے یہاں اس کے مشتملات پر ایک نظر اسی پہلو سے مقصود ہے۔ قرآن مجید کا تعارف اور اس کے نزول وجمع وتدوین کی تاریخ علم قرآن کے مبادیات میں شامل ہے۔ ششماہی علوم القرآن میں ایسے متعدد مقالے شایع ہوئے ہیں جن میں تنزیل قرآن، حفاظت قرآن، تدوین قرآن، کتابت قرآن، موضوع قرآن، ہدایت قرآن اور خصوصیات قرآن جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں (اشاریہ ششماہی

علوم القرآن، مرتبہ ظفر الاسلام اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴)۔
مجلہ کے مختلف شماروں میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں علم قرأت قرآن، کتابت قرآن، رسم خط قرآن، ادبیات وبلاغت قرآن، نظم قرآن، اعجاز القرآن، اقسام القرآن، امثال القرآن شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مقالات میں قرآنی علوم سے بحیثیت مجموعی مفصل بحث کی گئی ہے (اشاریہ علوم القرآن، ص ۲۱-۲۴) مزید براں عہد وسطی کا ہندوستان تعمیرات، فنون لطیفہ، شعروادب کی ترقی اور فوجی مہمات کے لیے زیادہ مشہور ہے، قرآنی علوم کے میدان میں اس عہد کی کیا دین رہی ہے بعض مضامین میں اس پہلو سے اس پورے دور کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے (اشاریہ علوم القرآن، ص ۲۲-۲۳)

مفردات القرآن علوم قرآنی کا ایک اہم باب ہے جس کے تحت قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی تحقیق وتشریح کی جاتی ہے۔ علوم القرآن کے متعدد مقالات میں جن الفاظ کی لغوی واصطلاحی تحقیق پیش کی گئی ہے وہ یہ ہیں: الکتاب، القرآن، امہ، یہود ونصاریٰ، تورات وانجیل، نسی، تابوت، درہم ودینار اور مرجان ویاقوت (اشاریہ علوم القرآن، ص ۲۴-۲۵) ان مباحث کو بجا طور پر مفردات القرآن کے ذیل میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

فن ترجمہ قرآن واصول تفسیر قرآنی علوم کے خاص مباحث ہیں۔ اس پہلو سے مجلہ میں شائع شدہ مواد بہت اہم وقیمتی ہے۔ ترجمہ کے اصول واسالیب اور اصول تفسیر پر مفصل مباحث کے علاوہ ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی روایات سے اخذ کردہ طریقہ تفسیر، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی، سرسید احمد خان، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مناہج تفسیر پر بڑی مفید بحثیں علوم القرآن کے مضامین میں ملتی ہیں۔ ان مضامین کا ایک اہم حصہ ابن تیمیہ وشاہ ولی اللہ، ابن تیمیہ ومولانا فراہی، شاہ ولی اللہ اور سرسید کے منہج تفسیر کے تقابلی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نوع کے مضامین سے مختلف دور میں ابھرنے والے نئے تفسیری رجحانات بھی سامنے آتے ہیں (اشاریہ علوم القرآن، ص ۱۷-۱۸)

مختلف ادوار میں معروف مفسرین نے کس طرح کا تفسیری لٹریچر تیار کیا؟ اس

کے امتیازات کیا ہیں اور انھوں نے اپنی تفاسیر میں کون سے مناہج اختیار کیے ہیں۔ یہ بحثیں بھی علوم القرآن کے سابق شماروں میں دستیاب ہیں، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن وحضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیری روایات کے تجزیاتی مطالعہ کے علاوہ جن مفسرین کی تفاسیر پر علوم القرآن میں مبسوط بحثیں ملتی ہیں وہ ہیں: امام حسن بصری (م ۷۲۸ء) سفیان ثوری (م ۷۷۸ء)، سفیان بن عیینہ (م ۸۱۴ء)، مکی بن ابی طالب (م ۱۰۴۵ء) امام واحدی (م ۱۰۷۵ء)، عماد الدین طاہر اسفرائنی (م ۱۰۷۸ء) امام زمخشری (م ۱۱۴۳ء) فخر الدین رازی (۱۲۰۹ء) ابن تیمیہ (م ۱۳۲۸ء) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۱۴۴۵ء) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۸۱۰ء)، ولی اللہ بن حبیب اللہ انصاری (م ۱۸۵۳ء)، ناصر الدین منصور علی (م ۱۹۰۲ء)، شیخ محمد عبدہ (م ۱۹۰۵ء)، مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء)، مولانا عبد الماجد دریابادی (م ۱۹۷۷ء) اور مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء) (اشاریہ علوم القرآن، ص ۱۷-۲۱)۔ اس کے علاوہ مجلہ علوم القرآن میں جن زبانوں کے تراجم قرآن کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں وہ ہیں:
ترکی، روسی، ہندی، بنگالی، بلوچی اور پشتو (اشاریہ علوم القرآن، ص ۱۷)

قرآنی علوم کو فنی واصطلاحی حدود سے آگے بڑھا کر وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو اس میں وہ تمام علوم شامل ہو جائیں گے جو قرآن کریم سے ماخوذ یا مستفاد ہوتے ہیں خواہ ان کا تعلق انسانی زندگی کی اصلاح ولوگوں کے افکار واعمال کے درستگی سے ہو یا قرآنی احکام، قرآنی تعلیمات وقرآنی مطالبات کے علم سے۔ سچ پوچھیے تو اصطلاحی معنی میں قرآنی علوم کے ارتقاء سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان کو قرآن حکیم سے وہ علم حاصل کرنے میں آسانی ہو جائے جو صحیح خطوط پر اس کی زندگی کی تشکیل وتعمیر میں ممدود معاون بنے۔ اس موضوع پر بھی علوم القرآن میں کافی مواد موجود ہے۔ شروع ہی سے یہ کوشش جاری ہے کہ ہر شمارہ میں ایک نہ ایک مضمون ایسا ضرور شامل ہو جس میں انسانی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق قرآنی تعلیمات کی وضاحت کی جائے یا کسی اہم عصری مسئلہ پر قرآنی نقطہ نظر کی ترجمانی پیش کی جائے، اس نوعیت کے جو مضامین اب تک شایع ہوئے ہیں ان

میں کچھ اہم یہ ہیں: مومن قرآن کے آئینہ میں، اسوۂ ابرہیمی قرآن کی روشنی میں، دین میں نماز کی اہمیت قرآن کی روشنی میں، تقویٰ، توکل، ختم قلوب کا قرآنی مفہوم، استکبار اور اس کے نتائج، قرآن کا تصور حقوق انسانی، قرآنی تصور ملکیت، قرآنی معیشت کے بعض بنیادی مسائل، قرآن مجید کی روشنی میں صارفین کا مطلوب رویہ، فہم قرآن اور اتحاد امت (اشاریہ علوم القرآن، ص۱۴-۱۶)

ششماہی علوم القرآن کا ہر کالم جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا قرآن یا قرآنیات سے تعلق رکھتا ہے اور قرآنی علوم وافکار کی تشریح وترجمانی اس کا خاصہ رہا ہے شکر خدا کہ مجلّہ کے اداریوں میں بھی اس کا یہ امتیازی پہلو نمایاں رہتا ہے۔ عصر حاضر کے اہم مسائل میں قرآن کریم کیا رہنمائی دیتا ہے یا امت کو درپیش مسائل کا قرآنی حل کیا ہے؟ موثر انداز و بلیغ اسلوب میں اس کی تشریح وترجمانی اداریوں میں کی جاتی رہی ہے۔ قرآن، اسلام و اسلامی نظام کے حوالہ سے ناقدین ومخالفین اسلام جو سوالات واعتراضات اٹھاتے ہیں بعض اداریوں میں مدلل طور پر ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ اداریہ میں زیر بحث آنے والے کچھ اہم موضوعات یہ ہیں: قرآن کریم اور مستشرقین، قرآن کریم کے تئیں معاندین اسلام کا رویہ اور ہماری ذمہ داریاں، اشتراکی روس کی شکست وریخت، بابری مسجد کی شہادت، عورت کا مقام قرآن کی نظر میں، فکر فراہی۔ پسِ منظر ومحرکات/ مرض اور علاج، موجودہ حالات میں قرآن کی تعلیم کیسے عام کی جائے، ترجمہ قرآن کے مسائل، عصری جامعات میں قرآنیات بحیثیت موضوع تحقیق اور قرآنیات پر کتابیاتی مواد کی ضرورت و افادیت۔ جدید دور کے علمائے قرآنیات نے اپنے اپنے طور پر قرآنی علوم وافکار کی اشاعت کے لیے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں، ان کی خدمات سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ان میں بعض کی وفات پر اداریہ میں ان کی قرآنی خدمات پر نہایت جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مرحومین ماہرینِ قرآنیات میں مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۵/دسمبر ۱۹۹۷ء)، مولانا صدر الدین اصلاحی (م ۱۳/نومبر ۱۹۹۸ء)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (م ۱۷/دسمبر ۲۰۰۲ء) اور تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی مولانا خالد مسعود (م یکم اکتوبر

۲۰۰۳ء) شامل ہیں (اشاریہ علوم القرآن، ص ۱۱-۱۳)

علوم القرآن میں قرآنی کتب پر جو تبصرے شایع ہوتے ہیں ان کی حیثیت دراصل تبصراتی مقالہ (REVIEW ARTICLE) کی ہوتی ہے۔ قرآنی علوم کی اشاعت کے نقطہ نظر سے یہ تبصرے بھی اہمیت وافادیت سے خالی نہیں ہوتے۔ قرآنی علوم سے متعلق جن کتابوں پر مبسوط تبصرے شایع ہو چکے ہیں وہ ہیں: التحبیر فی علوم التفسیر (مصنفہ امام سیوطی)، احسن البیان فی علوم القرآن (حسن الدین احمد)، حکمتِ قرآن (حمید الدین فراہی/ خالد مسعود)، نظم قرآن (افادات مولانا فراہی ومولانا امین احسن اصلاحی)، ایضاح القرآن (ضیاء الدین اصلاحی)، قرآنی مقالات (ادارہ علوم القرآن)، زمخشری کی تفسیر الکشاف۔ ایک تحلیلی جائزہ (فضل الرحمٰن گنوری)، حضرت شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر کا مطالعہ (محمد سعود عالم قاسمی)، مولانا امین احسن اصلاحی کے تصور نظم قرآن پر میر مستنصر کی انگریزی کتاب، علم تجوید وقرأت پاکستان میں/ پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ (قاری محمد طاہر) اور المنہل (جدہ) ومسلم ورلڈ بک ریویو (لیسٹر، برطانیہ) کے قرآن نمبر (اشاریہ علوم القرآن، ص ۲۸-۳۰) مزید براں مجلہ کے ''کتاب نما'' کالم کے تحت تمام شماروں میں قرآنی علوم پر عربی، اردو انگریزی کی بہت سی نئی کتابوں کا مختصر تعارف شائع ہوا ہے (اشاریہ علوم القرآن، ص ۳۰-۳۶) اور ان تینوں زبانوں کے مشہور رسائل میں قرآنیات پر شایع ہونے والے منتخب نئے مضامین کی فہرست بھی ہر شمارہ میں شایع کی جاتی ہے ان سب کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

قرآنی علوم ومعارف کے فروغ میں مجلہ علوم القرآن کی خدمات کا ایک اور پہلو قرآنی مطبوعات، قرآنیات پر تحقیقی مقالات، قرآن سے متعلق قدیم وجدید دور کے علماء کی کتابوں ودیگر تحریروں اور مختلف لائبریریوں کے قرآنی ذخائر پر کتابیات، اشاریہ جات اور فہارس کی اشاعت ہے، ان سے ایک جانب مختلف زبانوں میں قرآنیات پر شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات مہیا ہوتی ہیں، دوسرے ہندو پاک اور دوسرے ملکوں کی لائبریریوں میں مطبوعہ یا مخطوطہ صورت میں قرآنیات پر جو قیمتی ذخیرہ

دستیاب ہے ان کے بارے میں اطلاع ملتی ہے۔ تیسرے ان سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنی علوم یا قرآنیات پر ریسرچ وتحقیق کی کیا رفتار ہے اور قرآن سے متعلق کن کن موضوعات پر تحقیقی کام انجام پاچکا ہے۔ مجلہ علوم القرآن میں اردو رسائل میں قرآنی مضامین کا اشاریہ، اردو میں قرآنی مطبوعات کی کتابیات، سعودی عرب میں ۱۴۰۰-۱۴۰۹ھ کے دوران قرآنیات پر شایع شدہ کتب کی فہرست اور کتابیات مولانا حمید الدین فراہی ومولانا امین احسن اصلاحی پہلے ہی اشاعت پذیر ہوچکی ہیں۔ جامعہ ام القریٰ (مکۃ المکرمہ)، جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ)، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ (ریاض)، عصری وتر کی جامعات اور پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں قرآنیات پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ان کی تفصیلات بھی علوم القرآن کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ جامعۃ الملک عبد العزیز کی مرکزی لائبریری میں جو قرآنی مخطوطات دستیاب ہیں ان کی توضیحی فہرست بھی علوم القرآن میں شایع ہوچکی ہے (اشاریہ علوم القرآن، ص ۲۵-۲۷)۔ مزید براں مجلہ کے خبر نامہ میں قرآن مجید کے نادر نسخوں کی دریافت، مقامِ دستیابی اور ان کی خصوصیات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی رہتی ہیں (اشاریہ علوم القرآن، ص ۳۷-۳۹)

مختلف موضوعات پر سیمینار ومذاکرات کا اہتمام عصر حاضر کی علمی سرگرمیوں کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ ماضی قریب سے سیمینار کے موضوع کے طور پر قرآنیات وعلماء قرآن کو بھی منتخب کیا جانے لگا ہے اور شکر خدا کا کہ اب قرآن سے متعلق موضوعات سیمیناروں کے لیے اجنبی نہیں رہ گئے ہیں۔ ششماہی علوم القرآن اپنے خبر نامہ کے ذریعہ دنیا کے مختلف حصوں میں قرآنیات پر منعقد ہونے والے سیمیناروں کے بارے میں ضروری اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے اور بعض سیمیناروں کی مفصل رپورٹ مضمون یا اداریہ کی صوت میں بھی شایع ہوتی رہی ہیں ان میں خاص طور سے مولانا حمید الدین فراہی سیمینار (منعقدہ مدرسۃ الاصلاح / ۸-۱۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء، نظم قرآن سیمینار (مدرسۃ الاصلاح / ۶-۱۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء) اور تراجم قرآن سیمینار (مدینہ منورہ / ۲۳-۲۵ اپریل ۲۰۰۲ء) قابل ذکر ہیں (اشاریہ علوم القرآن ص ۲۷)۔ ان کے علاوہ خبر نامہ کے کالموں میں جن سیمیناروں کی مختصر

رپورٹیں شایع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں: تیسری بین الاقوامی قرآن کانفرنس (اسلام آباد/ دسمبر ۱۹۸۵ء) تراجم قرآن سمپوزیم (استنبول/۲۲ر مارچ ۱۹۸۶ء)، قرآن وسنت کے سائنسی اعجاز پر بین الاقوامی کانفرنس (اسلام آباد/ ۱۷-۲۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء)، کتابت قرآن پر عالمی سیمینار (پیرس/ ۶-۸ جون ۱۹۸۸ء) قرآنیات پر جنوب ایشیائی علاقائی سیمینار (خدا بخش لائبریری پٹنہ/۲۲ -۲۶ فروری ۱۹۸۹ء)، قرآن کریم کے معانی کی وضاحت پر سیمینار (قاہرہ / ۱۸-۱۹ جولائی ۱۹۸۹ء)، قرأت کانفرنس (شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی/ ۱۷-۱۸ مارچ ۱۹۹۰ء)، قرآن وسائنس سیمینار (شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی / ۸-۱۰ جنوری ۲۰۰۳ء) ، قرآن وبائبل کے مشترکہ مطالعہ پر سیمینار (واشنگٹن ڈی سی/ ۳۰ مارچ۔ یکم اپریل ۲۰۰۴ء) (اشاریہ علوم القرآن، ص ۴۴-۴۵)۔

آخر میں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ مجلہ علوم القرآن دنیا کے مختلف حصوں میں قایم قرآنی ادارے ومراکز، مختلف ملکوں میں قرآنیات پر تصنیفی واشاعتی منصوبوں (لغاتِ قرآن، قرآنی انسائیکلوپیڈیا، تراجم وتفاسیر کی ببلوگرافی، قرآنی مطبوعات ومخطوطات کے اشاریہ کی تالیف وترتیب)، قرآنی جغرافیہ سے متعلق نئی دریافتوں، قرآنی مسابقات اور نوادرات قرآنی کی نمائش اور قرآنی علوم کی اشاعت میں کمپیوٹر وانٹرنیٹ کی خدمات کے بارے میں مفید ودلچسپ خبریں فراہم کرتا رہتا ہے اور اس طرح قرآنی علوم وقرآنیات کی نسبت سے جدید عالمی سرگرمیوں سے قارئین کو باخبر رکھتا ہے اور بلا شبہ مجلہ کی یہ قرآنی خدمت بھی کچھ کم اہم نہیں ہے (اشاریہ علوم القرآن، ص ۴۱-۴۷)

اپنی باتوں کو ختم کرنے سے متعلق اس احساس کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ششماہی علوم القرآن جو کچھ قرآنی خدمت انجام دے چکا ہے یا دے رہا ہے ناچیز کے خیال میں اس کا سب سے قیمتی پہلو یہ ہے کہ یہ مجلہ جو شروع سے آخر تک قرآن کریم سے تعلق رکھتا ہے، اس کتاب ہدایت سے لوگوں میں قربت پیدا کرنے ، اس کے اثر سے ان کے فکری دھارے کو موڑنے اور ان میں ایک خاموش انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ بن رہا ہے اور اس کتاب عزیز وعظیم سے استفادہ کی بڑھتی ہوئی طلب کو کسی حد تک پورا کرنے کی

کوشش کررہا ہے، قارئین کے خطوط اور مجلہ کی اشاعت میں تاخیر پر ان کے خلوص بھرے شکایت ناموں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مجلہ علوم القرآن (یا ہماری ٹوٹی پھوٹی کوشش) کوکیسی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کتنی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے ہیں اور انتظار کے صبر آزما لمحات طویل ہونے پر کس دردمندانہ انداز میں وہ دریافت کرتے ہیں کہ ادارہ کو کس چیز کی ضرورت ہے اور پھر پیش کش کرتے ہیں کہ ہم کیا خدمت کرسکتے ہیں جو مجلہ کی بروقت اشاعت میں معاون ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک پیاس ہے جس کو ہم بجھا نہیں پارہے ہیں، ایک طلب ہے جسے وقت پر پوری کرنے سے ہم عاجز ہیں، ایک خاص علم کا شوق ہے جس کی تکمیل سے ہم قاصر ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ مجلہ کے قدردانوں میں جدید جامعات کے اساتذہ وطلبہ، مدارس کے فضلاء و وابستگان بھی شامل ہیں، کوئی وجہ تو ہے کہ اس کے مشتاق عام پڑھے لکھے لوگ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی نظر آتے ہیں، اس میں دل چسپی کا کوئی خاص سامان تو ہوگا کہ اس کے طلب گار زراعت و تجارت میں مصروف رہنے والے ہیں اور صنعت وحرفت میں مہارت دکھانے والے بھی اور سرکاری عہدہ داران اور فوجی ملازمین بھی۔ کوئی باعث کشش تو ہے کہ اس کو شوق سے پڑھنے والے شہری بھی ہیں اور گاؤں میں شب وروز بسر کرنے والے بھی۔ اس راقم کو اس پر یقین ہے کہ اس کی صرف اور صرف وجہ یہ ہے کہ مجلہ کی نسبت کتابِ الٰہی سے ہے، جو سراپا خیر و برکت ہے، اس کا تعلق اس سرچشمہ ہدایت سے ہے جس سے سیرابی انسان کو قلبی سکون دیتی ہے اور اسے فوز وفلاح کی ضمانت عطا کرتی ہے اور اس مجلہ کا مقصد اس علم کی اشاعت ہے جو بلاشبہ اشرف العلوم ہے۔ اللہ کرے ہمیں اپنی کوتاہیوں کے احتساب اور اس کی روشنی میں اصلاحِ احوال کی توفیق نصیب ہو، اللہ رب العزت ہم میں قدردان مجلہ کے اخلاص و اشتیاق کا احساس بیدار کردے، قارئین کی توقعات کو پوری کرنے کا اہل بنادے اور ہماری رگ رگ میں قرآن وعلم قرآن کی خدمت کا ایسا جذبہ سرایت کردے کہ ہم صحیح معنوں میں اس خدمت کا حق ادا کرنے والے بن جائیں۔

"ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر"

# رپورٹ سیمینار-قرآنی علوم بیسویں صدی میں

محمد راشد اصلاحی

ادارہ علوم القرآن کے زیر اہتمام ''قرآنی علوم بیسویں صدی میں'' کے موضوع پر ایک دو روزہ سیمینار ۲۶-۲۷ جولائی ۲۰۰۵ء کو فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ یہ سیمینار افتتاحی اجلاس کے علاوہ ۸ علمی نشستوں پر مشتمل تھا جن میں مجموعی طور پر ۲۹ مقالات پیش کیے گئے۔ ہر اجلاس کے اختتام پر سوال و جواب کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں اس سیمینار کی ایک مختصر رپورٹ پیش کی جارہی ہے۔

## افتتاحی اجلاس

| | |
|---|---|
| ۲۶ جولائی ۲۰۰۵ | ۱۰ بجے صبح |
| تلاوت قرآن کریم | مولانا محمد صادق اختر ندوی |
| خطبہ استقبالیہ | پروفیسر اشتیاق احمد ظلی |
| تعارف ادارہ علوم القرآن | ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی |
| کلیدی خطبہ | مولانا ضیاء الدین اصلاحی |
| تاثرات مہمان خصوصی | پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی |
| صدارتی خطبہ | پروفیسر محمد عبدالحق انصاری |
| کلمات تشکر | ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی |

## مقالات اجلاس

### پہلا اجلاس

| | |
|---|---|
| ۲۶ جولائی ۲۰۰۵ | ۱۲-۳۰ تا ۱-۳۰ دوپہر |
| صدارت | مولانا ضیاء الدین اصلاحی |
| نظامت | ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی |

| | |
|---|---|
| پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی | شان نزول اور فہم قرآن |
| ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی | دینیات فیکلٹی کی قرآنی خدمات |
| پروفیسر محمد راشد ندوی | تفسیر طبری کے محقق علامہ محمود شاکر کے قرآن کریم سے متعلق افکار وخیالات |

## دوسرا اجلاس

| | |
|---|---|
| ۲۶ جولائی ۲۰۰۵ | ۶ تا ۷-۱۵ شام |
| صدارت | ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی |
| نظامت | ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی |
| ڈاکٹر حافظ ابوسفیان اصلاحی | قرآن کا تصور امن |
| ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی | قرآنی علوم کے ارتقاء میں جماعت اسلامی کی خدمات |
| پروفیسر نعیم احمد خان | ’حدید‘ کا مطالعہ۔ قرآن اور طبی سائنس کی روشنی میں |

## تیسرا اجلاس

| | |
|---|---|
| ۲۶ جولائی ۲۰۰۵ | ۷-۴۵ تا ۹ شب |
| صدارت | پروفیسر عبد العلی |
| نظامت | جناب اشہد رفیق ندوی |
| پروفیسر وسیم احمد | فہم قرآن میں عصری علوم سے استفادہ- بیسویں صدی کا ایک تفسیری رجحان |
| ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی | اسلامی نظریہ کائنات: نظام مشیت ورضا |
| پروفیسر احتشام احمد ندوی | تفاسیر میں اسرائیلیات کا ارتقاء بیسویں صدی کے حوالہ سے |

## چوتھا اجلاس

| | |
|---|---|
| ۲۷ جولائی ۲۰۰۵ | ۹ تا ۱۱ دن |
| تلاوت قرآن کریم | جناب ابوزید |
| صدارت | مولانا محمد فاروق خان |